بَلَغَ العُلیٰ بِکَمَالِہٖ

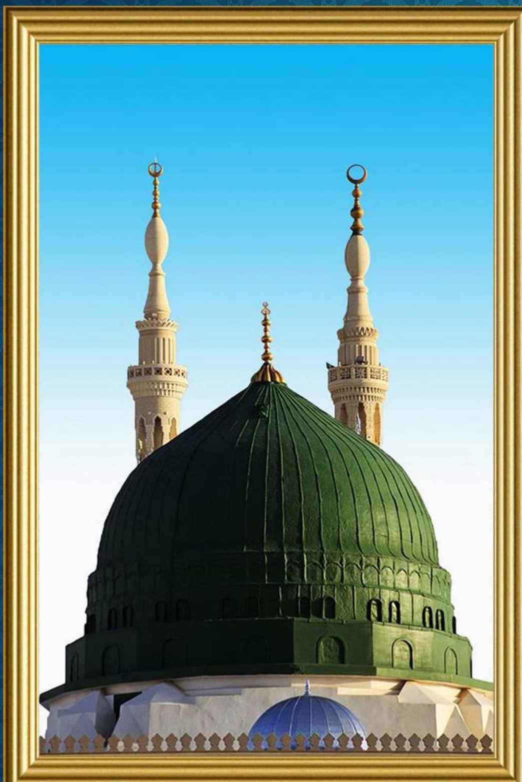

سیّد حماد رضا بخاری

بَلَغَ العُلیٰ بِکَمَالِہٖ

(حیاتِ طیّبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم)

حصّہ اوّل: مکی دَور

حصّہ دوم: مدنی دَور

حصّہ سوم: تکمیل دِین

سیّد حماد رضا بخاری

جملہ حقوق بحق مؤلف محفوظ ہیں

نام کتاب	بَلَغَ الْعُلیٰ بِکَمَالِہٖ
تالیف	سیّد حماد رضا بُخاری
پروف ریڈنگ	ڈاکٹر سیّدہ شاہین صبا بُخاری
کمپوزنگ	بُخاری گرافکس، فیصل آباد
ناشر	بُخاری پبلشرز، فیصل آباد
طبع اوّل	مئی ۲۰۱۷ء
قیمت	
ای میل مؤلف	hrbukhari@hotmail.com
فون نمبر مؤلف	0300-9655650

بُخاری پبلشرز

پی-14، سادات سرکل، سرگودھا روڈ، فیصل آباد

فون نمبر:0301-8422555

تقریظ

حجۃ الاسلام علامہ اظہر حسین بہشتی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

دُنیا میں کچھ ایسی ہستیاں ہوتی ہیں جو تاریخ کا رُخ موڑ دیتی ہیں، انھیں میں سب سے اعلیٰ وارفع ہستی جس نے مختصر سے عرصے میں دُنیا میں انقلاب برپا کر دیا، پرچمِ اسلام کو بلند کیا اور اقدارِ انسانی کو اپنی معراج تک پہنچا دیا، حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ذاتِ مبارکہ ہے۔ قرآنِ کریم نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے اخلاق کے بارے میں یوں قصیدہ کہا،

''وَاِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِیۡمٍ ○''

(اور بیشک آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم خلقِ عظیم کے مالک ہیں۔ سورۃ القلم آیت ۴)

اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی نرم خوئی کے بارے میں کچھ اس طرح بیان فرمایا،

''وَلَوۡ كُنۡتَ فَظًّا غَلِیۡظَ الۡقَلۡبِ لَانۡفَضُّوۡا مِنۡ حَوۡلِكَ''

(اے محبوب! آپ (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) ان کے لیے اتنے نرم دل ہیں اور اگر تند مزاج وسخت دل ہوتے تو وہ ضرور آپ (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کے گرد وپیش سے منتشر ہو جاتے۔ سورۃ آلِ عمران، آیت ۱۵۹)

اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے شرحِ صدر یعنی وسعتِ قلبی کے بارے میں یہ آیت نازل ہوئی،

''اَلَمۡ نَشۡرَحۡ لَكَ صَدۡرَكَ ○''

(کیا ہم نے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کا سینہ کشادہ نہیں کیا۔ سورۃ الشرح، آیت ۱)

آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا اخلاق، آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی نرم خوئی اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا شرحِ صدر ہی تھا جس کی بدولت آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی تحریکِ اسلام اور یہ انقلاب کامیاب ہوگیا۔ اسلام کی نشر واشاعت آپ کے کردار کی بُلندی کی وجہ سے تھی نہ کہ تلوار کے ذریعے۔ بعض اوقات بعض دشمنانِ اسلام کی طرف سے یہ اعتراض کر دیا جاتا ہے کہ اسلام تلوار کے زور پر پھیلا تھا اور اس کی طرف داری بعض نام نہاد مسلمانوں نے بھی کر ڈالی جب کہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے۔ اسلام رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے کردار کا پرتو ہے، اگر اسلام میں جنگوں کا جائزہ لیا جائے تو صاف دکھائی دیتا ہے

کہ یہ ساری جنگیں دفاعی جنگوں کی حیثیت رکھتی تھیں اور پھر اگر قرآن کو حکم مان کر اِس سے فیصلہ لیا جائے تو قرآنِ مجید واضح طور پر اعلان کرتا ہُوا نظر آتا ہے کہ اسلام رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اعلیٰ کردار کے ذریعے دُنیا میں پھیلا ہے نہ کہ تلوار کے بل بوتے پر جیسا کہ مندرجہ بالا آیات آپ کی نظر سے گزریں۔ قرآنِ مجید نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تمام زندگی کو انسانیت کے لیے اُسوۃ قرار دیا اور فرمایا،

''لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُسْوَۃٌ حَسَنَۃٌ''

(بیشک تمھارے لیے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ذات میں (پیروی کے لیے) بہترین نمونہ ہے۔

سورۃ اُحزاب، آیت ۲۱)

بھلا یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ جو تلوار کے زور پر اسلام پھیلائے اُس کی زندگی کو تمام انسانیت کے لیے اُسوۃ اور نمونہ قرار دے دیا جائے؟ لہٰذا اِس مقام پر غور وفکر کرنا چاہیئے کہ یہ نظریہ کن لوگوں کا ہے؟ آیا حامیانِ اسلام کا ہے یا دشمنانِ اسلام کا؟

قارئین محترم! آپ کے ہاتھوں میں موجود کتاب برادرِ عزیز سیّد حماد رضا بخاری کی ایک بہترین کاوش ہے۔ اِس کتاب میں انھوں نے اپنی گزشتہ کاوش، ''صَلُّوْا عَلَیْہِ وَآلِہٖ'' کی طرح اہلِ اسلام کے مختلف مکاتبِ فکر کی روایات کو یکجا کیا ہے اور رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف جو توہین آمیز روایات نقل کی جاتی ہیں اُن کا بہترین اسلوب میں جواب بھی دیا ہے۔ حماد بخاری صاحب ایک سچے عاشقِ رسول ہیں، اِس کا اندازہ آپ کو کتاب کے مطالعے کے دوران میں خود بخود ہوجائے گا۔ خداوند متعال ان کی اِس کاوش کو اپنی بارگاہ میں قبول فرمائے اور ان کے زورِ قلم میں مزید اضافہ فرمائے۔

والسّلام

اظہر حسین بہشتی

۲۲ ربیع الاوّل ۱۴۳۵ ہجری

تقریظ

حجۃ الاسلام علامہ سیّد مزمل نقوی

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ○

تاریخ کے دامن میں بہت کچھ ہوتا ہے۔ حقائق بھی اور افسانے بھی، قصّے بھی اور کہانیاں بھی، رُموز بھی اور اشارات بھی، تفصیل بھی اور اجمال بھی، سچ بھی اور جھوٹ بھی۔ یہ تو محقق کی صلاحیت پر منحصر ہوتا ہے کہ وہ کس طرح حقائق کو سچے موتیوں کی طرح چنتا اور سچ کو جھوٹ سے الگ کرتا ہے۔

سیرت کی کتب بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ سیرت نگاروں نے عمداً یا سہواً بہت سی ایسی باتیں لکھی ہیں جو صاحبِ سیرت کی شان کے منافی ہوتی ہیں۔ بعد میں آنے والے مصنفین بھی تبصرہ کیے بغیر اُن ہی باتوں کو نقل کر دیتے ہیں جنھیں پڑھ کر ایک عام قاری الجھن کا شکار ہو جاتا ہے۔

بردار محترم سیّد حماد رضا بخاری ایسی باتوں سے اجتناب کرتے ہیں اور اگر کوئی ایسی روایت ان کے زیرِ قلم آ جائے تو اُس پر بحث ضرور کرتے ہیں۔ ان کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ اپنا نظریہ تو بیان کرتے ہیں لیکن قاری پر تھوپنے کی کوشش نہیں کرتے بلکہ قاری کے ذہن کو جستجو کی راہیں دکھاتے ہیں، حق بھی یہی ہے، قرآن وسنت کا پیغام بھی یہی ہے۔ تدبر کرنا قرآن کی آرزو ہے، غور وفکر کرنا انبیا اور ائمہ معصومین علیہم السلام کی سیرت ہے۔ اسی سے انسان آگے بڑھتا ہے، ارتقائی منازل طے کرتا ہے اور اپنے مقصدِ تخلیق کو پالیتا ہے۔ یوں خدا کے قریب ہو جاتا ہے۔

زیرِ نظر کتاب ''بَلَغَ الْعُلیٰ بِکَمَالِہٖ'' اپنے نام کی طرح ایک منفرد تالیف ہے۔ رسولِ اعظم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی سیرت و کردار پر فاضل محقق کا ایک عظیم علمی شاہکار ہے۔ جسے اپنا کر نہ صرف ایک عام فرد بلکہ زندگی کے ہر شعبہ سے تعلق رکھنے والا باشعور اہلِ علم و ذوق انسان اپنی زندگی کو عظیم انسانی قدروں کے مطابق ڈھال سکتا ہے، کیونکہ اس کتاب میں اُس ذات والا صفات کی سیرت بیان کی گئی ہے جسے خدا نے اسوۂ حسنہ اور انسانیت کے لیے نمونۂ عمل قرار دیا ہے۔

حبیب کبریا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم جیسے انسان کامل کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو سامنے لانا انسانیت کی بہت بڑی خدمت ہے۔ اس کے لیے فاضل مصنف مبارک باد کے مستحق ہیں۔

خداوند متعال ان کی توفیقات میں مزید اضافہ فرمائے اور وہ اپنے ترشحاتِ قلم سے لوگوں کو مستفید کرتے رہیں۔ (آمین)

سیّد مزمل نقوی

۲۹ جمادی الثانی ۱۴۳۶ ہجری

۱۸ اپریل ۲۰۱۵ء

تقریظ

حجۃ الاسلام علامہ محمد علی غازی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

برادر محترم عزت مآب جناب سیّد حماد رضا بخاری صاحب کی زیرِ نظر کتاب ''بَلَغَ الْعُلیٰ بِکَمَالِہٖ'' جو کہ نام سے ہی کمال اور عظمت کی عکاس ہے، کے ابواب کو سطحی نظر سے دیکھنے کا اتفاق ہوا، واقعاً کتاب اسمِ بامسمیٰ ہے۔

اُس عظیم ہستی جسے اللہ رب العزت ''وَاِنَّكَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیۡمٍ'' کا عظیم مژدہ سنائے، کے کمالات کو قلمبند کرنا کوئی آسان کام نہیں اور میں یقین کے ساتھ کہتا ہوں کہ اس عظیم کارنامے کے لیے اللہ کی طرف سے توفیق اور جس ہستی کی محبت میں یہ نیک قدم اٹھایا گیا ہے اُس کی نظرِ رحمت کا شامل حال نا ہونا ناممکن ہے۔

کتاب جس ہستی کے نام سے منسوب ہے صاحبِ کتاب نے اپنی بساطِ علمی کے تحت اُس ہستی کی سیرتِ طیبہ کو کمال خوبی اور تحقیق کے معیار و ملاک کو سامنے رکھتے ہوئے کما حقہٗ پیش کیا ہے۔

یقیناً اُس نور کی سیرتِ نورانی کا بیان دُنیا و آخرت کے لیے سرمایۂ ابدی ہے، شانِ مظہرِ کمالِ الٰہی کا بیان اور اُن کمالات کو قلم بند کرنا پھر وقت نکال کر پڑھنا یقیناً ہم سب کے لیے سرمایۂ ابدی ہے۔

جناب سیّد بزرگوار نے ایک ایسا نیک قدم اٹھایا ہے جسے تعبیرِ علمی و عملی میں حسنہ جاریہ کہا جاتا ہے۔

اللہ اِس حسنہ جاریہ کو بحقِ ''بَلَغَ الْعُلیٰ بِکَمَالِہٖ'' شرفِ قبولیت عطا فرمائے آمین۔

الاحقر

محمد علی غازی

نجف اشرف، عراق

۲۰ جمادی الثانی، ۱۴۳۸ ہجری

تقریظ

پروفیسر ڈاکٹر مولانا قدسی رضوی

(پی ایچ ڈی، ہندوستان)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○

جب سے انسان اس دنیا میں آباد ہُوا ہے اُس وقت سے آج تک ہر دَور میں کسی نہ کسی خطے میں کوئی الٰہی راہنما اور ہادی ایسا ضرور پیدا ہوتا رہا ہے جس نے انسانوں کو سیرت و کردار کی تعمیر کی دعوت دی اور اخلاق و اعمال کی درستی کا درس دیا۔ ان الٰہی اور اخلاقی راہنماؤں نے ہمیں بنیادی انسانی صفات پر قائم رہنے، حیوانوں سے ممتاز زندگی گزارنے اور بلند ترین اخلاقی صفات اپنے اندر پیدا کرنے کی تعلیم دی۔ ان ہی راہنماؤں میں سے ایک مقدس و پاک ذات حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی پوری زندگی کارِ تبلیغ سے بھری ہوئی ہے جس کے نتیجہ میں ایسی اُمت ابھری جو تمام قوموں کی آنکھوں میں کھٹکنے لگی اور اس سے دنیائے بشریت کو ایسا اعلیٰ نمونۂ حیات حاصل ہُوا کہ اگر سارا عالم اس کی آواز پر لبیک کہہ کر عمل پیرا ہوجائے تو اس کو خاطر خواہ استقامت حاصل ہوجائے اور انسان ترقی کی طویل منزلیں طے کرلے جس سے حیاتِ انسانی کے گوناگوں جوہر آشکار ہوجائیں۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی محنتِ شاقہ نے ایک مردہ وافسردہ قوم میں زندگی کی رُوح پھونک دی۔ باہم برسرِ پرخاش قبیلوں کے مجموعۂ متفرقات کو وحدت بخش کر ایک ایسی قوم بنادیا جس کا محرک عمل حیات ابدی کی اُمید تھی۔ روشنی کی جو منتشر شعائیں اُس وقت علیٰحدہ علیٰحدہ دلِ انسانی پر پڑی تھی اُنھیں لے کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ایک نقطہ پر مرکوز کردیا۔ معاشرہ کو نہ صرف ایک مثالی معاشرہ میں تبدیل کیا بلکہ اس معاشرے کے افراد کو انسانیت کا علمبردار بنا کر پیش کیا اور

آپ ﷺ نے ان میں روحانی واخلاقی پاکیزگی، فرد کی آزادی اور فرد اور معاشرہ کے مابین ایک توازن قائم کیا جس کی مثال انسانی تاریخ میں دیکھنے کو نہیں ملتی۔

کتابِ ہذا محترم سیّد حماد رضا بخاری صاحب کی انتھک علمی کاوشوں اور تحقیقی ذوق کا بہترین نتیجہ ہے۔ یہ کتاب اپنے آپ میں ایک ''نیا دَور'' ہے سیرت کی کتب کے حوالے سے۔ مؤلف محترم نے جہاں زبان کی سادگی اور سلاست کو بخوبی اپنایا ہے وہیں ایک بہترین علمی تسلسل کو بھی رواں رکھا ہے۔ بہت کم ایسی کتب سامنے آتی ہیں جہاں روانیٔ تحقیق کے ساتھ الفاظ کی نشست اور جملات کا استعمال ممدوح کی شان اور عظمت کے منافی نہیں ہوتے۔ اس کتاب کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں اُن تمام باطل افکار کو رَد کیا گیا ہے جو سیرتِ طیبہ پر دھبہ لگانے کی بیکار کوشش کرتے ہیں اور پاکیزہ نقوشِ عصمت کو مندمل کرنے کی سازش میں گرفتار رہتے ہیں۔

قارئین سے گزارش ہے کہ اس بہترین علمی سرمایہ کو مطالعہ میں لائیں اور اس کے مندرجات سے قلب و نفس کو منور کریں۔

میں، بصمیمِ قلب دُعا گو ہوں کی محترم محقق سیّد حماد رضا بُخاری صاحب کی توفیقاتِ دینی میں اضافہ ہو اور آپ کا قلم ہمیشہ حق کی وکالت میں چلتا رہے۔ اللہ سے بتصدقِ اہل بیت اطہار علیہم السلام ان کی صحت و سلامتی اور کامیابی کے لیے دُعا ہے۔

والسّلام و رحمت اللہ

احقر العباد

ڈاکٹر قدسی رضوی

ہندوستان

۲۱ مارچ ۲۰۱۷ء

تقریظ

پروفیسر ڈاکٹر ظہیر عباس
(پی ایچ ڈی، پاکستان)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ○

("بلغ العلیٰ بکمالہٖ" ایک تاریخ ایک تحقیق)

اُردو ادب میں "سیرت نگاری" بحیثیت فن اور صنف ایک ممتاز مقام رکھتی ہے، یہ صنف جہاں سرکارِ دو عالم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی حیاتِ مبارکہ کے حسین جھروکوں کو وا کرتی ہے وہیں فکری اور علمی دریچوں کو بھی روشن کرتی ہے۔ ایک سیرت نگار حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے محبت اور عقیدت کے تقاضوں کو پورا کرنے کے ساتھ ساتھ جب پوری ایمانداری کے ساتھ حقائق و واقعات کو پیش کرتا ہے تو یہ صنف اپنے اوجِ کمال کو پہنچ جاتی ہے۔ حقائق و واقعات کا باہم مربوط ہونا ہی تحقیق کی علامت ہوتا ہے۔ بغیر تحقیق کے تاریخ محض واقعات کا مجموعہ کہلا سکتی ہے۔ بحیثیتِ طالب علم راقم کو ایک چیز ہمیشہ اُلجھن میں ڈالتی ہے کہ تاریخ اور سیرت کی کُتب میں واقعات کچھ اور کہہ رہے ہوتے ہیں جب کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی زندگی کے حقائق کچھ اور بتا رہے ہوتے ہیں۔ اسی لیے سیرت نگاری ایک نازُک اور حساس کام ہوتا ہے، اس میں مصنف کو احتیاط، وسیع مطالعہ اور تحقیقی استدلال سے کام لینا پڑتا ہے۔ اس میں کوئی دو آراء نہیں کہ سیرت نگاری میں اکثر سیرت نگاروں نے اس کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے اسے اُردو ادب میں ممتاز اور نمایاں مقام تک پہنچایا ہے۔

"بلغ العلیٰ بکمالہٖ" بھی سیرت نگاری کے تمام تقاضوں پر پورا اُترتی ہے۔ اس

کتاب کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں کسی بھی غیر معتبر روایت کو شامل نہیں کیا گیا اور نہ ہی ایسا اندازِ تحریر اپنایا گیا ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے زیبا نہیں۔ مصنف نے ہر واقعے پر بڑا مفصل اور معتبر علمی استدلال پیش کیا ہے جو واقعے کی اصل رُوح کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔ اس کے علاوہ مؤلف نے تاریخ اور سیرت کی کُتب سے جو حوالہ جات پیش کئے ہیں وہ اسے ایک تحقیقی مقالہ کے درجے پر فائز کرتے ہیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ مصنف نے فنی معیار کا خاص اہتمام کیا ہے۔ تحریر کا اُسلوب اتنا سادہ اور عام فہم ہے کہ جس پر کسی بھی مسجعیٰ اور مقفیٰ عبارت کو قربان کیا جا سکے۔

یہ کتاب ایک عام فہم قاری کے لیے بھی یکساں مفید ہے۔ اس میں لفظی رعایت، جملہ سازی اور دُرست املا کے تمام اُصولوں کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے جو کہ زُبان اور نثری خصوصیات پر پورا اُترتے ہیں۔

''بلغ العلیٰ بکمالہٖ'' سیرت نگاری کے میدان میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔ راقم کی دُعا ہے کہ اللہ پاک سیّد حماد رضا بخاری صاحب کی توفیقات میں اضافہ فرمائے اور ہمیں اس کتاب سے مستفید ہونے کا شرف بخشے۔ آمین۔

ڈاکٹر ظہیر عباس
فیصل آباد
۲۴ مارچ، ۲۰۱۷ء

فہرست
حصّہ اوّل
(مکّی دور)

ہدیہ	33
انتساب	34
مقدمہ	35
نُورِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تخلیق	38
نُورِ محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اصلابِ طیّبہ سے ارحامِ مطہرہ کی طرف انتقال	44
نسبِ گرامی حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم	49
حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آباؤ اجداد	50
حضرت ابراہیم علیہ السلام	50
حضرت اسماعیل علیہ السلام	58
حضرت فہر قریش	62
حضرت قُصی	63
حضرت عبد مناف	63
حضرت ہاشم	64
حضرت عبدُ المُطلب شَیبۃُ الحمد علیہ السلام	66
حارث بن عبد المطلب (عمّ النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)	71
حضرت امیر حمزہؓ بن عبد المطلب (عمّ النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)	71
حضرت عباسؓ بن عبد المطلب (عمّ النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)	71
زبیر بن عبد المطلب (عمّ النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)	73
ابولہب بن عبد المطلب (عمّ النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)	73
حضرت ابُوطالب بن عبد المطلب علیہ السلام (عمّ النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)	73
حضرت علی علیہ السلام (برادرِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)	76
عمّاتُ النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم	79

حضرت عبداللہ علیہ السلام (والدگرامی نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)	81
سیّدہ آمنہ علیہا السلام (والدہ ماجدہ جناب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)	83
طلوعِ سحر (ولادتِ باسعادت سرورِ انبیا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ۵۲ قبل ہجرت، ۵۷۱ء	84
سطیح کاہن کی خبر	91
یہودی عالم یوسف کی خبر	93
شام سے ابنِ حواش المقبل کی خبر	94
اَسمائے گرامی جناب رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم	97
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نام اور کنیت جمع کرنے کی ممانعت اور حضرت علی علیہ السلام کا استثنا	100
رضاعتِ نبی مکرّم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم	101
روایتِ شق الصدر	103
روایتِ شق الصدر کا تنقیدی جائزہ	104
وفاتِ حضرت سیّدہ آمنہ علیہا السلام (۴۷ قبل ہجرت/ ۵۷۷ء)	111
کم سِنی میں ہی نبی اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے والدین کی رِحلت کا فلسفہ	111
کفالتِ جناب نبی گرامی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم	112
حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کفالت کے لیے حضرت ابوطالبؑ کی نامزدگی	114
حضرت ابوطالبؑ کے ہمراہ سفرِ شام (۴۰ قبل ہجرت/ ۵۸۲ء)	115
سفرِ شام حضرت ابوطالب علیہ السلام کی زبانی	117
عربوں میں بُت پرستی کی تاریخ اور ہبل ولات وعزیٰ وغیرہ	125
شِرک وبُت پرستی اور فسق وفجور سے سرورِ انبیا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نفرت	126
حَربِ فُجار (۳۷ قبل ہجرت/ ۵۸۶ء)	127
حَربِ فِجار میں نبی اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت ابوطالب شریک نہیں تھے	128
حِلفُ الفضول (۳۷ قبل ہجرت/ ۵۸۶ء)	129
نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بھیڑ بکریاں چَرانا	130
مکّہ مکرّمہ پر یونانیوں کے اقتدار کی سازش	132
حضرت خدیجۃ الکبریٰ علیہا السلام	133

حضرت خدیجۃُ الکبریٰ علیہا السلام کے ساتھ تجارتی شراکت 135

نبی اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے بارے میں بزرگ راہب سے خالد بن اسید اور طلیق کی گفتگو 138

ابوالمویہب راہب کی خبر 140

حضرت خدیجۃُ الکبریٰ علیہا السلام سے عقد (۲۷ قبل ہجرت/ستمبر ۵۹۵ء) 142

حضرت خدیجہ علیہا السلام نے حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے پہلے کوئی شادی نہیں کی تھی 144

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی کثرتِ ازواج سے متعلق ایک منفی خیال اور اُس کی تردید 146

ازواجِ نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم 151

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو اپنی پسند کے مطابق ازواج کو رکھنے اور چھوڑنے کا اختیار 157

اولادِ نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم 161

حضرت قاسمؓ کی ولادت (۲۵ قبل ہجرت/ ۵۹۸ء) 163

حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کی ولادت (۱۳ رجب ۳۰ عام الفیل/ ۶۰۰ء) 164

خانہ کعبہ کی تعمیرِ نو اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا تدبُّر اور انصاف (۱۸ قبل ہجرت/ ۶۰۵ء) 168

غارِ حرا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی عبادت گزاری 169

پہلی وحی اور آغازِ بعثت (۱۲ قبل ہجرت/ ۶۱۰ء) 171

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے لقب ''اُمی'' کی وضاحت 175

ہواتف، جمادات، نباتات اور حیوانات وغیرہ کی گواہی 178

عجوہ کھجور 187

دعوتِ ذوالعشیرہ (سنہ ۴ بعثت، ۹ قبل ہجرت/ ۶۱۴ء) 188

قریش کا ظلم وستم 193

ہجرتِ حبشہ (رجب ۷ قبل ہجرت/ اپریل ۶۱۵ء) 195

دارالارقم (سنہ ۶ بعثت) 201

معاشرتی مقاطعہ (محرم ۷ قبل ہجرت/ستمبر ۶۱۵ء) 202

رُومیوں کی شکست کی پیش گوئی (سنہ ۸ بعثت، ۵ قبل ہجرت، ۶۱۸ء) 208

معجزۂ شق القمر (سنہ ۹ بعثت) 209

معجزۂ شق القمر اور ہندو مہاراجے 212

مہاراجہ کیرالہ مالابار	212
مہاراجہ مالی بارسامری	215
ریاست کھابڑی کے راجا کنورسین اور وزیر رتن سین	216
ریاست دھار کے راجا بھوج	223
ریاست بھوپال کے راجا بھوجپال	223
معراجُ النبی صَلَّی اللّٰہِ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم (اہلِ سُنّت کی نظر میں)	225
معراجُ النبی صَلَّی اللّٰہِ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم (اہلِ تَشیُّع کی نظر میں)	234
معراجِ جسمانی یا معراجِ روحانی؟	237
بُراق	239
واقعہ معراج پر اہلِ مکّہ کا ردّعمل	240
معراج کا سفرنامہ	243
شجرۂ طوبیٰ	251
سِدرۃُ المنتہیٰ	254
نمازوں میں تخفیف کی درخواست	255
مقصدِ معراج	256
کیا حضرت علی عَلَیْہِ السَّلَام شریکِ معراج تھے؟	264
امکانِ معراج	267
قرآن کی گواہی	269
واقعۂ معراج پر چند اور دلائل	271
معراج اور صلواۃُ النبی صَلَّی اللّٰہِ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم	274
درودِ ابراہیمی	277
ولادتِ حضرت فاطمۃُ الزہراء عَلَیْہَا السَّلَام (۵ بعثت، سنہ ۴۶ عام الفیل/ ۶۱۴ء)	278
حضرت ابوطالب عَلَیْہِ السَّلَام کی وفات (۳ قبل ہجرت/ ۶۱۹ء)	280
حضرت ابوطالبؑ کے بعد قریش کی دست درازیاں	286
اُمّ المومنین حضرت خدیجۃُ الکبریٰ عَلَیْہَا السَّلَام کی وفات (۳ قبل ہجرت/ ۶۱۹ء)	286

حضرت سودہ بنت زمعہ اور حضرت عائشہ بنت ابوبکر (رضی اللہ عنہما) سے عقد (۳ قبل ہجرت) 287

طائف (سنہ ۱۰ بعثت، ۲۷ شوال ۳ قبل ہجرت/فروری، مارچ ۶۱۹ء) 288

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں جنّات کی حاضری 293

قبیلہ خزرج کی ایک جماعت کا قبولِ اسلام (سنہ ۱۱ بعثت) 296

بیعتِ عقبہ اولیٰ (سنہ ۱۲ بعثت، ذوالحجہ ۱ قبل ہجرت/ ۶۲۱ء) 297

بیعتِ عقبہ ثانیہ (سنہ ۱۳ بعثت، ۳ ماہ قبل ہجرت/ جون ۶۲۲ء) 299

ہجرتِ مدینہ (۱۴ بعثت/ ۶۲۲ء) 301

حضرت علی علیہ السلام بسترِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر 301

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غارِ ثور میں 305

خیمۂ اُمّ معبد عاتکہ میں روشنی 307

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حُلیہ مبارک 309

حصّہ دوم
(مدنی دَور)

اسلام میں سنہ ہجری کا اجرا 319

سنہ ایک ہجری 320

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قبا میں تشریف آوری (۸ ربیع الاوّل ۱ ہجری/ ۲۳ ستمبر ۶۲۲ء) 320

مسجد قبا (۱ ہجری/ ۶۲۲ء) 324

قبیلہ اوس اور خزرج میں دیرینہ دشمنی کا خاتمہ (۱ ہجری/ ۶۲۲ء) 325

پہلی نماز جمعہ (۱۲ ربیع الاوّل سنہ ۱ ہجری) 327

پہلی نماز جمعہ کا خطبہ (۱۲ ربیع الاوّل سنہ ۱ ہجری) 328

نمازِ جمعہ کا باقاعدہ آغاز 330

مدینہ منوّرہ 330

مسجدِ نبوی کی تعمیر (ربیع الاوّل ۱ ہجری/ اکتوبر ۶۲۲ء) 333

نماز کی رکعتوں کا تعیّن (۱ ہجری/ ۶۲۲ء)	337
اذان و اقامت (ربیع الاوّل ۱ ہجری/ اکتوبر ۶۲۲ء)	339
ہمدردوں کی وفات (۱ ہجری/ ۶۲۲ء)	340
بنونجار کے نئے قائد (۱ ہجری/ ۶۲۲ء)	341
مہاجرین کی آبادکاری (۱ ہجری/ ۶۲۲ء)	342
مواخات (۱ ہجری/ ۶۲۲ء)	342
زراعت و تجارت	345
میثاقِ مدینہ (دُنیا کا پہلا تحریری دستور)	346
میثاقِ مدینہ کا متن (۱ ہجری/ ۶۲۲ء)	348
میثاقِ مدینہ غیر مسلم دانشوروں کی نظر میں	355
رینالڈ ایلین نکولسن	355
جولیس ویل ہاسن	356
سر تھامس واکر آرنلڈ	358
لیفٹیننٹ جنرل سر جان بیگٹ گلب پاشا	359
روبن لیوی	359
جوزف ہیل	360
فرانسسکو جبریلی	361
ویلیم منٹگمری واٹ	362
ہیو این کینیڈی	363
ایڈورڈ گبن	365
ماؤرس گاڈفرائے ڈی مامبائنز	365
حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کا قبول اسلام (۱ ہجری/ ۶۲۲ء)	366
حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کا قبول اسلام (۱ ہجری/ ۶۲۲ء)	370
زکوٰۃ کا حکم (۱ ہجری/ ۶۲۲ء)	371
دفاعی منصوبہ بندی (رمضان المبارک ۱ ہجری/ مارچ ۶۲۳ء)	371

جہاد (رمضان المبارک ۱ ہجری/ مارچ ۶۲۳ء)	374
غزوہ اور سریہ وغیرہ کی تعریف	375
سریۂ حمزہ بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ/ سریۂ سیف البحری/ سریۂ عیص (رمضان ۱ ہجری)	378
قریش کے تجارتی قافلوں پر حملوں کی تردید	379
سریۂ رابغ یا سریۂ عبیدہ بن حارث رضی اللہ عنہ (شوال ۱ ہجری/ اپریل ۶۲۳ء)	381
حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی رخصتی (شوال ۱ ہجری، اپریل ۶۲۳ء)	382
سریۂ خرّار یا سریۂ سعد بن ابی وقاص (ذیقعدہ ۱ ہجری/ مئی ۶۲۳ء)	382
سنہ ۲ ہجری	383
غزوۂ ودّان اور غزوۂ ابو (ماہِ صفر ۲ ہجری/ اگست ۶۲۳ء)	383
غزوۂ بواط (ربیع الاوّل یا ربیع الثانی ۲ ہجری/ اکتوبر ۶۲۳ء)	384
غزوۂ سفوان/ غزوۂ بدر اُولیٰ (ربیع الثانی ۲ ہجری/ اکتوبر ۶۲۳ء)	385
غزوۂ عُشیرہ (جمادی الاوّل یا جمادی الثانی ۲ ہجری/ نومبر، دسمبر ۶۲۳ء)	386
حضرت علی علیہ السلام کی کنیت ابوتراب کی وجہ	386
سریہ دارِارقم (سنہ ۲ ہجری)	388
عَلم	388
سب سے پہلا عَلم	389
سریۂ عبداللہ بن جحش یا سریۂ نخلہ (رجب ۲ ہجری/ جنوری ۶۲۴ء)	389
تحویل خانہ کعبہ (شعبان سنہ ۲ ہجری/ جنوری، فروری ۶۲۴ء)	392
روزہ (شعبان دو ہجری/ فروری ۶۲۴ء)	393
غزوۂ بدر (۱۷ یا ۱۹ رمضان المبارک/ ۱۳ یا ۱۵ مارچ ۶۲۴ء)	394
غزوۂ بدر کا پس منظر	394
قافلہ	395
خواب	397
لشکرِ کفّار کی جنگ کے لیے روانگی	399
لشکرِ کفّار کی تعداد	401

لشکرِ کفّار کا سامانِ حرب	401
جبرائیل علیہ السلام کی اطلاع اور مجلسِ مشاورت	401
لشکرِ اسلام کی روانگی	404
اسلامی لشکر کی تعداد	405
لشکرِ اسلام کے عَلم اور علمبردار	405
اسلامی لشکر کا سامانِ حرب	406
اسلامی لشکر کا بدر میں پڑاؤ	406
عریش	409
حق و باطل کا ٹکراؤ	410
جنگ میں ملائکہ کی مدد	415
حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کی شجاعت	418
علی علیہ السلام کے ہاتھوں تہ تیغ ہونے والے چند مشہور کافروں کے نام	419
دیگر مجاہدین کے ہاتھوں قتل ہونے والے چند مشہور کافروں کے نام	420
ابوجہل بن ہشام کا انجام	421
اُمیّہ بن خلف کا انجام	423
عقبہ بن ابی معیط کا انجام	423
ابوالبختری بن ہشام کا قتل	424
ابولہب کا انجام	425
شہدائے بدر کے اسمائے گرامی	427
بدر سے واپسی	429
نبی اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے حجام حضرت ابوہند انصاری رضی اللہ عنہ	430
اسیرانِ بدر	430
اسیرانِ بدر کی رہائی	432
سریۂ عمیر بن عدی (رمضان المبارک سنہ ۲ ہجری)	434
غزوۂ قرقرۃ الکدر یا غزوۃ الکدر (۲۵ رمضان ۲ ہجری/ ۲۰،۲۱ مارچ ۶۲۴ء)	435

عید الفطر اور صدقہ فطر (۲۸ رمضان المبارک ۲ ہجری/ ۲۴ مارچ ۶۲۴ء)	436
سریہ سالم بن عمیر (۲ ہجری/ ۶۲۴ء)	437
غزوۂ قینقاع (۱۵ شوال ۲ ہجری/ ۱۰ اپریل ۶۲۴ء)	437
سیّدۃُ نساء العالمین حضرت فاطمۃ الزہراء علیہا السلام کا نکاح (یکم ذی الحجہ سنہ ۲ ہجری)	441
حضرت علی علیہ السلام کی زبانی شادی کی روایت	445
خاتونِ جنّت علیہا السلام کا حق مہر	448
سیّدۂ کونین علیہا السلام کی رُخصتی	449
اُمّ المومنین حضرت اُمّ سلمہؓ کا رَجز	450
اُمّ المومنین حضرت عائشہؓ کا رَجز	450
اُمّ المومنین حضرت حفصہؓ کا رَجز	451
ملکہ کونین سیّدہ فاطمۃ الزہراء علیہا السلام کا جہیز	453
غزوہ سویق (۵ ذوالحجہ ۲ ہجری/ ۲۹ مئی ۶۲۴ء)	456
شاعر اُمیّہ بن صلت کی موت	458
سنہ ۳ ہجری	459
نماز عید قربان اور قربانی (۱۰ ذی الحج ۲ ہجری/ ۳ جون ۶۲۴ء)	459
غزوۂ ذی امر/ غزوۂ بنی ام/ غزوہ انمار/ غزوۂ غطفان (ربیع الاوّل ۳ ہجری)	459
سریہ محمد بن مسلمہؓ (۱۴ ربیع الاوّل ۳ ہجری/ ۴ ستمبر ۶۲۴ء)	462
آیت اللہ سیّد رُوح اللہ خمینی کے پیغام اور فتویٰ کا مکمل متن	466
غزوۂ نجران یا غزوۂ بنو سلیم (ربیع الآخر ۳ ہجری/ ستمبر، اکتوبر ۶۲۴ء)	467
حضرت حفصہؓ سے نکاح (شعبان ۳ ہجری/ فروری ۶۲۵ء)	468
ولادت امام حسن علیہ السلام (۱۵ رمضان ۳ ہجری، ۲۸ فروری ۶۲۵ء)	468
غزوۂ اُحد (۶ شوال ۳ ہجری/ ۲۲ مارچ ۶۲۵ء)	470
اُحد کی وجہ تسمیہ	470
غزوۂ اُحد کا پس منظر	470
لشکرِ کفّار	474

مسلمانوں میں اختلاف رائے	476
لشکرِ اسلام	477
روانگی	478
منافقین کی غداری	478
عینین کا درّہ	479
آغازِ جنگ اور علی ابن ابی طالب علیہ السلام کی شجاعت	480
ابتدائی فتح	484
حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی شہادت	485
مالِ غنیمت کا لالچ اور درّہ عینین والوں کی غلطی	487
شیر خدا علی ابن ابی طالب علیہ السلام کی استقامت	491
انجام	494
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جہاد	497
نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور علی علیہ السلام کی تلواریں حضرت فاطمہ علیہا السلام کے سپرد	500
واقعاتی تسلسل سے متعلق ایک اہم وضاحت	501
جنگ میں مسلمان خواتین کی خدمات	503
جاں نثارانِ اُحد کا مختصر تذکرہ	503
حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام	503
حضرت امیر حمزہ رضی اللہ عنہ	503
حضرت امیر حمزہ رضی اللہ عنہ کی شہادت کا پس منظر	504
حضرت ابو دجانہ انصاری رضی اللہ عنہ	506
حضرت عمرو بن جموح رضی اللہ عنہ	508
رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ اور سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ	509
حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ	510
حضرت سعد بن ربیع رضی اللہ عنہ	511
حضرت زیاد بن سکن رضی اللہ عنہ	511

حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ غسیل الملائکہ	512
حضرت اُمّ عمارہ انصاریہؓ	514
یہودی مخیریق کی جاں نثاری	514
حضرت عمرو بن ثابتؓ	515
شہدائے اُحد کی تجہیز وتدفین	516
شہدائے اُحد کا ماتم	516
حضرت زینب بنت خزیمہؓ سے نکاح	517
غزوۂ حمراالاسد (ہفتہ ۱۶ شوال ۳ ہجری/ ۱۱ اپریل ۶۲۵ء)	517
سنہ ۴ ہجری	519
سریہ ابوسلمہؓ مخزومی (یکم محرم ۴ ہجری/ ۱۳ جون ۶۲۵ء)	519
سریہ عبداللہ بن انیسؓ (۵ محرم ۴ ہجری/ ۱۷ جون ۶۲۵ء)	519
رجیع کا المیہ (صفر ۴ ہجری/ جولائی، اگست ۶۲۵ء)	520
المیہ بئرِ معونہ/ سریۂ منذر بن عمرو/ سریۃ القریٰ (صفر ۴ ہجری/ جولائی اگست ۶۲۵ء)	524
غزوۂ بنی نُضیر (ربیع الاوّل ۴ ہجری/ اگست ستمبر ۶۲۵ء)	526
غزوہ ذات الرقاع (جمادی الاوّل ۴ ہجری/ اکتوبر، نومبر ۶۲۵ء)	529
ولادتِ امام حسین علیہ السلام ۳ شعبان ۴ ہجری (۷ جنوری ۶۲۶ء)	531
رضاعتِ امام حسین علیہ السلام	533
شہزادوں کے نام حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود رکھے	533
شہزادوں کے نام اللہ نے حجاب میں رکھے تھے	533
حسنین علیہم السلام کے نام اہل جنّت کے نام ہیں	534
نبی اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا حسنین علیہم السلام میرے بیٹے ہیں	534
نبی اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا میں ہی ان کا نسب ہوں	534
نبی اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے امام حسن علیہ السلام اور امام حسین علیہ السلام کی مشابہت	535
حسنین علیہم السلام وارثانِ اوصافِ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں	536
حسنین علیہم السلام تمام جنّتی جوانوں کے سردار ہیں	536

حسنین علیہم السلام سے محبت کرنا واجب ہے	537
حسنین علیہم السلام سے بغض رکھنے والا مبغوض ہے	537
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حسنین علیہم السلام کی خاطر منبر سے نیچے تشریف آوری	537
حسنین علیہم السلام پشتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر	537
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طوالتِ سجدہ	538
کیا اچھے سوار ہیں	538
حُرمتِ شراب (۴ ہجری)	539
حضرت اُمّ سلمہؓ سے نکاح (شوال ۴ ہجری/ مارچ ۶۲۶ء)	543
غزوۂ بدر الموعد یا بدر الأُخریٰ (ذیقعد ۴ ہجری/ اپریل ۶۲۶ء)	543
وفات حضرت فاطمہ بنت اسد علیہا السلام (۴ یا ۵ ہجری/ سنہ ۶۲۶ء)	544
سنہ ۵ ہجری	545
غزوۂ دومۃ الجندل (۲۵ ربیع الاوّل ۵ ہجری/ ۲۴ اگست ۶۲۶ء)	545
غزوۂ مریسیع یا غزوۂ بنی المصطلق (شعبان ۵ ہجری/ ۲۸ دسمبر ۶۲۶ء)	546
حضرت جویریہؓ سے نکاح	547
حضرت زینب بنت جحشؓ سے نکاح	548
غزوۂ احزاب یا جنگ خندق (ذیقعد یا شوال ۵ ہجری)	551
دشمنانِ اسلام کی پیش قدمی	552
لشکرِ کفّار کی تعداد	553
لشکرِ اسلام کی تعداد	553
خندق	553
خندق کی حدود	555
لشکرِ کفّار کی آمد	555
بنو قریظہ کی بغاوت	556
بنو قریظہ کی بغاوت کا سد باب	559
مقابلہ	560

عمرو بن عبدِ ود العامری	562
شیرِ خدا کی جنگ	564
عمرو بن عبدِ ود کے ساتھی	572
علی علیہ السلام کے ہاتھوں ایک اور پہلوان کا قتل	573
مشرکین کی خفت	573
اختتامِ جنگ	575
کفّار کا فرار	577
غزوۂ بنوقریظہ (ذیقعد ۵ ہجری/ مارچ ۶۲۷ء)	578
حضرت سعد بن معاذ (رضی اللہ عنہ) کی نامزدگی کی وجہ	582
بنوقریظہ کا انجام	585
حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کی شہادت	588
حضرت ابولبابہ رضی اللہ عنہ کی پشیمانی	589
حجاب کا حکم (یکم ذیقعد ۵ ہجری/ ۲۴ مارچ ۶۲۷ء)	592
سنہ ۶ ہجری	596
سریۂ محمد بن مسلمہؓ یا سریۂ نجد (۱۰ محرّم ۶ ہجری/ یکم جون ۶۲۷ء)	596
غزوۂ بنولحیان (یکم ربیع الاوّل ۶ ہجری/ ۲۱ جولائی ۶۲۷ء)	596
غزوہ ذی قرد یا غزوۂ غابہ (ربیع الاوّل ۶ ہجری)	597
سریۂ غمر یا سریۂ عکاشہ بن محصنؓ (ربیع الآخر ۶ ہجری/ اگست ستمبر ۶۲۷ء)	598
سریۂ ذی القصہ یا سریۂ بنوثعلبہ (ربیع الآخر ۶ ہجری/ اگست ستمبر ۶۲۷ء)	598
سریۂ جموم (ربیع الآخر ۶ ہجری/ اگست ستمبر ۶۲۷ء)	598
سریۂ وادی القریٰ (رجب ۶ ہجری/ نومبر دسمبر ۶۲۷ء)	599
سریۂ علی مرتضیٰ علیہ السلام یا سریۂ فدک (شعبان ۶ ہجری/ جنوری ۶۲۸ء)	599
حدیبیہ کا معرکہ (یکم ذیقعد ۶ ہجری/ ۱۲ مارچ ۶۲۸ء)	600
بیعت رضوان	606
صلح نامہ حدیبیہ کے نکات	612

معاہدہ حدیبیہ پر تبصرہ	613
حضرت اُمّ حبیبہؓ سے نکاح (ذی الحجہ ۶ ہجری/ اپریل مئی ۶۲۸ء)	614
سنہ ۷ ہجری	615
مکتوبات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم (یکم محرم ۷ ہجری/ ۶۲۸ء)	615
مکتوبِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بنام ہرقل، قیصر روم	618
ہرقل، قیصر روم کا خط	620
مکتوبِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بنام شاہِ فارس (ایران)، کسریٰ پرویز	621
مکتوبِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بنام شاہ حبش اصحم نجاشی	622
شاہِ حبش نجاشی کا خط	624
شاہ حبش نجاشی کا دوسرا خط	625
مکتوبِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بنام والی مصر مُقَوقِس	625
حاکم مصر مُقَوقِس کا خط	627
مکتوبِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بنام شاہِ یمامہ ہوذہ	627
شاہِ یمامہ ہوذہ کا خط	628
مکتوبِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بنام منذر بن حارث بن ابی شمر غسانی	629
خیبر (محرم ۷ ہجری/ مئی جون ۶۲۸ء)	630
جنگِ خیبر کا پس منظر	631
لشکرِ اسلام کی روانگی	632
رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور شیر خدا علیہ السلام کی علالت	634
مسلمانوں کی خیبر فتح کرنے کی کوششِ ناکام	634
فاتح خیبر کا انتخاب اور عطائے علم	635
جناب امیر علیہ السلام کا اندازِ ورود	639
شجاعتِ علی ابن ابی طالب علیہ السلام پر تورات کی گواہی	640
شیرِ خدا علی المرتضیٰ علیہ السلام کی جنگ	640
نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خیبر کے یہودیوں پر کرم	644

حضرت صفیہؓ	644
مرحب کا قتل حضرت علی علیہ السلام کی بجائے محمد بن مسلمہ کے کھاتے میں	645
یہود کی سازش	648
آفتابِ امامت کے لیے آفتابِ فلک کی واپسی	649
فدک	650
وادی القریٰ	654
مہاجرین حبشہ کی واپسی	654
پہلا ورود مکّہ، عمرۃ القضاء (ذی القعدہ ۷ ہجری / مارچ ۶۲۹ء)	655
سنہ ۸ ہجری	656
منبرِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم	656
ریاض الجنۃ	658
سریۂ موتہ (جمادی الاوّل ۸ ہجری / اگست ستمبر ۶۲۹ء)	658
جنگ یا پسپائی؟	661
جنگ	662
شکست خوردہ اسلامی فوج کا مدینہ کے باہر استقبال	664

حصّہ سوم
(تکمیل دین)

فتح مکّہ (۱۰ رمضان المبارک ۸ ہجری / یکم جنوری ۶۳۰ء)	667
عہد شکنی	667
تنسیخ معاہدہ اور پھر پچھتاوا	668
سفیرِ قریش کی کوشش ناکام	669
رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رازداری اور مسلمانوں کی غداری	669
مدینہ منوّرہ سے روانگی	671

سفر میں روزے کی عزیمت	672
مکّہ کے نواح میں پڑاؤ	672
ابوسفیان کی گرفتاری	672
اسلامی جاہ وجلال کی ہیبت	674
حضرت سعد بن عبادہ کی سہو وخطا	677
مکّہ میں ہلچل	678
مکّہ کی طرف پیش قدمی	679
عام معافی کا اعلان	682
بت شکنی اور تطہیر کعبہ	685
حضرت بلال ؓ کی اذان	688
مکّہ میں مختصر قیام	688
غزوۂ حنین (شوال ۸ ہجری/ جنوری فروری ۶۳۰ ء)	689
جنگ اوطاس وطائف	695
انصار کا احساس محرومی اور نبی اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خطبۂ ایجاز وبلاغت	697
حضرت ابراہیم کی ولادت (شوال ۸ ہجری/ فروری ۶۳۰ ء)	698
سـنہ ۹ ہجری	699
غزوۂ تبوک، غزوۂ جیش العسرت، غزوۂ فاضحہ (رجب ۹ ہجری/ نومبر ۶۳۰ ء)	699
علی علیہ السلام کو مدینہ میں چھوڑنے کی وجہ	701
اصحابِ عقبہ	704
ہذا طیبہ	706
راس المنافقین عبداللہ بن اُبی بن سلول کی موت	706
مسجد ضرار کی تخریب کاری (۹ ہجری/ نومبر ۶۳۰ ء)	707
خانہ کعبہ میں مشرکوں کے داخلے پر پابندی، ایک تاریخی اعلان	710
فتوحاتِ اسلامی کے بیرونی قبائل پر اثرات	712
حاتم طائی کے بچّوں پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خاص اکرام	712

مباہلہ	713
آیت تطہیر اور حدیث کساء	718
اہل بیتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم	721
مفہومِ اہل بیت (علیہم السلام)، اُمّ المومنین حضرت اُمّ سلمہؓ کی درخواست کی روشنی میں	722
اہل بیت علیہم السلام سے بغض رکھنا	731
سنہ ۱۰ ہجری، حضرت ابراہیمؑ کا انتقال	732
فتح یمن (رمضان المبارک سنہ ۱۰ ہجری)	732
حجۃ الوداع (ذیقعد ۱۰ ہجری)	735
حج تمتع کا حکم	739
غدیر خم (۱۸ ذی الحجہ ۱۰ ہجری)	740
علی علیہ السلام کی جانشینی کا اعلان اہل تشیع کی نظر میں	740
علی علیہ السلام کی جانشینی کا اعلان اہل سنت کی نظر میں	744
غدیر خم کے بعد بھی اہل بیت علیہم السلام کے بارے میں تاکید	750
سنہ ۱۱ ہجری	751
مدینہ کی طرف واپسی اور سریہ اسامہ بن زید حارثہ (۲۶ صفر ۱۱ ہجری)	751
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی علالت اور آخری ایامِ حیات	753
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم متوجہ بہ جنّت البقیع	753
حضرت علی علیہ السلام کو وصال سے متعلق وصیّت	753
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خطبہ	754
واقعہ قصاص	755
نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت عائشہؓ کے گھر میں	758
حدیثِ قرطاس	759
رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا آخری خطبہ	761
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وصیّت برائے غسل، کفن ودفن	761
بیٹی اور بھائی سے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی گفتگو	763

لختِ جگر سے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آخری راز و نیاز	765
ہزار ہا ابوابِ علم	767
سپردگی میراث	769
جبرائیل علیہ السلام کی عیادت	771
ملکُ الموت کا اجازت طلب کرنا	772
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت	775
سببِ رحلت	777
رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا غسل	777
رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کفن	779
رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نماز جنازہ	779
رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دفن	780
شبِ وصالِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اہل بیت علیہم السلام	783
مصحفِ حضرت فاطمہ علیہا السلام	785
أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ	786
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اپنے ساتھیوں کے ساتھ حُسن سلوک	787
گھر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا طرزِ عمل	788
گھر سے باہر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا طرزِ عمل	789
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اندازِ گفتگو	790
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا دخول وخروج اور نشست عام	792
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محافل ومجالس	792
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سخاوت	793
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حلم ودرگذر	795
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بچّوں پر شفقت	797
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عادات واطوار	800
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پانچ خاص عادات	801

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خاموشی	801
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تبسم	802
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مزاح	803
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا طعام	805
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا پسندیدہ مشروب	806
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا لباس	806
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اسلحہ وغیرہ	807
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دیگر اشیائے مصرف	810
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بستر	810
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سرمایہ	811
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نماز اور روزہ	813
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حج اور عمرے	813
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قبولیتِ دُعا	814
مختصاتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم	816
معجزاتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم	823
اوصافِ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دیگر آسمانی کتب میں	847
شاہِ یمن تبع حمیری	851
اللہ تعالیٰ کا تمام انبیائے کرام علیہم السلام سے عہد لینا	854
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حاظر و ناظر	855
نعتِ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم	860
دُعا	861
مآخذ	862

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّاٰلِ مُحَمَّدٍ ○

ہدیہ

میں اس کتاب کو

نہایت عجز وانکسار اور عقیدت واحترام کے ساتھ

جنابِ رسولِ خدا صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی بارگاہِ رحمت میں

ہدیہ کرتا ہوں۔

انتساب

رسولِ معظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عظیمُ المرتبت

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے نام

مُقدّمہ

درود و سلام اور فضائلِ درود پر لکھی گئی اپنی پہلی تالیف ''صَلُّوْا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوْا تَسْلِیْماً'' کی تکمیل کے بعد میری شدید خواہش تھی کہ رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیّبہ پر لکھنے کی سعادت بھی حاصل کروں۔ میری خوش بختی ہے کہ آج سے یہ سعادت میری زندگی کا حصّہ بننے جارہی ہے۔ سیرۃ النبی ﷺ پر لکھی گئی کئی کتابیں میں نے پڑھی ہیں۔ پہلے بھی، زندگی کے مختلف ادوار میں اور خصوصاً کتابِ ہٰذا کی تالیف کے دوران میں بھی۔ سیرتِ نبی ﷺ ایک موضوعِ بیکراں ہے، حضور علیہ الصلوٰۃ والسّلام کی حیاتِ پاک کے ہزارہا پہلو ہیں، ہر پہلو دوسرے سے الگ اور اپنی جگہ حُسن و کمال کا ایک مکمل پیکر ہے۔ شاید یہی وجہ رہی ہو کہ کچھ اصحاب نے محبت و عقیدت میں سرشار ہو کر لکھتے ہُوئے اپنی کتب کو ایسا رنگ دے دیا کہ اُن کی کتابیں سیرۃ النبی ﷺ کی کتب کی بجائے کوئی ادبی شاہکار معلوم ہوتی ہیں جن میں جابجا رنگین الفاظ، تشبیہات اور استعارے نظر آتے ہیں۔ اور بعض کتابیں تو یوں لگتی ہیں جیسے احادیث و روایات کا مجموعہ ہوں۔ میں نے اِن دونوں طریقہ ہائے اظہار سے گریز کیا ہے اور کوشش کی ہے کہ سیدھے سادھے اور سادہ پیرائے میں حضور ﷺ کی حیاتِ طیّبہ بیان ہو۔

سیرۃ النبی ﷺ پر لکھی گئی اکثر کتب میں بعض ایسی مشہور و معروف روایات بھی پائی جاتی ہیں جو حضور ﷺ کی شان و عظمت کے منافی ہیں۔ ممکن ہے اُن روایات کو اپنی کتابوں میں شامل کرنے والوں نے اُن میں کوئی نہ کوئی پہلو ایسا تلاش کر لیا ہو جو اُن کے حساب سے حضور ﷺ کی تعریف و توصیف کے زُمرے میں آتا ہو لیکن میرے نقطۂ نظر سے اُن روایات کا مجموعی تاثر عظمتِ مصطفیٰ ﷺ کے منافی جاتا ہے، اس لیے میں نے اُن کو کتابِ ہٰذا میں شامل ہی نہیں کیا اور اگر کسی کو شامل کیا ہے تو اُس پر اپنا استدلال پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔

علاوہ ازیں ایسی کتب کی تعداد بھی کم نہیں جن میں تاریخ کو مسخ کر کے خود ساختہ روایات شامل کی گئیں ہیں جو سراسر توہینِ رسالت کے زُمرے میں آتی ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ توہینِ رسالت پر مبنی کتابیں اور فلمیں تیار کرنے والے ملعونوں نے ایسی کتب سے بھی مواد حاصل کر کے یکجا کیا ہے۔ ایسی

ناپاک سازشوں کا مقابلہ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اپنی تاریخ کو دُرست کیا جائے اور نبی گرامی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی حیاتِ طیبہ کے حقیقی پہلو دُنیا کے سامنے لائے جائیں۔ اِس کے لیے علما کرام کو چاہیے کہ مِل بیٹھ کر ایسی کتب سے تمام غیر حقیقی اور خود ساختہ مواد خارج کریں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی حیاتِ طیبہ، تاریخِ اسلام اور احادیثِ مبارکہ کی ایسی کتب ترتیب دیں جو حقائق پر مبنی ہوں اور ہر سُقم سے پاک ہوں۔ ''بَلَغَ الْعُلیٰ بِکَمَالِہٖ'' مجھ جیسے طالب علم کی طرف سے ایسی ہی ایک چھوٹی سی کوشش ہے۔

سیرت اُلنبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے بیان میں ضروری ہے کہ لفظ ''سیرت'' کی وضاحت ہو جائے کیونکہ اِس کے بغیر ''سیرتِ نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم'' کی توضیح نہیں کی جا سکتی۔ لفظ ''سِیْرَۃ'' عربی لغت میں ''سَیْر'' سے اخذ کیا گیا ہے۔ ''سَیْر'' یعنی حرکت کرنا اور چلنا وغیرہ اور ''سِیْرَۃ'' یعنی حرکت کرنے اور چلنے کا انداز۔ ''سِیْرَۃ'' وزن پر ہے ''فِعْلَۃ'' کے اور عربی زبان میں ''فِعْلَۃ'' دلالت کرتا ہے نوعیت پر۔ مثلاً ''جَلْسَۃ'' یعنی بیٹھنا اور ''جِلْسَۃ'' یعنی بیٹھنے کا انداز۔ اسی طرح ''سَیْر'' کا مفہوم ہے چلنا اور ''سِیْرَۃ'' کا مطلب ہے چلنے کا انداز۔ پس سِیرۃُ النبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے مراد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا طرزِ عمل ہے نہ کہ عمل اور جن لوگوں نے سیرت کے عنوان سے کتابیں لکھی ہیں اُن میں سے اکثر نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے عمل کو تحریر کیا ہے نہ کہ عمل کے انداز کو، لہٰذا وہ کتابیں ''سَیْر'' کے زمرے میں آئیں گی نہ کہ ''سِیْرَۃ'' کے۔ یہ ایک گہرا نکتہ ہے۔ میں نے زیرِ نظر کتاب ''بَلَغَ الْعُلیٰ بِکَمَالِہٖ'' میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ''سَیْر'' اور ''سِیْرَۃ'' یعنی عمل اور طرزِ عمل، دونوں کو جمع کرنے کی کوشش کی ہے۔

جب ایسی عظیم ہستی کا ذِکر ہو تو ظاہر ہے کہ تاریخ اور احادیث کی مستند کتب ہی سے روایات و واقعات لیے جاتے ہیں، آپ زیادہ سے زیادہ اِن روایات کو سلیس زبان میں بیان کر سکتے ہیں یا بعض اوقات موضوع کے اعتبار سے مختصر کر سکتے ہیں۔ میں نے بھی یہی طریقہ اختیار کیا ہے لیکن کچھ مقامات پر محض اِس وجہ سے کہ کہیں روایت میں تحریف کا گمان نہ گزرے، میں نے حوالہ کی کتاب سے پورے کا پورا واقعہ بعینہٖ درج کیا ہے۔ بعض واقعات ایک ہی باب میں دو یا دو سے زیادہ بار بیان ہُوئے ہیں، اس تکرار کی وجہ یہ ہے کہ مختلف روایات میں اُن کا ذِکر بھی الگ انداز میں آیا ہے اور میں نے کوشش کی ہے کہ قاری کو مختلف روایات سے آگہی حاصل ہو جائے تا کہ کسی نتیجے پر پہنچنا مشکل نہ رہے۔

کتابِ ہذا میں چند روایات ایسی بھی ہیں جو عیسائی یا یہودی راہبوں اور کفّار وغیرہ کے بیانات پر مبنی ہیں۔ اُنھوں نے اپنی گفتگو میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے لیے ''تم، تمھارا، اُس، اُس کا اور اُسے'' وغیرہ جیسے الفاظ یعنی صیغۂ واحد استعمال کیا تھا، روایات میں عموماً الفاظ وفقرات بعینہٖ لکھے جاتے ہیں لیکن میں نے یہاں ایسے تمام الفاظ کو احتراماً ''آپ، آپ کا، اُنھیں اور اُن کا'' جیسے الفاظ یعنی جمع کے صیغے سے تبدیل کر دیا ہے اور بریکٹ میں ''صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم'' کے الفاظ شامل کیے ہیں جو کہ اُن لوگوں کی زبان سے فطری معلوم نہیں ہوتے لیکن ہمارے اہلِ علم و دانش قارئین سمجھ سکتے ہیں کہ ہماری زبان اور قلم سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے لیے واحد کا صیغہ استعمال ہونا اور اسمِ گرامی بغیر صلوٰۃ کے ادا ہونا ہماری فطرت کے خلاف ہے۔

ہماری بدقسمتی ہے کہ ہمارے ''دینِ واحد'' کو ٹکڑوں میں بانٹ دیا گیا ہے۔ مختلف مسالک اور فرقے اور پھر اِن فرقوں کے اندر مزید گروہ بن گئے ہیں۔ میں ہمیشہ سے اتحادِ بین المسلمین کا خواہاں رہا ہوں اِس لیے میں نے اپنی اِس تالیف میں کسی ایک مسلک کی روایات پر اکتفا نہیں کیا بلکہ مسلمانوں کے معروف مسالک کی کتب سے روایات کو یکجا کرنے کی سعی کی ہے۔

میں، علامہ اظہر حسین بہشتی اور علامہ سیّد مزمل نقوی کا بے حد ممنون ہوں جن کی راہنمائی کتابِ ہذا کی تالیف کے دوران میں میرا حوصلہ بڑھاتی رہی اور میرے رخشِ قلم کو مہمیز کرتی رہی۔ انھوں نے نہایت باریک بینی سے کتاب کا مطالعہ کر کے اس میں پائی جانے والی غلطیوں کی نشاندہی اور اصلاح فرمائی۔ اللہ تعالیٰ ان کی توفیقات میں اضافہ فرمائے اور ان کی صحت و زندگی میں برکت فرمائے۔ آمین۔

سیّد حماد رضا بُخاری
فیصل آباد۔ پاکستان
۰۸ جنوری ۲۰۱۴ء
فون: +92 300 9655650
ای میل: hrbukhari@hotmail.com

بَلَغَ الْعُلیٰ بِکَمَالِہٖ

(حیاتِ طیّبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم)

حصّہ دوم

(مدنی دَور)

(سنہ ا ہجری تا ۸ ہجری)

سیّد حماد رضا بخاری

اسلام میں سنہ ہجری کا اجرا

دُنیا میں عموماً اور عیسائی ممالک میں خصوصاً عیسوی کیلنڈر رائج ہے کیونکہ عیسائی مذہب کے پیروکار اپنی تاریخ کا آغاز حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے کرتے ہیں۔ اسلام ایک عالمگیر مذہب ہے اور اس میں دیگر مذاہب سے زیادہ احسن طریقے سے انبیائے کرام علیہم السلام پر ایمان رکھا جاتا ہے لیکن اس کے باوجود تاریخِ اسلام کی ابتدا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے ہوتی ہے نہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے یومِ ولادت سے بلکہ اس کا آغاز آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مکّہ سے مدینہ ہجرت سے ہوتا ہے۔

اسلام واحد مذہب ہے جس کی اساس ایسے اُصولوں پر رکھی گئی ہے جو ابد تک ہر دَور کی انسانی ضرورتوں اور تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے کافی ہیں پس ایسے دینِ کامل کے ماننے والوں کے لیے اپنی تاریخ کا اجرا کسی اور مذہب یا قوم کے طریق سے کرنا مناسب نہیں تھا چنانچہ اپنے لیے ایک الگ نقطۂ آغاز منتخب کیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت سنہ ایک عامُ الفیل میں ہوئی۔ تاریخِ عرب میں عامُ الفیل کے حوالے سے بھی واقعات و روایات ملتی ہیں لیکن عامُ الفیل کو ابتدائے تاریخِ اسلام قرار نہیں دیا گیا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت کے حوالے سے بھی اس سال کو آغازِ تاریخِ اسلام نہیں کہا گیا کیونکہ اُس وقت ہر طرف شرک و بت پرستی کا راج تھا اور اسلام کا بظاہر نام و نشان ہی نہیں تھا۔

اس کے بعد دوسرا موقع بعثت کا تھا۔ لیکن بعثت کے وقت بھی چند لوگ ایسے تھے جو اسلام کے نور سے منوّر تھے باقی تمام عالم کفر و اِلحاد کی ظلمتوں میں ٹھوکریں کھا رہا تھا۔ ہاں البتہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مکّہ سے مدینہ ہجرت وہ موقع تھا جب چشمِ فلک نے پہلی بار شمعِ رسالت کے گرد پروانوں کا ایک عظیم جھرمٹ دیکھا، مدینہ کے اُفق پر ماہِ رسالت طلوع ہُوا تو مدینہ منوّر ہو کر مدینہ منوّرہ بنا اور اُس کی فضائیں ''طَلَعَ الْبَدْرُ عَلَیْنَا'' اور ''مَرْحَبَا یَا خَیْرَ دَاعٍ'' کی رُوح

پرورصداؤں سے گونج اُٹھیں، پس یہی وہ وقت تھا جسے تاریخِ اسلام کی ابتدا قرار دیا جاسکتا تھا اوراسی کونقطہ آغاز قرار دیا گیا۔

اکثر علما اور مؤرّخین کا بیان ہے کہ اس کا مشورہ امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام نے دیا تھا۔[1] احمد بن واضح الیعقوبی، تاریخ یعقوبی میں لکھتے ہیں، ''ہجرت کے سولھویں سال دوسرے خلیفہ حضرت عمرؓ نے تاریخِ اسلام کا نقطۂ آغاز ولادتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یا یومِ بعثت کومقرر کرنا چاہا لیکن حضرت علی (علیہ السلام) نے منظور نہیں کیا اور فرمایا کہ اسلامی تاریخ کی ابتدا ہجرت سے ہونی چاہیے۔''[2]

سنہ ایک ہجری

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قبا میں تشریف آوری

(۸ ربیع الاوّل ۱ ہجری/ ۲۳ ستمبر ۶۲۲ء)

رسولِ گرامی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہستی عالمین کے لیے ایک نعمتِ عظمیٰ ہے۔ دَورِ جاہلیت میں گمراہی کے گڑھوں میں سسکتے ہوئے انسانوں اورنورِ حق کی تلاش میں سرگرداں لوگوں کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ مبارکہ نجات اور روشنی کا وہ منبع تھی جس کی طرف وہ پروانوں کی طرح اُمڈے چلے آرہے تھے۔ جوبھی اہلِ دِل آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک بار مل لیتا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا گرویدہ ہوجاتا اور جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شخصیت کے بارے میں دوسروں سے سُن لیتا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ملنے کا مشتاق ہوجاتا۔

مدینہ کے عوام وخواص اکثر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں مکّہ مکرمہ حاضر ہُوا کرتے تھے اور بڑی عقیدت سے عرض پرداز ہوتے تھے کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمارے

---

[1] علامہ نجم الحسن کراروی (متوفی ۱۹۸۲ء)، چودہ ستارے، بحوالہ غیاث اللغات

[2] ابن واضح الیعقوبی (متوفی ۲۹۲ء)، تاریخ یعقوبی، ج ۲ ص ۲۳۱

پاس منتقل ہو جائیں۔ پس جب اُنھیں معلوم ہُوا کہ اُن کی دُعائیں مستجاب ہونے جا رہی ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تشریف لا رہے ہیں تو اُن کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ وہ صبح سویرے شہر سے باہر نکلتے اور بیتابی سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی راہ تکتے لیکن ہر ڈھلتا ہُوا سورج اُمیدوں کی ضیا اپنے ساتھ لے جاتا اور وہ مایوس ہو کر گھروں کو لوٹ جاتے۔ [۱]

آخر کار ۱۲ ربیع الاوّل دوشنبہ (بروز پیر) [۲] اُن کے لیے پیامِ نوید لے کر طلوع ہُوا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی سواری مقامِ قبا پر پہنچی۔ کتاب ''مسلمانانِ عالم'' کے مصنف بیرسٹر کے اے حمید کی تحقیق کے مطابق وہ ۱۶ ستمبر ۶۶۲ء کا دن تھا [۳] اور اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور کے سابق وائس چانسلر ڈاکٹر نصیر احمد ناصر کے مطابق وہ ۸ ربیع الاوّل ۱ ہجری/ ۲۳ ستمبر ۶۶۲ء کا دن تھا۔ [۴]

مکّہ سے مدینہ جاتے ہوئے قبا مدینہ طیبہ سے تین میل پہلے آتا ہے۔ یہاں قبیلہ بنی عمرو بن عوف آباد تھا۔ قبیلے کے مرد و زن حتیٰ کہ بچّے بھی حسبِ معمول حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی راہ دیکھ رہے تھے۔ وہ صبح سویرے آئے تھے اور اب دوپہر ڈھل رہی تھی، دن بھر دھوپ کی شدت میں کھڑے رہنے سے وہ نڈھال اور مایوس ہو کر واپس ہونا چاہتے تھے کہ ٹیلے پر کھڑے ایک یہودی نے چِلّا کر کہا، ''وہ آ گئے جن کا تمھیں انتظار ہے۔'' نڈھال اور مایوس لوگوں کے لیے یہ جملہ پیامِ حیاتِ نو ثابت ہُوا۔ اُن میں خوشی کی لہر دوڑ گئی اور وہ تکبیر کی صدائیں بلند کرتے ہوئے دیوانہ وار آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی طرف لپکے۔ [۵] فرطِ شوق سے اُن کا جوش و خروش عروج پر تھا اور وہ

---

[۱] محمد ابن سعد (متوفی ۲۳۰ ہجری)، طبقات ابن سعد ج ۱ ص ۱۵۷۔ علامہ علی نقی نقوی، تاریخ اسلام، ص ۱۲۹

[۲] شیخ عبد الحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت۔ ابو جعفر محمد بن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ھ) تاریخ طبری ج ۲ ص ۲۴۹۔ علامہ علی نقی نقوی، تاریخ اسلام، ص ۱۲۹

[۳] علامہ علی نقی نقوی۔ تاریخ اسلام، ص ۱۲۹ بحوالہ بیرسٹر کے اے حمید، مسلمانانِ عالم

[۴] ڈاکٹر نصیر احمد، کتاب: پیغمبر اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم، ص ۳۷۸

[۵] محمد ابن سعد (متوفی ۲۳۰ ہجری)، طبقات ابن سعد، ج ۱ ص ۱۵۸

شدتِ جذبات سے نعرے لگاتے اور استقبالیہ اشعار گاتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف بڑھ رہے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ناقہ ٹھہر گیا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سواری سے نیچے تشریف لائے تو لوگ پروانہ وار قدم بوسی کے لیے ٹوٹ پڑے۔ ہر شخص چاہتا تھا کہ ملاقات کی سعادت سب سے پہلے اُسے نصیب ہو اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی میزبانی کا شرف بھی اُسے حاصل ہو۔

''حیاتُ القلوب'' میں شیخ طوسی کی روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسی قبیلہ عمرو بن عوف کے ہاں قیام فرمایا۔ دیگر روایات کے مطابق، ایک نابینا مردِ صالح کلثوم بن ہدم رضی اللہ عنہ کے گھر کو شرف بخشا اور سعد بن خثیمہ اوسی کے ہاں بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے منتقل ہونے کی روایت ملتی ہے۔ دراصل کلثوم بن ہدم رضی اللہ عنہ قبیلہ عمرو بن عوف کے سردار تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُنھیں کے گھر کو زینت بخشی تھی۔ [1] سعد بن خثیمہ غیر شادی شدہ تھے، اُن کا گھر ''مردانہ'' تھا یعنی وہاں خواتین نہیں رہتی تھیں صرف مردوں کی آمدورفت ہُوا کرتی تھی اس لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لوگوں سے ملاقات کے لیے اُن کے گھر کو ترجیح دی۔ پس، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وہاں تشریف لے جانے کی وجہ سے بعض لوگ یہ سمجھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قیام سعد بن خثیمہ کے ہاں ہے۔ [2]

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے جاں نثار بھائی اور رفیقِ خاص حضرت علی علیہ السلام کو اپنی جگہ اپنے بستر پر سُلا کر اور قریش کی امانتیں واپس کرنے کا فریضہ سونپ کر مکّہ میں ہی چھوڑ آئے تھے ورنہ ہجرت کے اس اہم اور نازک موقع پر یہ کبھی نہیں ہوسکتا تھا کہ علی علیہ السلام آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ نہ ہوتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قبا پہنچ کر علی علیہ السلام کی کمی شدت سے محسوس کر رہے تھے اور اُن کی رفاقت کے لیے بیقرار تھے چنانچہ خط روانہ کیا کہ جلد از جلد میرے پاس آجائیں۔ یہ خط ابو واقد لیثی لے کر گئے تھے اور اُن کے ہمراہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آزاد کردہ غلام حضرت ایمنؓ بھی تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خط ملتے ہی حضرت علی علیہ السلام امانتوں کی ادائیگی سے سبکدوش ہوئے اور بنی ہاشم کی

---

[1] ابو جعفر محمد بن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ھ)، تاریخ طبری ج ۲ ص ۲۵۶، علامہ باقر مجلسیؒ، حیاتُ القلوب

[2] ابو جعفر محمد بن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ھ)، تاریخ طبری، ج ۲ ص ۲۴۸۔ علامہ علی نقی، تاریخ اسلام، ص ۱۳۰

مستورات جن میں آپ کی والدہ جناب فاطمہؓ بنت اسد، حضرت فاطمۃ الزہراء علیہاالسلام اور فاطمہؓ بنت زبیر بن عبدالمطلب بھی تھیں اور اُن لوگوں کو جو کسی سبب سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ نہیں جاسکے تھے، ہمراہ لے کر چل پڑے۔ عورتیں اور بچّے اُونٹوں پر سوار تھے جب کہ حضرت علی علیہ السلام خود پیادہ تھے۔ آپ قبا پہنچے تو سنگلاخ راستوں پر پیدل چلنے کی وجہ سے آپ کے پاؤں زخمی ہو گئے تھے اور اُن پر ورم آ گیا تھا۔ بقول ابن اثیر، ''علی علیہ السلام کے پیروں سے خون جاری تھا اور جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نظر اُن پر پڑی تو فرطِ محبت سے آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُن کے پاؤں پر اپنا لعابِ دہن لگایا جس سے وہ اچھے ہو گئے۔''[1]

شیخ عبدالحق محدث دہلوی لکھتے ہیں کہ سیّدنا علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ' نے تین دن کے فرق سے مکّہ مکرمہ سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہو کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مسرت و شادمانی میں اضافہ فرمایا۔ ''روضۃ الاحباب'' میں ہے کہ حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ' مکّہ مکرمہ سے پا پیادہ سفر کرتے ہوئے آئے تھے۔ پیدل چلنے کی وجہ سے اُن کے پاؤں میں چھالے پڑ گئے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے چھالوں پر دستِ مبارک پھیرا تو وہ اُسی وقت ٹھیک ہو گئے۔ یہ حقیقت اُس کیفیت کی مانند ہے جو روزِ خیبر پیش آئی تھی کہ علی علیہ السلام کی آنکھوں میں آشوب آ گیا تھا اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لعاب دہن لگانے سے وہ اُسی وقت ٹھیک ہو گئی تھیں۔

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّاٰلِ مُحَمَّدٍ ○

---

[1] عبدالحق محدث دہلوی، مدارج النبوت ج ۲ ص ۹۴ بحوالہ روضۃ الاحباب۔ علامہ محمد باقر مجلسی (متوفی ۱۶۹۸ء)، حیاتُ القلوب۔ مولانا سید ظفر حسن، مجمع الفضائل۔ آیت اللہ جعفر سبحانی، دی میسیج (The Message)

مسجد قبا

(۱ہجری/ ۶۲۲ء)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے قُبا میں ایک مسجد کی بنیاد رکھی۔ یہ مسجد آج بھی موجود ہے اور اِس کا نام مسجد قُبا ہے۔ یہ وہ پہلی مسجد ہے جو اسلام میں تعمیر کی گئی۔ اِس کی تعمیر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اپنے دستِ مبارک سے پتھر اُٹھائے اور صحابہ کرامؓ کے ساتھ مِل کر ایک عام آدمی کی طرح کام کیا۔ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا اپنی قوم کے لوگوں کے ساتھ مِل کر محنت کشوں کی طرح کام کرنا محنت کی عظمت کو اُجاگر کرتا ہے، اخوت و بھائی چارے کا درس دیتا ہے اور قیادت کے صحیح دستور اور سلیقہ کی طرف راہنمائی بھی کرتا ہے۔ یعنی ایک کامل راہبر و راہنما وہی ہوتا ہے جو اپنے عمل سے راہنمائی کرے نہ کہ محض زبانی احکام جاری کرنے پر اکتفا کرے۔

یہ مسجد خالص تقویٰ کی بنیاد پر بنائی گئی تھی اور اس میں کسی قسم کی نمود و نمائش کا کوئی عمل دخل نہیں تھا۔ سیّدنا امام علی علیہ السّلام سے مروی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا، ''اَلْمَسْجِدُ الَّذِیْ اُسِّسَ عَلَی التَّقْوٰی اَوَّلَ یَوْمٍ ھُوَ مَسْجِدُ قُبَاءَ'' یعنی وہ مسجد جو پہلے ہی دن تقویٰ پر بنائی گئی ہے مسجد قبا ہے۔[۱] چنانچہ ارشادِ اللہ ربُ العزت ہوتا ہے:[۲]

''لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَی التَّقْوٰی مِنْ اَوَّلِ یَوْمٍ اَحَقُّ اَنْ تَقُوْمَ فِیْهِ ؕ فِیْهِ رِجَالٌ یُّحِبُّوْنَ اَنْ یَّتَطَهَّرُوْا ؕ وَاللّٰهُ یُحِبُّ الْمُطَّهِّرِیْنَ ﴿۱۰۸﴾''

(وہ مسجد جو پہلے دن ہی تقویٰ پر بنائی گئی ہے زیادہ مستحق ہے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) اُس میں قیام فرمائیں، اُس میں ایسے لوگ ہیں جو صفائے باطن کو پسند کرتے ہیں اور اللہ پاکی چاہنے والوں کو پسند فرماتا ہے) اکثر مفسرین کے نزدیک مندرجہ بالا آیتِ کریمہ کا شانِ نزول یہی مسجد قبا ہے۔

---

[۱] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۹۷

[۲] سورۃ توبہ، آیت ۱۰۸

منقول ہے کہ جس نے کامل وضو کیا اور مسجدِ قبا میں آکر نماز پڑھی اُس نے ایک عمرہ کا ثواب حاصل کرلیا۔[۱] آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اِس مسجد میں صحابہ کرامؓ کے ساتھ نماز ادا فرمائی اور اُسی روز مدینہ کی طرف روانہ ہوئے۔ مسجد قبا کا فاصلہ مسجد نبوی سے تقریباً سوا چار کلومیٹر ہے۔

قبیلہ اوس اور خزرج میں دیرینہ دشمنی کا خاتمہ

(۱ہجری/ ۶۲۲ء)

اُن دنوں مدینہ میں دو طاقتور قبیلے اوس اور خزرج آباد تھے۔ دونوں قبیلوں میں عرصۂ دراز سے سخت دشمنی چلی آرہی تھی۔ دونوں ہی کے سرکردہ افراد مکّہ مکرمہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہُوا کرتے اور گذارش کیا کرتے تھے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مدینہ تشریف لے آئیں اور ہمیں شرفِ غلامی بخشیں۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہجرت فرمائی۔ قیامِ قبا کے دوران میں قبیلہ اوس کے لوگ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے ہی تھے مگر خزرج کا کوئی شخص نظر نہ آتا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے اردگرد بیٹھے لوگوں کو بغور دیکھتے اور اُن میں خزرج کا کوئی شخص نہ پاکر اُن کی کمی محسوس تو کرتے لیکن اس کا اظہار نہ فرماتے اور خاموش رہتے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خاموشی میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حکمت کے خدا جانے کتنے راز نہاں ہوں گے مگر ہماری ناقص عقل کی پرواز تو یہیں تک ہے کہ دونوں قبیلے ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے، اُن میں سے ایک قبیلہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا میزبان تھا اور اپنے میزبان سے اُس کے دشمن کا ذِکر کر کے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اُس کی دِل شکنی نہیں کرنا چاہتے ہوں گے اور اس کے لیے کسی مناسب وقت کے منتظر ہوں گے۔ پھر وہ مناسب وقت جلد ہی آگیا۔ ایک روز نمازِ عشاء کے بعد قبیلہ خزرج کے حضرت اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ چہرے پر نقاب ڈالے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سلام عرض کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بہت خوش ہوئے اور اُن سے تاخیر سے آنے کا سبب دریافت

---

[۱] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۹۷

فرمایا۔ اُنھوں نے کہا کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! بھلا یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ مجھے قرب و جوار میں آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے تشریف فرما ہونے کی خبر ملے اور میں آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں حاضری نہ دوں؟ دراصل ہم میں اور ہمارے برادر قبیلہ اوس میں خشونت چل رہی ہے جو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے علم میں بھی ہے، میں نہیں چاہتا تھا کہ کوئی ناخوشگوار واقعہ رونما ہُو اس لیے اُن کے ہاں آنے سے گریز کرتا تھا مگر اب مجھ میں صبر کی تاب نہ رہی تو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی زیارت کے لیے چلا آیا۔

رسولِ معظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اوس وخزرج میں مصالحت و اخوّت کے لیے شاید کسی ایسے ہی موقع کا انتظار فرما رہے تھے پس فوراً اوس کے لوگوں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ تم میں کون ہے جو اسعد بن زرارہ کو پناہ دے گا؟ اوس کے تمام حاضرین پکار اُٹھے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا پناہ دینا ہمارا ہی پناہ دینا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، نہیں! تم میں سے کوئی ایک اس کی ذمہ داری قبول کرے۔ سعد بن خثیمہ اور عویم بن ساعدہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! ہم انھیں پناہ دیتے ہیں۔[۱]

چنانچہ دونوں اوسیوں نے ایک خزرجی بھائی کی حفاظت کی ذمہ داری قبول کرلی۔

حضرت اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ اب بلاخوف وخطر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر رہتے اور دوسرے اوسیوں کے ساتھ مل کر نماز ادا کرتے۔ کبھی کسی اوسی کو ہمت نہ ہوئی کہ اشارتاً یا کنایتاً بھی اُن کو کوئی تکلیف پہنچائے۔

اس روایت سے لگتا ہے کہ اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ کی دیکھا دیکھی قبیلہ خزرج کے اور لوگ بھی آنے لگے ہوں گے اور قبیلہ اوس کے لوگوں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم پر اُن کا بھی خیر مقدم کیا ہوگیا اور اس طرح دونوں قبیلوں کے مابین دیرینہ دشمنی اخوّت اور بھائی چارے میں بدل گئی ہوگی کیونکہ اس کے بعد تاریخ میں دونوں قبیلوں کے درمیان خونریزی کا کوئی واقعہ نہیں ملتا۔

---

[۱] علامہ علی نقی نقوی، تاریخ اسلام، ص ۱۳۳

پہلی نماز جمعہ

(۱۲ ربیع الاوّل سنہ ۱ ہجری)

روایت ہے کہ قبا سے مدینہ تشریف لاتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قبیلہ بنو سالم سے گذرے تو اُنھوں نے بھی سب کی طرح آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں قیام کی درخواست پیش کی مگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خاموشی اختیار فرمائی۔ وہ زوالِ آفتاب کا وقت تھا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ناقہ بنو سالم کی مسجد کے پاس بیٹھ گیا، علامہ طبرسی نے صراحتاً لکھا ہے کہ وہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آنے سے قبل اس مسجد کی داغ بیل ڈال چکے تھے اور ناقے کا وہاں بیٹھنا قدرت کی طرف سے اشارہ تھا کہ نمازِ جمعہ آج یہیں ہوگی۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ظہر کے وقت وہیں نماز ادا فرمائی۔ [۱] علامہ طبری کا بیان اُن سے قدرے مختلف ہے، وہ کہتے ہیں وہاں پہلے سے مسجد موجود نہیں تھی بلکہ اس کے بعد تعمیر کی گئی۔ [۲]

کے اے حمید لکھتے ہیں کہ ۱۲ ربیع الاوّل سنہ ۱ ہجری کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک سو مسلمانوں کے ساتھ جمعہ کی نماز ادا فرمائی اور اس موقع پر جو خطبہ پڑھا وہ تاریخ عالم میں ایک نمایاں خصوصیت رکھتا ہے۔ [۳] مدارج النبوّت میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جمعہ کے دن، طلوعِ آفتاب کے وقت ''بطن وادی'' سے گذر کر اُس مقام پر تشریف لائے جہاں اب مسجد صغیر بنائی گئی ہے۔ وہاں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نمازِ جمعہ پڑھائی اور طویل خطبہ دیا جو خوشخبری دینے والا، ڈرانے والا اور اہل ایمان کے دلوں کو نور سے لبریز کرنے والا تھا۔ نماز جمعہ کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی سواری پر سوار ہوئے اور مدینہ طیبہ کے اندر بستی کی جانب اطمینان وسکون کے ساتھ روانہ ہوئے اور قبائلِ انصار پیدل اور سوار سب کے سب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رکاب کرامت مآب میں مجتمع ہو کر

---

[۱] علامہ علی نقی نقوی، تاریخ اسلام ص ۱۴۳ بحوالہ طبرسی (متوفی ۵۴۳ء) اعلام الوریٰ

[۲] ابو جعفر محمد بن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ ہجری)، تاریخ طبری، ج ۲ ص ۲۵۲

[۳] کے اے حمید، مسلمانانِ عالم، ص ۷

چل دیے۔ اُس وقت بنی عمرو بن عوف کے لوگ جو اُس بستی کے رہنے والے تھے عذر خواہی کرتے ہوئے آئے اور عرض کرنے لگے کہ شاید دامانِ عزت وجلالِ سیّد المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو اس جگہ قیام پذیر ہونے میں کوئی رنج وملال لاحق ہُوا ہے جس کی وجہ سے انتقال وارتحال فرمایا جارہا ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ مجھے ''اکالۃ القریٰ'' کا حکم ہُوا ہے۔''اکالۃ القریٰ'' اور ''اکالۃ البلدان'' مدینہ منوّرہ کے ناموں میں سے ہیں۔[1]

پہلی نمازِ جمعہ کا خطبہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے پہلی نمازِ جمعہ کے خطبے میں فرمایا،''تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں، میں اُسی کی حمد کرتا ہوں، اُسی سے مدد مانگتا ہوں، اُسی سے بخشش کا طلبگار اور ہدایت کا خواہاں ہوں، اُسی پر ایمان رکھتا ہوں اور اُس کی نافرمانی نہیں کرتا۔ میں دشمن ہوں اُس کا جو اللہ کی نافرمانی کرے اور گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، کوئی اُس کا شریک نہیں اور یہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) اُس کا بندہ اور اُس کا رسول ہے جسے اُس نے نور وہدایت اور وعظ و نصیحت کے ساتھ ایسے وقت پر بھیجا جب رسولوں کا سلسلہ موقوف تھا، علم کی کمی تھی، لوگ گمراہ ہو چکے تھے، قیامت قریب اور موت نزدیک تھی۔ جو اللہ اور اُس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کی اطاعت کرے وہ راہِ راست پر ہے اور جو اِن دونوں کی نافرمانی کرے وہ بہت گنہگار اور بھٹکا ہُوا ہے۔ میں تمھیں اللہ کے غضب سے بچنے کی نصیحت کرتا ہوں کیونکہ ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان کو آخرت کی تیاری پر آمادہ کرنا اور اللہ سے ڈرنے کی ہدایت کرنا ایک بہترین نصیحت ہے۔ پس اللہ سے ڈرو جس طرح اُس نے تمھیں اپنے غضب سے ڈرایا ہے، اس سے بڑھ کر کوئی نصیحت نہیں اور نہ ہی اس سے بہتر کوئی یاد رکھنے کی بات ہے۔ اپنے پروردگار سے ڈرنا اور پرہیزگاری کے ساتھ اُس کے احکام پر عمل کرنا آخرت کے لیے بہت مددگار ہے، جو اللہ کے

---

[1] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۴۹

ساتھ اپنے ظاہری اور باطنی روابط کو درست رکھے اور سوائے رضائے الٰہی کے کوئی اور مقصد نہ رکھے اُس کے لیے دُنیا میں نیک نامی اور آخرت میں نجات ہوگی۔ آخرت میں انسان اپنے اعمال کا محتاج ہوگا جن کے سوا اُس وقت کوئی اور زادِ راہ نہیں ہوگا اور انسان تمنا کرے گا کہ کاش اُسے کچھ اور مہلت مل جاتی مگر اُس وقت تو اُس کے نیک اعمال ہی اُس کے کام آئیں گے۔ اللہ تمھیں اپنی ذات سے ڈراتا ہے، وہ اپنے بندوں پر شفیق و مہربان ہے، اُس نے اپنی بات کو سچ کر دکھایا اور اپنے وعدے کو پورا کیا اور بے شک اُس کے خلافِ وعدہ کچھ ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ وہ خود فرماتا ہے کہ میرے ہاں بات بدلتی نہیں اور میں بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہوں۔ پس اللہ سے ڈرتے رہو، دُنیا و آخرت میں اور ظاہر و باطن میں، اس لیے کہ جو اللہ سے ڈرتا ہے اُس کی غلطیوں سے وہ درگذر فرماتا ہے اور اُس کے اجر و ثواب میں اضافہ کرتا ہے۔ بے شک اللہ سے ڈرنے والے ہی کامیاب ہیں اور اللہ سے ڈرنا یقیناً اُس کی ناراضی، اُس کے غضب اور اُس کی سزا سے امان دیتا ہے۔ اللہ سے ڈرا کرو کیونکہ خوفِ الٰہی چہروں کو پُرنور بناتا ہے اور درجات کو بلند کرتا ہے۔ اللہ کے بارے میں کوتاہی سے کام نہ لیا کرو کیونکہ اُس نے تمھیں اپنی کتاب کا علم دے کر تمھارے لیے واضح راہیں متعین کر دی ہیں۔ وہ جانتا ہے کہ تم میں کون سچے اور کون جھوٹے ہیں۔ پس حُسنِ سلوک سے کام لیا کرو جس طرح کہ اللہ نے تمھارے ساتھ حُسن سلوک سے کام لیا ہے۔ اُس کے دشمنوں کو دشمن رکھو اور اُس کی راہ میں کوشش کرو جس طرح کوشش کرنے کا حق ہے۔ اُس نے تمھیں منتخب کیا اور تمھارا نام ''مسلم'' رکھا تاکہ ہلاک ہونے والا بھی روشن دلیل پر ہلاک ہو اور زندگی پانے والا بھی روشن دلیل پر زندگی پائے اور سب نیکیاں اللہ ہی کی مدد سے ہیں۔ لوگو! کوئی قوّت نہیں سوائے اللہ کے سہارے کے پس اللہ کو خوب یاد کیا کرو اور آئندہ زندگی کے لیے عمل کرو کیونکہ جو شخص اپنے اور اللہ کے درمیان معاملے کو درست کر لیتا ہے اللہ اُس کے اور دوسرے لوگوں کے درمیان معاملات کو خود ہی ٹھیک فرما دیتا ہے۔ اللہ لوگوں پر اپنا حکم نافذ کرنے

والا ہے اور اُس پر کسی کا حکم نہیں چل سکتا، وہ لوگوں کا مالک ہے لوگ اُس کے مالک نہیں۔ اللہ سب سے بڑا ہے اور نہیں کوئی قوّت مگر اللہ کے سوا جو بزرگ ہے۔''[۱]

نمازِ جمعہ کا باقاعدہ آغاز

روایت ہے کہ انصار نے حضور ﷺ کی خدمت میں عرض کیا کہ یہودی بروزِ شنبہ (ہفتہ) اکٹھے ہوتے ہیں اور عیسائی بروزِ یکشنبہ (اتوار)، ہمارے لیے بھی ایسا کوئی دن مقرر ہونا چاہیے جس میں ہم عبادت کے لیے جمع ہوں اور خدا کا شُکر ادا کریں۔ چنانچہ، حضور ﷺ نے مسلمانوں کے لیے جمعے کا دن مقرر فرمایا جسے اُس زمانے میں ''عروبہ'' کہا جاتا تھا۔ اُس دن مسلمان حضرت سعد بن زرارہؓ کے ہاں جمع ہوتے، نماز پڑھتے اور وعظ و نصیحت کرتے۔ چونکہ اُس روز لوگ ''جمع'' ہُوا کرتے تھے چنانچہ اُس کا نام ''جُمعَة'' ہُوا، آیتِ جمعہ اس کے بعد نازل ہوئی۔[۲]

مدینہ منوّرہ

مدینہ کے لوگ تین سال پہلے ایمان لا کر اپنی وفاداریاں حضور ﷺ کے نام کر چکے تھے۔ وہ بے چینی کے ساتھ آپ ﷺ کی تشریف آوری کے منتظر تھے پس جب اُنھیں معلوم ہُوا کہ اُن کی دُعائیں رنگ لے آئی ہیں، جناب رحمۃً للعالمین ﷺ اُن سے چند میل کے فاصلے پر ہیں اور بہت جلد اُن کے شہر کو منوّر فرمانے والے ہیں تو اُن کا جوش و خروش اوجِ ثریا تک پہنچ گیا۔ سبھی پیرو جواں گھروں سے باہر نکل کر چشم براہ ہوگئے، بچّے اور خواتین بے تابانہ چھتوں پر چڑھ کر آپ ﷺ کی راہ دیکھنے لگے۔ ہر آنکھ میں تمنا کے چراغ روشن تھے اور جوشِ انبساط

---

[۱] ابو جعفر محمد بن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ ہجری)، تاریخ طبری ج ۲ ص ۲۵۵۔ بخاری، باب الہجرۃ
قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری، کتاب: رَحمةً لّلعالمین ﷺ، ج ۱ ص ۱۱۵

[۲] تفسیر مجمع البیان۔ علامہ محمد باقر مجلسی (متوفی ۱۶۹۸ء)، حیاتُ القلوب، ج ۲ ص ۵۲۲

سے ہر چہرہ گلنار تھا۔ پھر ماہِ رسالت طلوع ہُوا اور اظہارِ مسّرت و شادمانی پر کسی کو ضبط و اختیار نہ رہا، مدینہ کی فضائیں فلک شگاف نعروں اور روح پرور نعتیہ اور استقبالیہ شعروں سے گونجنے لگیں:

طَلَعَ الْبَدْرُ عَلَیْنَا

(ہم پر چودھویں رات کا چاند طلوع ہُوا)

مِنْ ثَنِیَّاتِ الْوَدَاعِ

(کوہِ وداع کی گھاٹیوں سے)

وَجَبَ الشُّکْرُ عَلَیْنَا

(ہم پر شکر واجب ہُوا)

مَا دَعیٰ لِلّٰہِ دَاعٍ

(جب تک دُعا مانگنے والے دُعا مانگیں)

أَیُّهَا الْمَبْعُوثُ فِیْنَا

(اے ہم میں نبی بن کر مبعوث ہونے والے!)

جِئْتَ بِالْأَمْرِ الْمُطَاعِ

(آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم کی اطاعت ہم پر واجب ہے)

جِئْتَ شَرَّفْتَ الْمَدِیْنَةَ

(اے شہر کو شرافت و بزرگی بخشنے کے لیے تشریف لانے والے!)

مَرْحَبًا یَا خَیْرَ دَاعٍ

(اے بھلائی کی طرف بلانے والے! خوش آمدید)[۱]

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے ناقے پر سوار مدینہ طیبہ میں داخل ہوئے تو حضرت علی علیہ السلام بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہمرکاب تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جس طرف سے گذرتے انصار والہانہ

[۱] ڈاکٹر نصیر احمد، کتاب: پیغمبر اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ص ۳۸۲۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۹۳۔ علامہ سید جعفر مرتضیٰ عاملی، الصحیح من سیرة النبی اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ج ۲ ص ۳۶۵

استقبال کرتے اور التجا کرتے کہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! ہمارے ہاں قیام فرمائیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تمام لوگوں کے ہاں تو نہیں ٹھہر سکتے تھے اور کسی کو انکار کر کے اُس کی دِل آزاری بھی نہیں کرنا چاہتے تھے اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سب کو دُعائے خیر سے نوازتے ہوئے اپنی سواری کی مہار چھوڑ دی اور فرمایا کہ میرے ناقے کی راہ چھوڑ دو، یہ اللہ کی طرف سے مامور ہے وہ جس طرف چاہے گا یہ مجھے اُسی طرف لے جائے گا۔ اُونٹ اُس مقام پر بیٹھ گیا جہاں پر اب مسجد نبوی ہے۔ وہ جگہ اُس وقت قبیلہ خزرج کے دو یتیموں، اسہل اور سہیل کی ملکیت تھی جن کی کفالت حضرت اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ کیا کرتے تھے۔ ناقہ اُٹھ کر پھر چل پڑا، کچھ دُور گیا، پیچھے مڑا اور حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے گھر کے سامنے بیٹھ گیا۔ حضرت ابوایوب رضی اللہ عنہ نے اور بروایتے اُن کی والدہ نے لپک کر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سامان اُٹھایا اور اپنے گھر لے گئیں۔ اہلِ سیر لکھتے ہیں کہ لوگ پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں درخواست گذار ہوئے، ہر ایک کی آرزو یہ تھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اُس کے گھر فروکش ہوں چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دریافت فرمایا کہ میرا سامان کہاں ہے؟ کسی نے کہا کہ وہ تو ابوایوبؓ کی والدہ لے گئیں ہیں۔ فرمایا، ''کسی کو وہیں ہونا چاہیے جہاں اُس کا سامان ہو۔'' پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ناقے سے نیچے تشریف لائے اور حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے گھر کو اپنے قیام سے منوّر فرمایا۔ [1] ابنِ شہر آشوب نے جناب سلمان رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ناقہ ابوایوب رضی اللہ عنہ کے دروازے پر ٹھہرا تو ابوایوب رضی اللہ عنہ نے اپنی والدہ کو پکارا، کہا مادرِ گرامی! دروازہ کھولو کہ سیّد البشر، سب سے بلند مرتبہ رسول، جناب محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے ہیں۔ اُن کی ماں نابینا تھیں، دروازہ کھولا اور بولیں کہ اے کاش میری آنکھیں ہوتیں تو میں اپنے مولا کی زیارت کرتی۔ یہ سُن کر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُن کے چہرے پر اپنا دستِ مبارک پھیرا تو وہ اُسی وقت بینا ہو گئیں۔ [2]

---

[1] محمد ابن سعد (متوفی ۲۳۰ ہجری)، طبقات ابن سعد، ج ۱ ص ۱۶۰۔ علامہ علی نقی نقوی، تاریخ اسلام، ص ۱۴۰

[2] محمد ابن سعد (متوفی ۲۳۰ ہجری)، طبقات ابن سعد، ج ۱ ص ۱۶۰۔ علامہ علی نقی نقوی، تاریخ اسلام، ص ۱۴۰

مسجدِ نبوی کی تعمیر

(ربیع الاوّل ۱ ہجری/ اکتوبر ۶۲۲ء)

مدینہ منوّرہ میں مقیم ہوتے ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسہل اور سہیل کو بلایا اور وہ زمین خریدنے کی خواہش ظاہر کی جہاں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آمد کے موقع پر ناقہ پہلی مرتبہ بیٹھا تھا۔ دونوں بھائی آمادہ ہو گئے چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وہ زمین خرید لی اور وہاں مسجد بنانے کا حکم دیا۔

بقولے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ یہ زمین میرے لیے اس کے مالکوں سے خرید لو۔ اُنھوں نے اسہل اور سہیل سے بات چیت کرنے کے بعد کہا کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں یہ زمین نذر کرنا چاہتے ہیں، قیمت کی ضرورت نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بلا معاوضہ زمین لینے سے انکار کر دیا اور دس دینار اُس کے عوض ادا فرمائے۔[1] بروایتے اُس زمین کی قیمت حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ نے ادا کی تھی۔[2]

ابوجعفر محمد بن جریر طبری کا بیان ہے کہ زمین کے مالک دونوں یتیم بھائی معاذ بن عفراء کے زیرِ سایہ پرورش پا رہے تھے اور وہ زمین معاذ بن عفراء ہی کے ذریعے حاصل ہوئی۔ آگے چل کر وہ لکھتے ہیں کہ میرے نزدیک زیادہ صحیح روایت یہ ہے کہ وہ زمین بنی نجار کی تھی۔[3]

المختصر، یہاں مسجدِ نبوی کی بنیاد رکھی گئی۔ مسجدِ قبا کی طرح اس مسجد کی تعمیر میں بھی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بنفسِ نفیس شرکت فرمائی اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ مل کر برابر کام کیا۔ صحابہؓ عرض کرتے کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! ہمارے ماں باپ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر قربان، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تکلیف نہ کریں، اس کارِ خیر کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جاں نثار جو موجود ہیں۔ لیکن حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے جاں نثاروں

---

[1] ابوجعفر محمد بن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ھ)، طبری، ج ۲ ص ۲۵۶

[2] علامہ نجم الحسن کراروی (متوفی ۱۹۸۲ء)، چودہ ستارے، ص ۶۴

[3] ابوجعفر محمد بن جریر طبری، تاریخ طبری، ج ۲ ص ۲۵۲۔ علامہ علی نقی نقوی، تاریخ اسلام، ص ۱۴۴

کے شانہ بشانہ محنت ومشقت کر کے مِل جُل کر کام کرنے کا عملی درس دیتے رہے۔

علامہ طبرسی نے یہ کیفیت ذرا تفصیل سے لکھی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر خانہ کعبہ کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ اُس کے معمار اور مزدور حضرت ابراہیم خلیل اللہ (علیہ السلام) اور اُن کے فرزند حضرت اسماعیل (علیہ السلام) تھے تو مسجد نبوی کا یہ شرف بے مثال ہے کہ اس کی تعمیر میں فخرِ خلیل افضل المرسلین حبیبِ رب العالمین یعنی حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دوسرے مسلمانوں کے ساتھ معمار اور مزدور دونوں کی حیثیت سے کام کیا اور شروع سے لے کر آخر تک تعمیر کی جتنی منازل تھیں سب میں بنفس نفیس شرکت فرمائی۔[1]

علامہ طبرسی مزید لکھتے ہیں کہ قریب کی پہاڑی سے پتھر لائے جاتے تھے جنھیں مسلمان کئی دن تک منتقل کرتے رہے۔ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی دیکھا گیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک بڑا پتھر اپنی پشتِ اقدس پر رکھے ہوئے لا رہے ہیں۔ حضرت اسید بن حضیر نے بڑھ کر عرض کیا کہ یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! یہ پتھر مجھے دے دیں میں آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی طرف سے اسے پہنچا دیتا ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ یہ نہیں ہوسکتا کہ میں تن آسانی پسند کروں اور کوئی دوسرا میری طرف سے مشقت اُٹھائے۔

حافظ ابن جریر کی تصریح بھی ہے کہ اپنی مسجد کی تعمیر کا کام آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود کیا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مہاجرین اور انصار اصحاب (رضی اللہ عنہم) نے دیا۔[2]

اینٹیں اور پتھر اُٹھانے سے مٹی کے نصیب جاگ اُٹھتے اور وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بدنِ اطہر سے لپٹ جاتی۔ روایت ہے کہ باقی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ایک ایک اینٹ لاتے تو حضرت عمار یاسر رضی اللہ عنہ دو دو اُٹھا کر لاتے اور کہتے کہ ایک اینٹ میری طرف سے اور ایک حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانب سے ہے۔ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ دوسروں کو ایک اجر ہے اور عمار کو دوگنا ہے۔

---

[1] علامہ علی نقی نقوی، تاریخ اسلام، ص ۱۴۵ بحوالہ طبرسی

[2] علامہ علی نقی نقوی، تاریخ اسلام، ص ۱۴۵ بحوالہ طبری، ج ۲ ص ۲۵۶

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عمار یاسر رضی اللہ عنہ کو بشارت دی کہ آخری عمر میں تمھاری غذا دُودھ ہوگی اور تمھیں باغی لوگ شہید کریں گے، تم اُن باغیوں کو جنّت کی طرف بلاؤ گے اور وہ تمھیں دوزخ کی طرف۔[۱]

یہ مسجد کمال سادگی سے تیار کی گئی، اس کی دیواریں خام اینٹوں سے بنائی گئیں جو تین گز اُونچی تھیں۔ نوفٹ پر کھجور کے پتوں سے چھت اور اس کے تنوں سے ستون بنائے گئے۔[۲] علامی طبرسی کے مطابق چاروں طرف پتھروں کے کئی ردے رکھنے کے بعد اینٹوں سے چنائی شروع ہوئی اور قدآدم تک دیوار بنائی گئی۔ عمارت کی وسعت سو مربع ہاتھ تھی۔ شروع میں چھت نہیں بنائی گئی تھی۔ کچھ عرصہ بعد جب لوگوں نے دھوپ سے تکلیف محسوس کی اور سائے کے لیے استدعا کی تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسجد کے اگلے حصّے میں صحن سے متصل لکڑی کے ستون لگوا کر کھجور کی چھال سے ایک چھپر سا بنوا دیا۔ تھوڑے دنوں بعد جب لوگوں نے کہا کہ باقاعدہ چھت بنوا دیجئے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انکار کر دیا اور یہ تاریخی جملہ ارشاد فرمایا، ''لاعریش کعریش موسیٰ''، یعنی میں چاہتا ہوں کہ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام والے چھپر کی طرح چھپر ہی رہے۔[۳]

مسجد کی لمبائی قبلہ سے شمال تک چوّن گز اور مشرق سے مغرب تک ساٹھ گز تھی۔ فتح خیبر کے بعد اس کی تعمیرِ نو کی گئی اور لمبائی چوڑائی دونوں طرف سے سو سو گز کر دی گئی۔[۴] مسجد کے ایک کونے میں ایک مسقّف چبوترہ ''صُفّہ'' تیار کیا گیا جس نے کھلی اقامتی درسگاہ کا کام دینا تھا، اس درسگاہ کے ہمہ وقتی طالب علموں کو ''اصحابِ صفّہ'' کہا جاتا ہے۔[۵]

---

[۱] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۱۰۰

[۲] کے اے حمید، مسلمانانِ عالم ج ۱ ص ۶۹

[۳] علامہ علی نقی نقوی، تاریخ اسلام ص ۱۴۶ بحوالہ اعلام الوریٰ

[۴] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۱۰۱

[۵] ڈاکٹر نصیر احمد ناصر، کتاب: پیغمبر اعظم وآخر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ص ۴۳۵

''المواھبُ اللدنیۃ'' میں ہے کہ مسجد نبوی میں ایک سایہ دار جگہ تھی جہاں وہ صحابہ رہتے تھے جن کا کوئی گھر بار نہیں تھا۔ اس جگہ کو ''صفّہ'' اور وہاں رہنے والوں کو اصحابِ صفّہ کہا جاتا تھا۔ حضور اکرم ﷺ رات کو اُنھیں اپنے پاس بلاتے اور ضیافت و خاطر داری کے لیے خوشحال و تونگر اصحاب کے سپرد کرتے جنھیں ''اضیاف اللہ'' کہا جاتا تھا۔[1]

مسجد نبوی کی تعمیر دراصل اُس وقت کی ایک اہم ترین ضرورت تھی۔ ایک نئے دِین اور اُس کے ماننے والوں کے لیے ایک ایسے مرکزی مقام کی اشد ضرورت تھی جہاں پر وہ مکمل اطمینان سے بطریقِ احسن عبادت کر سکیں، دینی تعلیمات سے فیضیاب ہوسکیں اور اپنے ذاتی، اجتماعی، سماجی، دینی اور سیاسی معاملات پر مشاورت اور راہنمائی حاصل کرسکیں۔ آنحضرت ﷺ اللہ کے نبی، ایک کامل انسان، علم کا شہر، معلمِ انسانیت، عظیم ترین دانشور اور نہایت مدبر راہنما تھے۔ آپ ﷺ کا ہر قول و فعل انسانیت کے لیے علم و حکمت کا خزینہ ہے۔ آپ ﷺ نے آغازِ بعثت سے ہی قوم کی تعلیم و تربیت کا سلسلہ شروع کردیا تھا لیکن جونہی مدینہ منوّرہ میں آزاد اور زرخیز ماحول میّسر آیا تو اس عمل کو مستقل اور پائیدار بنیادوں پر قائم کرنے کی طرف متوجہ ہوئے۔ مسجد نبوی کا قیام اسی مقصد کا سنگِ بنیاد تھا۔ ایک چھوٹی سی نئی مملکت کے قائم ہوتے ہی مسجد بنانے کا حکم ایک ایسا شاندار فیصلہ تھا جس نے نومولود اسلامی ریاست کی تاریخ میں سنہرے باب رقم کردیے اور جس کے ثمرات سے مسلم اُمہ آج تک فیضیاب ہو رہی ہے۔

روایت ہے کہ مسجد کی تعمیر کے بعد مسجد کے گرد کچھ مکانات تعمیر کیے گئے جو حضور ﷺ، اہل بیت اطہار علیہم السلام اور مہاجرین کے لیے تھے۔ سب گھروں کے دروازے مسجد کی طرف تھے، یہ دروازے مسجد کے صحن میں کھلتے تھے اس لیے لوگ اپنے گھروں سے نکل کر سیدھے مسجد میں آنے لگے۔ تب جبرائیل علیہ السلام فرمانِ الٰہی لے کر نازل ہوئے کہ جن لوگوں نے مسجد میں دروازے قائم کیے ہیں اُن کو حکم دیجئے کہ وہ اُنھیں بند کردیں، کسی کا دروازہ مسجد

---

[1] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۷۲

میں نہ ہو سوائے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور علی مرتضیٰ (علیہ السلام) کے کیونکہ علی (علیہ السلام) کے لیے وہ حلال ہے جو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے لیے حلال ہے۔ صحابہ کرامؓ اس حکم پر کبیدہ خاطر ہو گئے۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا دروازہ بھی مسجد میں کھلتا تھا، وہ بھی افسردہ ہوئے کہ میرے بھتیجے علی (علیہ السلام) کا دروازہ تو اپنی جگہ قائم ہے مگر میرا بند کیا جا رہا ہے۔ اِس پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ چچا جان! آپ رنجیدہ نہ ہوں، میں نے یہ اپنی طرف سے نہیں کہا بلکہ یہ اللہ کا حکم ہے۔ یہ سُن کر جناب حمزہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں خدا اور رسولِ خدا (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے لیے اس پر راضی ہوں۔ چنانچہ مسجد میں کھلنے والے تمام دروازے بند کر دیے گئے سوائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے دروازوں کے۔ [۱]

نماز کی رکعتوں کا تعیّن

(۱ہجری/ ۶۲۲ء)

نماز کی رکعتوں کا تعیّن ہجرت کے پہلے سال میں کیا گیا۔ قبل ازیں مغرب کے سوا سب نمازیں دو رکعتی تھیں یعنی جملہ گیارہ رکعتیں، پھر ملا کر سترہ رکعتیں کر دی گئیں اور ان کے اوقات بھی مقرر کیے گئے۔ [۲] شیخ عبدالحق بحوالہ مواہبُ اللدنیہ لکھتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مدینہ منوّرہ میں رونق افروز ہوئے جب دو ماہ گذر گئے اور بعض روایتوں کے مطابق ایک سال گذرا تو اقامت کی نمازوں میں (رکعتوں کا) اضافہ کر دیا گیا۔ اس سے پہلے مغرب کی تین رکعت کے سوا تمام نمازیں دو دو رکعت تھیں پھر نمازِ ظہر، عصر اور عشاء میں دو دو رکعت کا اضافہ ہو گیا، نمازِ فجر کی دو رکعتیں بدستور برقرار رہیں اور نمازِ مغرب کو بھی اُسی طرح برقرار رکھا گیا۔ [۳]

---

[۱] علامہ محمد باقر مجلسی (متوفی ۱۶۹۸ء)، حیاتُ القلوب، ج ۲ ص ۵۲۲

[۲] علامہ نجم الحسن کراروی، چودہ ستارے، ص ۶۴

[۳] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ص ۱۰۴

بخاری میں حضرت عائشہؓ سے مروی ہے، ''دو دو رکعت نماز فرض کی گئی پھر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ منوّرہ ہجرت فرمائی تو دو اور چار رکعت فرض کی گئیں اور سفر کی نماز کو پہلے فریضہ پر برقرار رکھا گیا۔'' یہ حدیث نمازِ قصر کے وجوب میں احناف کی دلیل و حُجّت ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ چار رکعت فرض تھی جسے بعد میں مسافر کے لیے دو رکعت کر دیا گیا۔ ایک اور حدیث مبارکہ ہے، ''بے شک اللہ نے اپنی نماز کو مسافر پر آدھی فرض فرمایا۔'' بعض علما فرماتے ہیں کہ حضر میں نمازیں چار رکعت شروع ہوئیں اور سفر میں دو رکعتیں۔ اِسے مسلم وغیرہ نے روایت کیا ہے غرضیکہ مذہبِ حنفی میں قصر کا وجوب ہے اور مذہبِ شافعی میں رخصت و اجازت ہے، اگر چار رکعت پڑھے تو عزیمت ہے اور احناف کے نزدیک رخصت کا اطلاق مجازاً ہے۔[۱]

مذہبِ امامیہ میں روزانہ کی واجب نمازوں کی رکعتیں اس طرح ہیں: فجر دو رکعت، ظہر اور عصر ہر ایک چار رکعت، مغرب تین رکعت، عشاء چار رکعت اور ضروری ہے کہ اگر انسان سفر میں ہو (شرائطِ سفر کے ساتھ) تو چار رکعتی نمازیں دو رکعت پڑھے۔[۲]

علامہ طبری جو صرف مؤرّخ ہی نہیں بلکہ اہلِ سنت میں ایک امام، فقیہہ اور حافظِ احادیث کی حیثیت بھی رکھتے ہیں، لکھتے ہیں کہ ابتدائے بعثتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اب تک ہر نماز دو رکعت کی تھی، ہجرت کے ایک ماہ بعد ماہِ ربیع الثانی میں اس نماز میں جو بحالت حضر ہو، ظہر و عصر اور عشا میں دو رکعتوں کا اضافہ ہو گیا۔[۳] چنانچہ یہ بات سمجھ سے بالاتر ہے کہ حالتِ حضر میں دو رکعت سے چار کر دی گئیں تو حالتِ سفر میں بھی بعض کے ہاں چار رکعت کیوں؟

---

[۱] ڈاکٹر نصیر احمد ناصر، کتاب: پیغمبر اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ص ۵۳۶

[۲] آیت اللہ سید علی حسینی سیستانی، توضیح المسائل

[۳] علامہ علی نقی نقوی، تاریخ اسلام، ص ۱۵۷ بحوالہ ابوجعفر محمد بن جریر طبری، تاریخ طبری، ج ۲ ص ۲۵۸

اذان واقامت

(ربیع الاوّل ۱ ہجری/اکتوبر ۶۲۲ء)

مکّہ میں مسلمان اقلیت میں تھے اور اُنھیں عبادات کی آزادی بھی میسر نہیں تھی، بس چند مومنین تھے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ نمازِ جماعت میں شرکت کا شرف حاصل کرتے تھے۔ مدینہ طیّبہ میں شجرِ اسلام پر خوب بہار آچکی تھی، مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہوگیا تھا اور عبادت کے لیے مسجد بھی معرضِ وجود میں آگئی تھی۔ چنانچہ روزانہ کی نمازوں کے لیے لوگ مسجد آنے لگے تو ضرورت محسوس ہوئی کہ اوقاتِ نماز کے لیے کوئی طریقۂ اعلان مقرر ہونا چاہیے کہ لوگ مسجد میں حاضر ہوں اور پھر جماعت شروع ہونے سے قبل بھی کوئی اعلان ہونا چاہیے تاکہ لوگ جماعت میں شامل ہوں، پس اُسی سال سنہ ایک ہجری میں اذان کی تشریع ہوئی [1] اور بقولے اذان واقامت دونوں کی شروعات ہوئی۔ [2]

روایاتِ اہلِ سنت میں اذان کی تشریع کے مختلف اسباب درج کیے گئے ہیں لیکن روایاتِ ائمہ اہل بیت علیہم السلام سے اُن کی نفی ہوتی ہے۔ پس مذہبِ امامیہ کے نزدیک اتنے اہم شرعی حکم کا سبب کسی کا کوئی خواب ہوسکتا ہے نہ مشورہ بلکہ اس کا تعلق حکمِ الٰہی سے ہے جیسا کہ علامہ سیّد محسن امین عاملی نے تحریر فرمایا ہے،''طبقات ابن سعد اور سیرت ہشام میں ہے کہ اذان اور اقامت کے قرار دیے جانے کا سبب ایک خواب ہے جو بعض انصار نے دیکھا تھا۔ یہ غلط اور ناقابلِ توجہ ہے اس لیے کہ احکامِ شرعی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خوابوں کی بنا پر جاری نہیں فرماتے تھے۔ وہ تو وحی ہوتی تھی جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر آتی تھی اور ''سیرت حلبیہ'' میں محمد ابن حنفیہ کی زبانی اس کا سخت انکار بھی درج کیا گیا ہے۔'' [3] علامہ سیّد محسن امین عاملی کی تائید ڈاکٹر نصیر احمد

---

[1] علامہ محمد باقر مجلسی (متوفی ۱۶۹۸ء)، حیاتُ القلوب، ج ۲ ص ۵۲۳

[2] علامہ علی نقی نقوی، تاریخ اسلام، ص ۱۵۶

[3] سید محسن امین عاملی (متوفی ۱۹۵۳ء)، اعیان الشیعہ، ج ۲ ص ۱۲۳

ناصر سابق وائس چانسلر اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور کے بیان سے بھی ہوتی ہے جو لکھتے ہیں، ''صحابہ کرامؓ نے اس سلسلے میں متعدد تجاویز پیش کیں مثلاً ناقوس، دف، منادی وغیرہ کے ذریعے لوگوں کو مطلع کیا جائے لیکن آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے کسی تجویز کو پسند نہ فرمایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم یقیناً وحی کے منتظر ہوں گے اور اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو وحی کے ذریعے اذان کے مروّجہ طریقے اور الفاظ سے مطلع کیا۔''[۱]

چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو اذان کا حکم دیا اور اس طرح اُنھیں اسلام کا پہلا مؤذن بننے کا شرف حاصل ہُوا اور اسی شرف کی بنا پر اُن کو خلیفہ دوم حضرت عمرؓ کے دَور تک یا ''سیّدی'' کہہ کر مخاطب کیا جاتا تھا۔[۲]

ہمدردوں کی وفات

(۱ہجری/ ۶۲۲ء)

مدینہ طیّبہ میں سب سے پہلے جس ہمدرد کی وفات ہوئی وہ حضرت کلثوم بن ہدم رضی اللہ عنہ تھے جنھوں نے قبا میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی میزبانی کا شرفِ عظیم حاصل کیا تھا۔ اُن کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے لیے ہجرت کی راہیں ہموار کرنے والے اور اوس وخزرج کے درمیان دیرینہ دشمنی کے خاتمے کا سبب بننے والے حضرت ابوامامہ اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ بھی وفات پاگئے۔[۳]

حضرت اسعد بن زرارہ رضی اللہ عنہ نقبائے انصار میں سے تھے، اُنھوں نے عقبہ اولیٰ اور عقبہ ثانیہ دونوں میں شرکت کی اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے دستِ رحمت پر بیعت کی۔ وہ بنی ساعدہ کے سربراہ اور پہلے شخص تھے جنھوں نے مدینہ منوّرہ میں انصار کو جمع کرنے کی کوشش اور دینِ اسلام

---

[۱] ڈاکٹر نصیر احمد ناصر، کتاب: پیغمبر اعظم وآخر صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم، ص ۴۳۸

[۲] بخاری، باب بدأ الاذان ج ۱ ص ۱۵۷، محمد ابن سعد (متوفی ۲۳۰ ہجری)، طبقات ابن سعد، ج ۱ ص ۱۶۲

[۳] علامہ محمد باقر مجلسی (متوفی ۱۶۹۸ء)، حیاتُ القلوب، ج ۲ ص ۵۲۳

کی تائید وحمایت کی۔ اُنھوں نے کوئی گھر ایسا نہ چھوڑا تھا جہاں جا کر اسلام کی تبلیغ نہ کی ہو چنانچہ اُن کی کوششوں سے بہت سے انصار ایمان لائے۔ اُن کی وفات سنہ اوّل ہجری کے ششماہی کی ابتدا میں تعمیرِ مسجد کے دوران میں ہوئی اور وہ بقیع الغرقد میں مدفون ہوئے۔ حضرت عثمان بن مظعونؓ کی وفات بھی اسی سال ہوئی تھی، مہاجرین کہتے ہیں بقیع میں سب سے پہلے یہ مدفون ہوئے۔ [۱]

اسی سال حضرت براء بن معرور رضی اللہ عنہ نے بھی وفات پائی۔ یہ نقبائے انصار میں سے خزرجی اور اسلمی تھے اور اُن پہلے مسلمانوں میں سے تھے جنہوں نے اپنی قوم کے کہنے پر عقبہ ثانیہ کی رات بیعت کی تھی۔ بروایتے مدینہ میں وفات پانے والے پہلے شخص یہی تھے اور انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مدینہ طیبہ میں تشریف لانے سے ایک ماہ پہلے وفات پائی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب مدینہ تشریف لائے تو صحابہ کرامؓ کی ایک جماعت کے ساتھ ان کی قبر پر تشریف لے گئے، نماز پڑھی اور ان کے لیے دُعا فرمائی۔ [۲]

بنو نجار کے نئے قائد

(۱ہجری/ ۶۲۲ء)

مشہور مورّخ طبری لکھتے ہیں کہ ابوامامہ اسعد بن زرارہؓ کی وفات کے بعد بنو نجار ایک جماعت کی صورت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ ابوامامہ اسعد بن زرارہ ہمارے نقیب (قائد/سربراہ) تھے، اب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہم میں سے کسی کو (ہمارے قبیلے کا) قائد منتخب فرما دیجیے۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ تم میرے ننھیال ہو اس طرح میں بھی تم میں سے ہوں پس تم مجھے ہی اپنا قائد سمجھ لو۔ بنو نجار یہ سُن کر بہت خوش ہوئے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قیادت پر فخر کرنے لگے۔ [۳]

---

[۱] ابوجعفر محمد بن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ھ)، طبری، ج ۲ ص ۲۵۶

[۲] علامہ محمد باقر مجلسی (متوفی ۱۶۹۸ء)، حیاتُ القلوب، ج ۲ ص ۵۲۳

[۳] ابوجعفر محمد بن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ھ)، تاریخ طبری، ج ۲ ص ۱۵۰

مہاجرین کی آباد کاری

(۱ہجری/ ۶۲۲ء)

جب کوئی ملک تقسیم ہوتا ہے یا کسی علاقے میں کوئی آفت آتی ہے تو وہاں کے باشندے عموماً کسی دوسرے ملک کی طرف ہجرت کر جاتے ہیں۔ مہاجرین خود تو بدحال ہوتے ہی ہیں جس ملک میں جا کر پناہ گزین ہوتے ہیں اُس کی معیشت پر بوجھ بن کر اُسے بھی تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کرتے ہیں، اس طرح مہاجرین کے ساتھ ساتھ پناہ دینے والا ملک بھی مشکلات کا شکار ہو جاتا ہے۔

مکّہ کے مسلمان ہجرت کر کے بے سرو سامانی کے عالم میں مدینہ پہنچے تو اُن کی آباد کاری بھی ایک سنگین مسئلہ تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُس سنگین مسئلے کو اس خوش اسلوبی سے حل کیا کہ تاریخِ عالم میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بہترین حکمتِ عملی کی وجہ سے نہ صرف مہاجرین آباد ہوئے بلکہ مدینہ کی معیشت بھی مستحکم ہوگئی۔ تاریخِ عالم کا یہ عظیم ترین منصوبہ صرف تین مضبوط ستونوں پر قائم تھا، مواخات، زراعت اور تجارت۔

مواخات

(۱ہجری/ ۶۲۲ء)

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سنہ اوّل ہجری میں مہاجرین اور انصار کے درمیان مواخات یعنی بھائی چارے کا تعلق قائم فرمایا۔ خود غرضی اور خود پرستی کے اُس دَور میں جب انسان کی ہر سوچ کا محور اُس کی اپنی ذات ہُوا کرتی تھی اور اپنی خواہشات اور ضروریات کو پورا کرنے کے لیے وہ دوسروں کے حقوق کو غصب کرنے میں بھی کوئی عار محسوس نہیں کرتا تھا، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مواخات کے ذریعے تاریخ انسانی کا ایک درخشندہ باب رقم کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات نے معاشرے کی سوچ کو یکسر بدل کر رکھ دیا اور وہ لوگ جو کبھی دوسروں کا مال وزر اور عزت و آبرو چھیننے کے لیے

خون بہانے سے بھی دریغ نہیں کرتے تھے، دائرۂ اسلام میں داخل ہونے اور پھر رشتۂ مواخات سے منسلک ہونے کے بعد اپنا مال وزر بخوشی اپنے بھائی کے ساتھ تقسیم کرنے پر تیار ہو گئے۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہر مہاجر اور انصار کے درمیان مواخات قائم فرمائی چنانچہ یہ رشتہ قائم ہونے کے بعد ہر انصاری اپنے مہاجر بھائی کو اپنے گھر لے گیا اور اپنی منقولہ وغیر منقولہ جائداد کا نصف اُس کی ملکیت میں دے دیا اور دونوں سگے بھائیوں کی طرح مِل جُل کر رہنے لگے۔

روایات میں ملتا ہے کہ بعض انصار اپنی دو دو بیویوں میں سے ایک کو طلاق دے کر اپنے مہاجر بھائی کی زوجیّت میں دینے پر بھی تیار ہو گئے۔ صحیح بخاری میں مروی ہے کہ مہاجرین جب مدینہ آئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عبدالرحمٰن بن عوف اور سعد بن ربیع کے درمیان بھائی چارہ کرادیا۔ سعد نے عبدالرحمٰن سے کہا کہ میں انصار میں سب سے زیادہ مالدار ہوں، میرا آدھا مال تم لے لو اور میری دو بیویاں ہیں جن میں سے ایک کو میں طلاق دے دیتا ہوں، تم اُس سے نکاح کرلو، لیکن اُنھوں نے انکار کر دیا۔[۱]

روایت ہے کہ مواخات کا واقعہ ہجرت کے پانچ یا آٹھ ماہ کے بعد پیش آیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پچاس مہاجرین اور انصار میں باہمی مواخات قائم فرمائی۔ حضرت سلمانؓ کو حضرت ابودرداؓ کا بھائی بنایا، حضرت ابوذرؓ کو منذر بن عمیرؓ کا، حضرت عمار یاسرؓ کو حضرت حذیفہ یمانیؓ کا، حضرت مصعب بن عمیرؓ کو حضرت ابوایوب انصاریؓ کا، حضرت زبیر بن عوامؓ کو حضرت سلامہ بن وقشؓ کا، حضرت ابوعبیدہ جراحؓ کو حضرت سعد بن معاذؓ کا، حضرت عثمانؓ کو حضرت اوس بن ثابتؓ کا، حضرت عمرؓ کو حضرت عتبان بن مالکؓ کا اور حضرت ابوبکرؓ کو حضرت خارجہ بن زیدؓ کا لیکن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام اور اپنے لیے کسی انصاری کو منتخب نہیں فرمایا۔[۲]

---

[۱] مولانا شبلی نعمانی (متوفی ۱۹۱۴ء)، سیرت النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ج ۱ ص ۱۷۰۔ بخاری ج ۳ حدیث ۱۵۶

[۲] علامہ علی نقی نقوی، تاریخ اسلام، ص ۱۵۰

اس سے پہلے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم مکّہ میں بھی ایسا کر چکے تھے۔ بحوالہ تاریخ خمیس اور ریاض النصرہ، مکّہ میں حضرت ابوبکرؓ کو حضرت عمرؓ کا، طلحہ کو زبیر کا، حضرت عثمانؓ کو عبدالرحمٰن کا، حضرت حمزہؓ کو ابن حارثہ کا اور حضرت علی علیہ السلام کو خود اپنا بھائی بنایا تھا۔ علامہ شبلی کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اتحادِ مذاق، طبیعت اور فطرت کے لحاظ سے ایک دوسرے کو باہم بھائی بنایا تھا اور مذاقِ نبوّت کا اتحاد فطرتِ امامت ہی سے ہوسکتا تھا اِسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ہر مرتبہ اپنا بھائی حضرت علی علیہ السلام ہی کو منتخب فرمایا اور یہی وجہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم حضرت علی علیہ السلام سے فرمایا کرتے تھے، ''اَنْتَ اَخِیْ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ'' یعنی تم دُنیا اور اور آخرت (دونوں) میں میرے بھائی ہو۔[1]

''مدارجُ النبوّت'' میں ''روضۃُ الاحباب'' کے حوالے سے شیخ ابن حجر سے روایت ہے کہ جب عقدِ مواخات باندھا گیا تو حضرت علی المرتضیٰ علیہ السلام نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم! آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے صحابہ کے درمیان تو برادری کا رشتہ باندھ دیا مگر مجھے تنہا چھوڑ دیا؟ میرا بھائی کون ہے؟ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ تمھارا بھائی میں ہوں اور فرمایا، ''اَنْتَ اَخِیْ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ'' یعنی تم دُنیا اور آخرت (دونوں) میں میرے بھائی ہو۔[2]

امیرالمومنین علی علیہ السلام سے منقول ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے مہاجرین وانصار کے درمیان بھائی چارہ قرار دیا تو لوگ نسب اور رشتہ کے سبب سے نہیں بلکہ اپنے ایمانی بھائیوں کے رشتے کی وجہ سے ترکہ پاتے تھے لیکن جب اسلام کو تقویت ملی تو خدا نے آیتِ میراث نازل فرمائی اور وہ حکم منسوخ ہوگیا۔[3]

---

[1] علامہ نجم الحسن کراروی (متوفی ۱۹۸۲ء)، چودہ ستارے، ص ۶۴ بحوالہ علامہ شبلی، تاریخ خمیس و ریاض النصرہ

[2] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۱۰۴

[3] علامہ محمد باقر مجلسی (متوفی ۱۶۹۸ء)، حیاتُ القلوب، ج ۲ باب ۲۸ ص ۵۲۳

زراعت وتجارت

مدینہ ایک زرخیزاورسرسبزوشاداب علاقہ تھا، یہاں کی زمینیں سونا اُگلتی تھیں اس لیے لوگوں کا ذریعہ معاش زراعت تھا مگر سادہ لوح کاشتکار تجارتی باریکیوں اور ہوشیاریوں سے قطعی نابلد تھے۔ تجارت پر یہود کی اجارہ داری تھی اور چالاک یہودی نے اُنھیں قرض اور سود درسود کے جال میں بری طرح جکڑ رکھا تھا۔ وہ اُنھیں قرض دے کر نہایت کم قیمت پر فصل اپنے ہاتھ فروخت کرنے کا پابند بنالیتا اور پھر وہی اناج ضرورت پڑنے پر مہنگے داموں اُن ہی کو فروخت کرتا۔ یہود کا یہ جال مکڑی کے جالے کی طرح تھا جس میں اہلِ مدینہ بُری طرح پھنسے ہوئے تھے اور نجات کی کوئی صورت نظر نہیں آرہی تھی۔ دوسری طرف مکّہ ایک بے آب وگیاہ علاقہ تھا، وہاں زراعت کا کوئی تصور نہیں تھا، وہاں کے لوگ تجارت پیشہ تھے اور خرید وفروخت کے لیے ہر طرح کے لوگوں سے ملتے تھے۔ وہ تجارتی قافلوں کی صورت میں دُنیا بھر میں گھومتے تھے اس لیے تجارت کی باریکیوں سے بخوبی واقف تھے اور اس کا گہرا تجربہ رکھتے تھے۔ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم نہایت زیرک ودانا اور دُور اندیش انسان تھے۔ ایک طرف انصار کی یہود کے ہاتھوں بے بسی اور مہاجرین کی بے کسی و بدحالی سے آگاہ تھے تو دوسری طرف ان دونوں کی پیشہ ورانہ صلاحیتوں سے بھی بخوبی واقف تھے، پس عقدِ مواخات کے ذریعے ایسی حکمت عملی اختیار کی کہ دونوں جماعتوں کے اشتراک سے دونوں کے معاشی حالات میں بھی استحکام پیدا ہوگیا اور مہاجرین کی آبادکاری کا ایک پیچیدہ مسئلہ بھی نہایت خوش اسلوبی سے حل ہوگیا۔ انصار نے اپنے مہاجر بھائیوں کے ساتھ اپنے وسائل بانٹے تو مہاجرین نے اپنے انصار محسنوں کے مسائل بانٹ لیے۔ اُنھوں نے انصار کے ساتھ مل کر اپنی تجارتی صلاحیتوں کا اس خوبی کے ساتھ استعمال کیا کہ انصار کی خون پسینے سے پیدا کی ہوئی فصل یہود کے ہاتھوں کوڑیوں کے داموں بکنے سے محفوظ ہوگئی۔ عرب میں ایک نیا نظامِ تجارت رائج ہوگیا جو اسلام کے سنہری اُصولوں پر قائم تھا، ہر طرح کی چور بازاری، دھوکا دہی، ملاوٹ اور سود خوری سے پاک۔ جلد ہی اس کا چرچا عرب کے طول وعرض میں ہونے لگا اور لوگوں کے دِلوں میں اسلام کی حقانیت اور انفرادیت کے نقوش اُجاگر ہونے لگے۔

میثاقِ مدینہ

(دُنیا کا پہلا تحریری دستور)

(۱ہجری/ ۶۲۲ء)

مکّہ میں تحریکِ اسلام ایک نوخیز بیج کی طرح زیرِ زمین پنپ رہی تھی جسے صرف مکّہ کے قبیلہ قریش سے خطرہ لاحق تھا۔ مدینہ کی زمین زرخیز تھی جہاں یہ بیج پھوٹ کر ایک صحت مند پودے کی طرح کھلی آب و ہوا میں لہرانے لگا اور اس کی شاخیں اس تیزی سے پھلنے پھولنے لگیں کہ دیکھتے ہی دیکھتے یہ ایک تناور درخت بن گیا۔ اب شجرِ اسلام کو چاروں طرف سے اُٹھنے والی خوفناک آندھیوں اور طوفانوں سے خطرہ درپیش تھا۔ پہلا خطرہ مکّہ کے قبیلہ قریش اور اُن کے ساتھیوں سے بدستور تھا، دوسرا خطرہ یثرب کے بُت پرست و مشرک قبائل سے تھا جو قریش کی طرح اسلام کے سخت مخالف تھے۔ تیسرا خطرہ یہود اور گرد و نواح کی اُن غیر مسلم ریاستوں سے تھا جو اسلام کو اپنے لیے خطرہ سمجھ کر مستقبل قریب میں اس کی دُشمن ہو سکتی تھیں۔ چوتھا خطرہ اُن منافقین سے تھا جو بظاہر اسلام قبول کر چکے تھے لیکن اُن کے دِل کفر و باطل کی کثافتوں سے ابھی تک سیاہ تھے۔ سیاسی و عسکری نقطہ نگاہ سے دیکھا جائے تو یہ تمام خطرات ایک نومولود ریاست کو جسے ابھی تک کہیں تسلیم بھی نہیں کیا گیا تھا، ختم کرنے کے لیے کافی تھے۔ چنانچہ رسولِ خدا صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے یہود اور دیگر یثربی قبائل کے ساتھ ایک تاریخ ساز معاہدے کے ذریعے نہ صرف ان خطرات کا سدِباب کیا بلکہ تحریکِ اسلام کے لیے شاندار کامیابی کی راہیں بھی ہموار کرلیں۔ اس طرح تقریباً تمام حریف قوتیں مغلوب ہوگئیں اور اسلام اور اہلِ اسلام کو ایک یقینی تحفظ حاصل ہو گیا۔ اس معاہدے کے ساتھ ہی ایک باقاعدہ اسلامی مملکت بھی وجود میں آگئی جس کے سربراہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم تھے۔

یہ معاہدہ جسے میثاقِ مدینہ کہا جاتا ہے، رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی دُور اندیشی، سیاسی حکمت عملی، عسکری بصیرت اور بے مثال تدبر و دانائی کا ایسا زندہ و جاوید ثبوت ہے جس کے سامنے ماضی و حال کی تمام سیاسی و عسکری قوتیں سر تسلیم خم ہیں۔ یہ بے مثال آئین اُن لوگوں کو بھی دعوتِ فکر دیتا ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی نبوّت کے قائل نہیں یا آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو ایک ناخواندہ مردِ صحرائی سمجھتے ہیں۔ کیا کوئی غیر تعلیم یافتہ پردیسی مہاجر جہالت اور جاہلیت کے اُس دَور میں ایسا معاہدہ کر سکتا تھا جس کے ذریعے ایک نئی ریاست قائم ہو جاتی اور جسے اردگرد کے تمام اہم قبائل تسلیم بھی کر لیتے اور جس کی وجہ سے اُس نئی مملکت کی شان و شوکت اور قوّت و صولت کے پرچم تمام عالم پر لہرانے لگتے؟ یہ سوال اُن لوگوں کے لیے بھی یقیناً اہم اور دلچسپ ہوگا جو سیرتِ طیبہ کو جدید نظریات، سائنسی توجیہات اور تاریخی محرکات کی روشنی میں دیکھنے کے شوقین ہیں۔

میثاقِ مدینہ پہلا بین الاقوامی تحریری معاہدہ ہے۔ بعض مورخین میگنا کارٹا (Megna Carta) کو پہلا بین الاقوامی معاہدہ قرار دیتے ہیں حالانکہ میثاقِ مدینہ ۶۲۲ء میں ہُوا جب کہ میگنا کارٹا ۶۰۰ سالوں بعد ۱۲۱۵ء میں انگلستان کے شاہ جان اوّل کے زمانے میں ہُوا۔[۱]

آج ترقی یافتہ ممالک کے دساتیر میں امریکہ کے دستور کو مختصر ترین اور مثالی دستور قرار دیا جاتا ہے جو کہ سات ہزار الفاظ پر مبنی ہے جب کہ آج سے کئی سو سال قبل رسولِ معظم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا دیا گیا یہ دستور یعنی مثیاقِ مدینہ صرف سات سو تیس الفاظ پر مشتمل ہے اور امریکہ کے اس دستور سے کہیں زیادہ جامع، موثر اور مکمل ہے۔ اگر جدید دستوری و آئینی قواعد و ضوابط اور معیارات کی روشنی میں میثاقِ مدینہ کا تجزیہ کیا جائے تو اس میں وہ تمام خصوصیات نظر آتی ہیں جو ایک مثالی آئین میں ہونی چاہئیں۔

---

[۱] وکی پیڈیا انسائیکلو پیڈیا اُردو

میثاقِ مدینہ کا متن [1]

شروع اللہ کے نام سے جو نہایت مہربان اور رحم کرنے والا ہے۔

(۱) یہ اللہ کے نبی اور رسول محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی طرف سے دستوری تحریر (دستاویز) ہے۔

(۲) یہ معاہدہ اہلِ ایمان مسلمانان، قریش اور اہل یثرب اور اُن لوگوں کے درمیان ہے جو ان کے تابع ہوں اور ان کے ساتھ شامل ہوں اور ان کے ہمراہ جنگ میں حصّہ لیں۔ (یہ سب گروہ، ریاستِ مدینہ کے آئینی طبقات تصور کیے جائیں گے)۔

(۳) تمام (دُنیا کے دیگر) لوگوں کے مقابلے میں ان کی ایک الگ سیاسی وحدت (قومیت) ہوگی۔

(۴) قریش کے مہاجرین اپنے دستور کے مطابق اپنا خوں بہا ادا کیا کریں گے اور اپنے اسیروں کو خود فدیہ دے کر چھڑائیں گے اور مومنوں کا باہمی برتاؤ نیکی اور انصاف پر مبنی ہوگا۔

(۵) اور بنی عوف اپنے دستور کے مطابق حسبِ سابق اپنا خوں بہا ادا کیا کریں گے اور ہر گروہ اپنے قیدیوں کو خود فدیہ دے کر چھڑائے گا اور مومنین کا آپس میں برتاؤ نیکی اور انصاف پر مبنی ہوگا۔

(۶) اور بنو حارث بن خزرج اپنے دستور کے مطابق حسبِ سابق اپنا خوں بہا ادا کیا کریں گے اور ہر گروہ اپنے ہاں کے اسیروں کو خود فدیہ دے کر چھڑائے گا اور مومنوں کا باہمی برتاؤ بھلائی اور انصاف پر مبنی ہوگا۔

(۷) اور بنو ساعدہ اپنے دستور کے مطابق حسبِ سابق اپنا خوں بہا باہم مل کر دیا کریں گے اور ہر

---

[1] ڈاکٹر محمد طاہر القادری، میثاقِ مدینہ بحوالہ ابن خلدون (متوفی ۱۴۰۶ء)، تاریخ ابن خلدون ابن ہشام (متوفی ۸۳۳ء)، سیرۃ ابن ہشام، محمد حمید اللہ، عہد نبوی کا نظام حکمرانی، ج ا

گروہ اپنے قیدیوں کو خود فدیہ دے کر چھڑائے گا اور ایمان والوں کا باہمی برتاؤ نیکی اور عدل پر مبنی ہوگا۔

(۸) اور بنوجُشم اپنے محلے پر (ذمہ دار) ہوں گے اور حسبِ سابق اپنا خوں بہا باہم مل کر دیا کریں گے اور ہر گروہ اپنے ہاں کے قیدی کو خود فدیہ دے کر چھڑائے گا اور ایمان والوں کا آپس میں برتاؤ اچھائی اور انصاف پر مبنی ہوگا۔

(۹) اور بنونجار اپنے محلے پر (ذمہ دار) ہوں گے اور حسبِ سابق اپنا خوں بہا باہم مل کر دیا کریں گے اور ہر گروہ اپنے ہاں کے قیدی کو خود فدیہ دے کر چھڑائے گا اور مومنوں کا باہمی برتاؤ نیکی اور انصاف پر مبنی ہوگا۔

(۱۰) اور بنوعمرو بن عوف اپنے محلے پر (ذمہ دار) ہوں گے اور حسبِ سابق اپنا خوں بہا باہم مل کر دیا کریں گے اور ہر گروہ اپنے ہاں کے قیدی کو خود فدیہ دے کر چھڑائے گا اور اہلِ ایمان کا باہمی برتاؤ نیکی اور انصاف پر مبنی ہوگا۔

(۱۱) اور بنونبیت اپنے محلے پر (ذمہ دار) ہوں گے اور حسبِ دستور اپنا خوں بہا باہم مل کر دیا کریں گے اور ہر گروہ اپنے ہاں کے اسیروں کو خود فدیہ دے کر چھڑائے گا اور مومنین کا آپس میں برتاؤ نیکی اور انصاف پر مبنی ہوگا۔

(۱۲) اور بنواَوس اپنے محلے پر (ذمہ دار) ہوں گے اور اپنے دستور کے مطابق اپنا خوں بہا باہم مل کر ادا کریں گے اور ہر گروہ اپنے قیدیوں کو خود فدیہ دے کر چھڑائے گا اور مومنین کا باہمی برتاؤ عدل وانصاف اور بھلائی پر مبنی ہوگا۔

(۱۳) ہر گروہ اپنے اسیروں کا زرِفدیہ ادا کر کے اُنھیں رہائی دلائے گا اور اس ضمن میں مسلمانوں کے درمیان قانون وانصاف کے بلا امتیاز اطلاق کو یقینی بنائے گا۔

(۱۴) اور ایمان والے قرض کے بوجھ سے دبے ہوئے کسی شخص کی مدد کیے بغیر نہیں رہیں گے

تا کہ اُس کا زرِفدیہ یا دیت بخوبی ادا ہو سکے۔

(۱۵) اور کوئی مومن کسی دوسرے مومن کے عہد شریک سے اُس کی مرضی کے بغیر معاہدہ نہیں کرے گا۔

(۱۶) اور متقی مومنین کے ہاتھ اُن میں سے ہر اُس شخص کے خلاف اُٹھیں گے جو سرکشی کرے یا استحصال بالجبر کرنا چاہے یا گناہ یا تعدی کا ارتکاب کرے یا پُرامن شہریوں (مومنوں) میں فساد پھیلانا چاہے اور ایسے شخص کے خلاف سب مل کر اُٹھیں گے خواہ وہ اُن میں سے کسی کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو۔

(۱۷) اور کوئی مومن کسی مومن کو کسی کافر کے بدلے قتل نہیں کرے گا اور نہ کسی مومن کے خلاف کسی کافر کی مدد کرے گا۔

(۱۸) اور اللہ کا ذمہ ایک ہی ہے۔ ان (مسلمانوں) کا کوئی ادنیٰ ترین فرد بھی کسی شخص کو پناہ دے کر سب پر پابندی عائد کر سکے گا۔

(۱۹) اور مومن بقیہ لوگوں کے مقابلے میں آپس میں بھائی بھائی ہیں۔

(۲۰) اور یہودیوں میں سے جو ہماری اتباع کرے گا اُسے مدد اور مساوات حاصل ہوگی جب تک کہ وہ اہل ایمان پر ظلم کا مرتکب نہ ہو یا اُن کے خلاف (کسی مخالف کی) مدد نہ کرے۔

(۲۱) اور مومنوں کی صلح ایک ہی ہوگی۔ اللہ کی راہ میں لڑائی کے دوران میں کوئی مومن کسی دوسرے مومن کو چھوڑ کر (دشمن سے) صلح نہیں کرے گا جب تک کہ (یہ صلح) اُن سب کے لیے برابر نہ ہو۔

(۲۲) اور اُن تمام گروہوں کو جو ہمارے ہمراہ (دشمن سے) جنگ کریں باری باری رخصت دی جائے گی۔

(۲۳) اور مومنین راہِ خدا میں اپنی ہونے والی خونریزی کا انتقام دشمن سے مل کر لیں گے۔

(۲۴) اور بلاشبہ ایمان اور تقویٰ والے سب سے اچھے اور سیدھے راستے پر ہیں۔

(۲۵) اور (مدینہ کی غیر مسلم رعیت میں سے) کوئی مشرک قریش کی جان و مال کو نہ پناہ دے گا اور نہ ہی اُن کی خاطر کسی مومن کے آڑے آئے گا۔

(۲۶) اور جو شخص کسی مومن کو عمداً قتل کرے تو قتل ثابت ہونے پر اُس سے قصاص لیا جائے گا بجز اس کے کہ مقتول کا ولی خوں بہا پر راضی ہوجائے۔ اور تمام مومنین اس (قصاص) کی تعمیل کے لیے (متحد ہوکر) اُٹھیں گے اور اس کے سوا کوئی اور چیز اُن پر جائز نہ ہوگی۔

(۲۷) اور کسی ایسے مومن کے لیے جو اس دستور العمل (صحیفہ) کے مندرجات (کی تعمیل) کا اقرار کر چکا ہو اور خدا اور یومِ آخرت پر ایمان لا چکا ہو یہ بات جائز نہ ہوگی کہ کسی قاتل کو مدد یا پناہ دے اور جو اسے مدد یا پناہ دے گا تو قیامت کے دن اُس پر خدا کی لعنت اور غضب نازل ہوگا اور اُس سے کوئی رقم یا معاوضہ قبول نہیں کیا جائے گا۔

(۲۸) اور جب کبھی تم میں کسی چیز پر اختلاف ہو تو اُسے اللہ اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف لوٹایا جائے گا (کیونکہ آخری اور حتمی حکم (فیصلہ کرنے والا) اللہ اور اس کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی ہیں)۔

(۲۹) یہودی جب تک مومنین کے ساتھ مل کر جنگ کریں گے اپنے جنگی مصارف خود برداشت کریں گے۔

(۳۰) اور بنی عوف کے یہودی، مومنین کے ساتھ ایک سیاسی وحدت تسلیم کیے جاتے ہیں۔ یہودیوں کے لیے اُن کا دِین ہے اور مسلمانوں کے لیے اپنا دِین ہے خواہ اُن کے موالی ہوں یا وہ بذاتِ خود ہوں، ہاں جو ظلم یا عہد شکنی کا ارتکاب کرے تو اُس کی ذات یا گھرانے کے سوا کوئی دوسرا مصیبت میں مبتلا نہیں کیا جائے گا۔

(۳۱) اور بنی نجار کے یہودیوں کو بھی بنی عوف کے یہودیوں کے برابر حقوق حاصل ہوں گے۔

(۳۲) اور بنی حارث کے یہودیوں کو بھی بنی عوف کے یہودیوں کے برابر حقوق حاصل ہوں گے۔

(۳۳) اور بنی ساعدہ کے یہودیوں کو بھی بنی عوف کے یہودیوں کے برابر حقوق حاصل ہوں گے۔

(۳۴) اور بنی جُشم کے یہودیوں کو بھی بنی عوف کے یہودیوں کے برابر حقوق حاصل ہوں گے۔

(۳۵) اور بنی اَوس کے یہودیوں کو بھی بنی عوف کے یہودیوں کے برابر حقوق حاصل ہوں گے۔

(۳۶) اور بنی ثعلبہ کے یہودیوں کو بھی بنی عوف کے یہودیوں کے برابر حقوق حاصل ہوں گے مگر جو ظلم یا عہد شکنی کا ارتکاب کرے تو خود اُس کی ذات یا گھرانے کے سوا اور کوئی مصیبت میں نہیں پڑے گا۔

(۳۷) اور (قبیلہ) جفنہ کو بھی، جو (قبیلہ) ثعلبہ کی ایک شاخ ہے، وہی حقوق حاصل ہوں گے جو (قبیلہ) ثعلبہ کو حاصل ہیں۔

(۳۸) اور بنی شطیبہ کو بھی بنی عوف کے یہودیوں کے برابر حقوق حاصل ہوں گے، اور (اس دستور سے) وفا شعاری ہو نہ کہ عہد شکنی۔

(۳۹) اور ثعلبہ کے موالی کو بھی وہی حقوق حاصل ہوں گے جو اصل کو (حاصل ہوں گے)۔

(۴۰) اور یہودیوں کی ذیلی شاخوں کو بھی اصل کے برابر حقوق حاصل ہوں گے۔

(۴۱) اور یہ کہ ان میں سے کوئی بھی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اجازت کے بغیر (کارروائی کے لیے) نہیں نکلے گا۔

(۴۲) اور کسی مار پیٹ یا زخم کا بدلہ لینے میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں جائے گی۔

(۴۳) جو خونریزی کرے تو وہ خود اور اُس کا گھرانہ ذمہ دار ہوگا بجز اس کے کہ اُس پر ظلم ہُوا ہو اور خدا اُس کے ساتھ ہے جو اِس (دستور العمل) کی زیادہ سے زیادہ وفا شعارانہ تعمیل کرے۔

(۴۴) اور یہودیوں پر اُن کے مصارف کا بار ہوگا اور مسلمانوں پر اُن کے مصارف کا۔

(۴۵) اور جو کوئی اِس دستور والوں سے جنگ کرے تو یہ (یہودی اور مسلمان) اُس کے خلاف متحد ہو کر لڑیں گے۔

(۴۶) اور اِن میں (مسلمانوں اور یہودیوں میں) باہم مشاورت، بہی خواہی اور وفا شعاری

ہو گی نہ کہ عہد شکنی۔

(۴۷) کوئی جماعت اپنے کسی حلیف کی وجہ سے اِس معاہدے کی خلاف ورزی نہیں کرے گی اور ہر حال میں مظلوم کی دادرسی کی جائے گی۔

(۴۸) اور یہودی اُس وقت تک مومنین کے ساتھ (جنگی) اخراجات برداشت کرتے رہیں گے جب تک وہ مل کر جنگ کرتے رہیں گے۔

(۴۹) اور یثرب کا جوف (پہاڑوں میں گھرا ہُوا ایک خاص میدان) اس دستور والوں کے لیے حرم (دارالامن) ہوگا (یعنی وہاں آپس میں جنگ کرنا منع ہوگا)۔

(۵۰) پناہ گزین سے وہی برتاؤ ہوگا جو اصل (پناہ دہندہ) کے ساتھ، اُس کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا جائے گا اور نہ وہ خود ہی عہد شکنی کرے گا۔

(۵۱) اور کسی عورت کو اُس کے خاندان کی رضامندی سے ہی پناہ دی جائے گی۔

(۵۲) اور یہ کہ اِس دستور والوں میں جو بھی قتل یا جھگڑا ہو جس سے فساد کا اندیشہ ہو تو ایسی صورت میں خدا اور خدا کے رسول محمد صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم سے رجوع کیا جائے گا اور خدا اُس شخص کے ساتھ ہے جو اِس دستور کے مندرجات کی وفاداری سے تعمیل کرے۔

(۵۳) اور قریش اور اُن کے مددگاروں کو پناہ نہیں دی جائے گی۔

(۵۴) کسی بیرونی حملہ کی صورت میں ریاستِ مدینہ کا دفاع امدادِ باہمی کے تحت اِن (یہودیوں اور مسلمانوں) کی مشترکہ ذمہ داری ہوگی۔

(۵۵) اور اگر اِن (یہودیوں) کو کسی صلح میں مدعو کیا جائے تو وہ بھی صلح کریں گے اور اُس میں شریک رہیں گے اور اگر وہ کسی ایسے معاملے کے لیے بلائیں تو مومنین کا بھی فرض ہوگا کہ اِن کے ساتھ ایسا ہی کریں۔

(۵۶) اسی طرح مسلمانوں پر لازم ہے کہ اگر اُنھیں کسی امن معاہدے میں شرکت کی دعوت دی

جائے تو وہ اُس کی مکمل پابندی کریں بجزاِس کے کہ دین کے معاملے میں کوئی جنگ کرے۔

(۵۷) ہر گروہ کے حصّے میں اُسی رخ کی (مدافعت) آئے گی جو اُس کے بالمقابل ہو۔

(۵۸) اور اوس کے یہودیوں کو چاہے وہ موالی ہوں یا اصل، وہی حقوق حاصل ہوں گے جو اِس دستور والوں کو حاصل ہیں اور وہ بھی اِس دستور والوں کے ساتھ خالص وفا شعاری کا برتاؤ کریں گے۔

(۵۹) اور وفا شعاری ہوگی نہ کہ عہد شکنی۔ جو جیسا کرے گا ویسا ہی خود بھرے گا۔

(۶۰) اور خدا اُس کے ساتھ ہے جو اِس دستور کی خوب صداقت اور وفا شعاری کے ساتھ تعمیل کرے۔

(۶۱) اور یہ دستوری دستاویز کسی ظالم یا عہد شکن کو تحفظ فراہم نہیں کرے گی۔

(۶۲) اور جنگ پر جانے والا بھی امن کا مستحق ہوگا اور مدینے میں بیٹھ رہنے والا بھی امن کا مستحق ہوگا، سوائے ظالم اور قانون شکنی کرنے والے کے۔

(۶۳) اور جو اِس دستور کے ساتھ وفا شعار رہے اور نیکی وامن پر کاربند رہے، اللہ اور اُس کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اُس کے محافظ ونگہبان ہیں۔

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّاٰلِ مُحَمَّدٍ ○

میثاقِ مدینہ غیر مسلم دانشوروں کی نظر میں

غیر مسلم دانشوروں نے جب بھی اسلام یا تاجدارِ اسلام جناب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے متعلق کچھ لکھا تو اسلام دشمنی اور کم ظرفی کا مظاہرہ کیا اور جہاں تک ہو سکا حقائق سے روگردانی کرتے ہوئے تاریخ کو اپنے نظریے سے پیش کیا۔ لیکن سچ تو سچ ہوتا ہے، لاکھ چھپاتے ہوئے بھی عیاں ہو ہی جاتا ہے۔ چنانچہ اُن کی تحریروں میں حق اور سچائی کی یہ جھلک بھی کہیں نہ کہیں دیکھی جاسکتی ہے۔ غیر مسلم مفکرین کی مندرجہ ذیل تحریریں اُن کے نقطۂ نظر سے آگاہی کے لیے دی جارہی ہیں اور یہ ضروری نہیں کہ ہمیں اُن کی رائے سے مکمل اتفاق ہو۔

رینالڈ ایلین نکولسن

(Reynold Alleyne Nicholson,1868–1945)

رینالڈ ایلین نکولسن ایک برطانوی محقق، فلاسفر، مترجم، مدرس، مصنف اور مورّخ تھے۔ تاریخ اسلام پر ان کی دو کتابیں اے لٹریری ہسٹری آف دی عربز (A Literary History of The Arabs) اور دی مسٹکس آف اسلام (The Mystics of Islam) بہت مشہور ہیں۔ زیرِ نظر اقتباس کتاب ''اے لٹریری ہسٹری آف دی عربز'' سے لیا گیا ہے۔

''کوئی شخص بھی اِس دستاویز (میثاقِ مدینہ) کا مطالعہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کی سیاسی بصیرت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں کرسکتا۔ یہ دستاویز بدیہی طور پر ایک محتاط اور مبنی بر بصیرت اصلاح تھی اور حقیقتاً یہ ایک انقلاب تھا۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) نے ظاہراً تو قبیلوں کی آزادی کو متاثر نہیں کیا تھا مگر حقیقت میں آپ (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) نے طاقت کے محور کو قبیلے سے قوم کی طرف منتقل کر کے اُس کے اثر کو ختم کر دیا۔ اگرچہ قوم میں یہود، کفّار اور مسلمان شامل تھے جیسا کہ دستور میں

تسلیم کیا گیا، لیکن آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے مخالفین اس حقیقت کا ادراک نہ کر سکے کہ مسلمان فعال اور متحرک تھے اور بہت جلد نوتشکیل شدہ ریاست کے نمایاں اور غالب حکومتی حصّہ دار بننے والے تھے۔''[1]

جولیس ویل ہاسن

(Julius Wellhausen,1844-1918)

جولیس ویل ہاسن جرمنی کے نامور پروفیسر اور مفکر تھے۔ اپنی کتاب دی عرب کنگڈم اینڈ اٹس فال(The Arab Kingdom and Its Fall) میں رقم کرتے ہیں: ''مدینہ کی آبادی دو حریف قبیلوں، اَوس اور خزرج میں تقسیم ہو چکی تھی۔ قتلِ عام روزمرہ کا معمول تھا۔ کوئی شخص بھی خطرہ مول لیے بغیر اپنے گھر سے باہر نہ نکل سکتا تھا۔ وہاں افراتفری کا ایسا بازار گرم تھا کہ زندہ رہنا محال ہو گیا تھا۔ اب یہاں کسی ایسے مسیحا کی ضرورت تھی جو اس لاقانونیت کا خاتمہ کرتا۔ لیکن (ضرورت اِس امر کی تھی کہ) وہ شخص غیر جانبدار ہوتا اور کسی مقامی حریفانہ آویزش میں شامل نہ ہوتا۔ ایسے حالات میں مکّہ سے پیغمبرِ خدا (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تشریف آوری ہوئی گویا آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو خدا نے ہی (مدینہ) بھیجا تھا۔ خون کا رشتہ باہمی تعلقات کی بنیاد کے طور پر ناکام ہو چکا تھا، آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے عقیدے کو اس کی جگہ رکھا۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنے ساتھ مومنین کی ایک جماعت بھی لائے اور آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے رفتہ رفتہ مدینہ میں ایک دولتِ مشترکہ کی بنیاد رکھ دی جس کی اساس اُمۃ اللہ یعنی اللہ کا گروہ تھا۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے جو اُمور سرانجام دینے تھے اُن میں پہلا کام نفاذِ قانون اور قیامِ امن تھا، چونکہ (مدینہ میں) حکمران کوئی نہیں تھا چنانچہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے قیادت سنبھال لی، قوت اپنے ہاتھوں میں لے لی اور اپنی پوزیشن

---

[1] رینالڈ ایلین نکولسن (متوفی ۱۹۴۵ء)، اے لٹریری ہسٹری آف دی عربز، (A Literary History of The Arabs)، طبع کیمبرج یونیورسٹی پریس، ۱۹۵۳ء

کو ایسے اقدامات سے مضبوط کر لیا جو اُن حالات میں متوقع تھے۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اُن معاملات کو نبھانے میں بے مثال بصیرت و حکمت کا مظاہرہ کیا۔

ایسے حالات میں مذہب کی طاقت ایک سیاسی قوت بن گئی جس سے ایک معاشرہ اور اس سے بھی بڑھ کر ایک ایسی مقتدر قوت سامنے آئی جس کی اطاعت کی جاتی تھی۔ ریاست کا حاکمِ اعلیٰ ذاتِ الٰہی کو قرار دیا گیا اور جو کچھ ہمارے ہاں ایک بادشاہ کے نام پر ہوتا ہے وہ اللہ کے نام پر (یعنی اللہ کی حاکمیتِ اعلیٰ کے تحت) کیا جانے لگا۔ حکمرانی کا اختیار و اقتدار، اللہ کے اقتدار کے حوالے سے متعارف کروایا گیا جس کا تصور عربوں کے لیے ابھی تک اجنبی تھا۔ یہ عقیدہ اس طرح متعارف کروایا گیا کہ کوئی دُنیاوی طاقت یا انسان حکمرانی کا (مطلقاً) حق نہیں رکھتا بلکہ یہ حق صرف ذاتِ الٰہی کے لیے ہے جو انسانوں سے بالاتر ہستی ہے اور جس کا اقرار اہلِ ایمان دل سے کرتے ہیں۔ مذہب کی ریاست کا مطلب، ملکی یعنی زمینی بادشاہت کی نفی ہے۔ (انسان کے لیے) حکمران ہونے کے حق کا یہ مطلب نہیں کہ اُسے اس حکمرانی سے لطف اندوز ہونے کا حق بھی حاصل ہے کیونکہ حکمرانی کا اور سلطنت کا (اصلاً) تعلق تو خدا سے ہے لیکن اُس کے رسول اُس کے احکامات وصول کرنے والے اور اُس کی مرضی کے مطابق عمل کرنے والے ہیں اور پیغمبر (محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نہ صرف سچائی کا راستہ دکھانے والے ہیں بلکہ زمین پر واحد مجاز حکمران بھی ہیں اور آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے سوا نہ تو کوئی حکمران ہے اور نہ کوئی پیغمبر ہی ہے۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) دُنیا میں اللہ کی حکمرانی کے نمائندہ ہیں۔ تعلیم و عقیدہ میں اللہ اور اُس کا پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) باہم متعلق ہیں۔ تھیوکریسی ایک ایسی دولتِ مشترکہ ہے جس کا سربراہ نہ کوئی بادشاہ ہے نہ ہی کوئی جبری یا وراثتی طاقت اور جہاں کا قانون خدا کا قانون ہے۔"[1]

---

[1] جولیس ویل ہاسن (متوفی ۱۹۱۸ء)، دی عرب کنگڈم اینڈ اٹس فال،

(The Arab Kingdom and Its Fall)، یونیورسٹی آف کلکتہ، ۱۹۲۷ء

سر تھامس واکر آرنلڈ

(Sir Thomas Walker Arnold,1864-1930)

سر تھامس واکر آرنلڈ ایک برطانوی مؤرّخ تھے۔ ایم اے او کالج لاہور، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ کالج اور گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور میں بھی پڑھاتے رہے۔ علامہ محمد اقبال اور مشہور مؤرّخ سیّد سلمان ندوی کے اُستاد اور مولانا شبلی نعمانی اور سر سیّد احمد خان کے قریبی دوست تھے۔ سر سیّد احمد خان کے اصرار پر مشہورِ زمانہ کتاب ''دی پریچنگ آف اسلام'' (The Preaching of Islam) لکھی، زیرِ نظر اقتباس اُسی سے لیا گیا ہے۔

''ہجرت کے بعد آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی پوزیشن کو سمجھنے کے لیے اُس دَور کے عرب یا کم از کم جزیرہ نمائے عرب کے اُس حصّے (مدینہ منوّرہ) کے حالات کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔ وہاں اُس وقت کسی قسم کا کوئی انتظامی یا عدالتی نظام رائج نہیں تھا جیسا کہ آج کل حکومت کے تصور کے ساتھ ہمارے ذہنوں میں آتا ہے۔ ہر قبیلے کا ایک الگ آزادانہ وجود تھا اور اُس قبیلے یا گروہ کی آزادی اُسی کے افراد تک محدود تھی یعنی اُن کا ہر شخص اپنے سردار کے اختیار کو محض اس لیے مانتا تھا کہ وہ قبیلہ بھر کی مشترکہ رائے کا مظہر ہوتا تھا لیکن اس کے باوجود وہ اس معاملے میں آزاد تھا کہ اپنے قبیلے کے افراد کی اجتماعی رائے سے بھی اختلاف کرے۔ مزید یہ کہ قبیلے کے سردار کا باقاعدہ کوئی اختیاراتی نظام بھی نہیں تھا۔

(دریں حالات) ہم سمجھ سکتے ہیں کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مدینہ کے مختلف النوع افراد سے بطور سربراہ اپنے آپ کو اور اپنے اختیار کو کیسے منوا لیا تھا۔ لوگوں نے یہ سب کچھ بغیر کسی احساسِ عدم تحفظ یا کسی حکومتی جبر و دباؤ کے کیا تھا۔ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس طرح اپنے لوگوں پر دُنیاوی اختیار حاصل کیا جس طرح دوسرے آزاد سرداروں کو اپنے قبائل پر حاصل تھا مگر یہاں ایک واضح فرق موجود تھا کہ یہاں تعلق باہمی رشتۂ خون پر مبنی نہیں تھا بلکہ مذہب پر تھا۔''[1]

---

[1] سر تھامس واکر آرنلڈ (متوفی ۱۹۳۰ء)، دی پریچنگ آف اسلام (The Preaching of Islam)

لیفٹیننٹ جنرل سرجان بیگٹ گلب پاشا

(Lt.Gen. Sir John Bagot Glubb Pasha,1897-1986)

لیفٹیننٹ جنرل سرجان بیگٹ گلب پاشا ایک برطانوی سپاہی، مفکر، مؤرّخ اور کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ پہلی عالمی جنگ میں فرانس میں خدمات انجام دیں پھر عراق اور دیگر عرب ممالک میں بھی تعینات رہے۔ جنرل جان بیگٹ گلب اپنی کتاب دی لائف اینڈ ٹائمز آف محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، (The Life and Times of Muhammad, p.b.u.h.) میں لکھتے ہیں: ''حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے یہودیوں کے ساتھ اُس معاہدے کے مشمولات سے جو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مدینہ تشریف لانے کے فوراً بعد کیا، یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے سیاسی، انتظامی اور عدالتی معاملات کو اب اپنے ہاتھوں میں لے لیا تھا۔ ایک پروان چڑھتے ہوئے (مسلم) معاشرے کے انتظامی سربراہ کے طور پر، جس کو بقاو تحفظ کی فراہمی ضروری تھی اور یہ ارتقا لازمی تھا۔ تاہم اس سے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی زندگی میں ایک نمایاں تبدیلی آ گئی۔ صبر کرنے والے، اپنے مشن کے ساتھ مخلص اور ایذائیں سہنے والے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) یکدم ایک سیاستدان اور حکمران کے طور پر سامنے آئے۔ یہ ایک بہت بڑی تبدیلی تھی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے بہت پہلے اس حقیقت کو محسوس کرلیا ہو کہ آگے چل کر آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا مشن سیاست کے مرحلے میں بھی داخل ہوجائے گا۔[۱]

روبن لیوی

(Reuben Levy,1891-1966)

روبن لیوی کیمبرج یونیورسٹی میں فارسی کے پروفیسر تھے۔آکسفورڈ یونیورسٹی میں بھی فارسی پڑھاتے رہے۔ فارسی ادب اور اسلامی تاریخ پر کئی کتب لکھیں۔ پہلی جنگ عظیم میں

---

[۱] لیفٹیننٹ جنرل سرجان بیگٹ گلب پاشا (متوفی ۱۹۸۶ء)، دی لائف اینڈ ٹائمز آف محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) (The Life and Times of Muhammad, p.b.u.h.) طبع نیویارک، ۱۹۷۱ء

کپتان تھے، ۱۹۱۸ء سے ۱۹۲۰ء تک عراقی پولیٹیکل سروس (Political Service) میں کام کیا، دوسری جنگ عظیم میں سکوارڈن لیڈر بھی رہے۔ وہ اپنی کتاب دی سوشل سٹرکچر آف اسلام (The Social Structure of Islam) میں لکھتے ہیں: ''بادی النظر میں (مدینہ کے) آئین سے ایسی تبدیلی کم ہی وقوع میں آئی ہوگی جو مسلمانوں کی زندگیوں پر اثر انداز ہوتی مگر جیسا کہ خود اس دستاویز سے ظاہر ہے کہ ایک بہت بڑی تبدیلی آچکی تھی اور وہ یہ کہ اب اس ریاست کے افراد کے معاملات کو چلانے کا اختیار سرداروں یا اجتماعی رائے عامہ کے پاس نہیں بلکہ اللہ اور اُس کے رسول حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس تھا۔ اس طرح اس دستور نے عربوں کو ایک انوکھا تصور یعنی (دُنیا سے) بالا حکمران سے متعارف کروایا۔ جو لوگ ریاستِ اسلامی کے اراکین تھے وہ اپنی گزشتہ آزادی اور حکمران منتخب کرنے کا اختیار ترک کر کے الوہی حاکمیت اعلیٰ کے سامنے سرنگوں تھے۔ اس طرح اُنھوں نے ایک تھیوکریسی یعنی خدائی مملکت قائم کی، ایک ایسی مملکت جس میں سیاسی قوت اللہ اور اُس کے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس تھی، اُس ریاست میں مذہب اور سیاست کی کوئی تفریق نہیں تھی یعنی اُمت کے لیے مذہب اور سیاست اس طرح یکجان تھے کہ دونوں کے مقاصد ایک ہی تھے۔ اس طرح رسولِ خدا (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے الوہی احکام سے اپنی سیاسی قوت حاصل کی۔[۱]

جوزف ہیل (Joseph Hell)

جوزف ہیل، اپنی مشہور و معروف کتاب دی عرب سویلائزیشن (The Arab Civilization) طبع ڈبلیو ہیفر اینڈ سنز، کیمبرج سنہ ۱۹۲۶ء میں لکھتے ہیں، ''ریاست مدینہ چلانے کے لیے نافذ کیے جانے والے آئین سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عدیم المثل سیاسی بصیرت

---

[۱] روبن لیوی (متوفی ۱۹۶۶ء)، دی سوشل سٹرکچر آف اسلام (The Social Structure of Islam) طبع کیمبرج یونیورسٹی پریس، ۱۹۵۹ء

سامنے آتی ہے اور اس کی اہمیت بہت زیادہ دُور رس نتائج کی حامل ہے جس کے لیے ہمیں اس کی نمایاں اور اہم شقوں سے متعارف ہونا ہوگا..... الخ۔ اس آئین کا متن اس بات کو واضح کرتا ہے کہ اس کے ذریعے ایک اسلامی ریاست کی بنیاد رکھ دی گئی۔''[۱]

فرانسسکو جبریلی

(Francesco Gabrieli,1904-1996)

فرانسسکو جبریلی اٹلی کے رہنے والے تھے، اُن کے والد ایک لائبریرین (Librarian) تھے جن کی مدد سے اُنھوں نے عربی زبان سیکھی پھر روم یونیورسٹی میں عربی کلاسیکی ادب پڑھا۔ ۱۹۲۸ء سے ۱۹۳۵ء تک ''انسائیکلو پیڈیا اٹالیانا'' (Enciclopedia Italiana) کے ایڈیٹر رہے پھر نیپلز ایسٹرن یونیورسٹی (Naples Eastern University) میں پڑھانا شروع کر دیا۔ ۱۹۳۸ء میں روم یونیورسٹی میں عربی زبان و ادب کے پروفیسر کے طور پر خدمات انجام دیں۔ اُن کا انتقال روم میں ہُوا۔ اُنھوں نے کئی کتابیں لکھیں، اپنی کتاب محمد (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) اینڈ دا کونکوئسٹس آف اسلام (Mohammad p.b.u.h. and the Conquest of Islam) میں میثاقِ مدینہ کا ذِکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں، ''مکّہ کے مشرکین اہلِ مدینہ کے مشترکہ دشمن قرار پائے جن کی مخالفت و مزاحمت کے لیے مذہبی یا سیاسی وجوہات کی بنا پر مدینہ کے تمام طبقات متحد ہو گئے۔''[۲]

---

[۱] جوزف ہیل، دی عرب سویلائزیشن، (The Arab Civilization) طبع ڈبلیو ہیفر اینڈ سنز، کیمبرج ۱۹۲۶ء

[۲] فرانسسکو جبریلی (متوفی ۱۹۹۶ء)، کتاب محمد (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) اینڈ دا کونکوئسٹس آف اسلام (Mohammad p.b.u.h. and the Conquest of Islam)، طبع لندن ۱۹۶۸ء

ولیم منٹگمری واٹ

(William Montgomery Watt, 1909-2006)

ولیم منٹگمری واٹ سکاٹ لینڈ کے بہت مشہور مورّخ تھے، ایڈنبرگ یونیورسٹی (University of Edinburgh) میں عربی اور تاریخ اسلام کے پروفیسر بھی تھے۔ اُنھوں نے متعدد مشہور و معروف کتابیں لکھیں جن میں زیادہ تر کا موضوع اسلام ہے۔ اُن کی تصانیف میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی حیاتِ طیبہ پر لکھی گئی کتابیں ''محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم مکہ میں'' اور ''محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم مدینہ میں''، بہت مشہور ہیں۔ زیرِ نظر اقتباس '' محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم مدینہ میں'' سے لیا گیا ہے۔

'' (میثاقِ مدینہ کے مطابق) مختلف ریاستی معاملات کا حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کے سامنے پیش کیا جانا اس بات کی دلیل تھا کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کو اہلِ مدینہ نے پیغمبر تسلیم کرلیا تھا۔ (آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو صرف پیغمبر ہی نہیں بلکہ ریاستی حکمران بھی تسلیم کیا گیا جس کا اعتراف کرنے میں واٹ نے علمی بخل سے کام لیا ہے۔ مؤلف) دستور کے الفاظ یہ ہیں کہ تمام تنازعات فیصلہ کے لیے اللہ اور حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کے سامنے پیش کیے جائیں گے۔ یہ تصور کہ پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کے وظائف میں انصاف کا قیام بھی شامل ہے، قرآن مجید کی آیت (۱۰:۴۷) میں ہے، ''ہر قوم کے پاس ایک پیغمبر آیا، اور جب رسول آجائے تو ان کے درمیان تمام فیصلے انصاف کے ساتھ کر دیے جاتے ہیں اور ظلم نہیں کیا جاتا۔''[۱] جب اہلِ مدینہ نے حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کو پیغمبر تسلیم کیا تو یہ بات اُن کے ذہن میں تھی اور اسی تصور کے تحت وہ (آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو مختارِ اعلیٰ تسلیم کرنے کے لیے) آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی طرف راغب ہوئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اُن اندرونی جھگڑوں کو ختم کر دیں گے جنھوں نے مدینہ میں زندگی کو ناقابلِ برداشت بنا دیا تھا۔[۲]

---

[۱] سورۃ یونس، آیت ۴۷

[۲] ولیم منٹگمری واٹ (متوفی ۲۰۰۶ء)، محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم مدینہ میں (Mohammad p.b.u.h. at Madina)، طبع کراچی ۱۹۹۴ء

ہیو این کینیڈی

(Hugh N. Kennedy)

ہیو این کینیڈی، ''سکول آف اورینٹل اینڈ افریقن سٹڈیز لندن'' (School of Oriental and African Studies, London) کی ''فیکلٹی آف لینگویجز اینڈ کلچرز'' (Faculty of Languages and Cultures) میں عربی کے پروفیسر ہیں۔ اس سے پہلے یہ ''سینٹ اینڈریوز یونیورسٹی'' (University of St Andrews) میں تاریخ کے پروفیسر بھی رہے۔ بہت بڑے محقق ہیں، ان کی تحقیقات زیادہ تر اسلام پر مبنی ہیں۔ اپنی کتاب "The Prophet and the Age of the Caliphates" میں لکھتے ہیں:

''مہاجرین شروع شروع میں اہلِ مدینہ (جنہوں نے اُن کو مدعو کیا تھا) کے گھروں میں رہ رہے تھے، اُن اہلِ مدینہ کو اب انصار یعنی مدد کرنے والا کہا جاتا ہے۔ .... مہاجرین، انصار پر ہی انحصار کرنے والے بن کے رہ جاتے جہاں اُنھیں ہمیشہ مدد اور تحفظ کی ضرورت رہتی (لیکن) اس سے بچنے کے لیے ہجرت کے ابتدائی دو تین سالوں میں کئی معاہدات کیے گئے جنھیں مجموعی طور پر میثاقِ مدینہ کہا جاتا ہے، اس طرح مہاجرین اور اہل مدینہ کے مابین معاہدہ طے پا گیا (جس کی رُو سے) تمام اہلِ ایمان ایک اُمت قرار دیے گئے (یعنی) ایک ایسی قوم جو آس پاس کے کفّار کے معاشرے سے علاحدہ (تشخص رکھتی) تھی اور اُنھیں (اپنے مخالفین کے خلاف) متحد ہو کر جنگ بھی کرنا تھی۔ اس نو تشکیل شدہ اُمت کا باہمی رشتہ اُن کے کفّار کے ساتھ کسی بھی معاہدے سے بڑھ کر تھا اور اگر اللہ کی راہ میں کوئی مسلمان شہید ہو جاتا تو سب نے متحد ہو کر اُس کا بدلہ لینا تھا۔ تاہم اگر کوئی مسلمان کسی دوسرے مسلمان کو قتل کر دیتا تو بدلہ لینے کے عام قوانین پر عمل کیا جاتا تھا اور مہاجرین کو جن کی قرابتداری یا خاندان مدینہ میں نہیں تھا اُسی طرح ایک خاندان سمجھا جاتا تھا جس طرح مدینہ میں آباد دوسرے مقامی خاندان۔ بعینہٖ اس دستور میں یہود سے تعلق کی شقیں بھی موجود تھیں، جو مدینہ کے معاملات کے فریق تھے۔ وہ جنگ کے اخراجات

میں اپنا حصّہ برداشت کرتے تھے جب تک کہ مسلمانوں اور ان کے درمیان کوئی معاہدہ شکنی نہ ہوتی۔ اگرچہ یہود اور مسلمانوں کا دِین الگ الگ تھا مگر حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کا ذِکر دستور میں دو مرتبہ کیا گیا اور دونوں مرتبہ اس طرح کہ کسی بھی معاملے کے فیصلے کا اختیار اللہ اور حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کے پاس ہے اور ان کے سوا کسی دوسرے منصف کا ذِکر نہیں کیا گیا۔ اس دستاویز نے شہریوں کے مابین قیامِ انصاف کے مسائل کو حل کرنے اور بیرونی قبائل کے ساتھ تعلقات استوار کرنے کے لیے بنیادی کردار ادا کیا۔ تاہم اس دستور میں اس بات کی وضاحت نہیں کہ حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کے اختیارات مطلق ہیں (حال آنکہ اس کا تذکرہ موجود ہے) نیز کسی مذہبی معاملے پر زور نہیں دیا گیا۔ مکّہ کی طرح مدینہ کو بھی حرم قرار دیا گیا اور حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کو اس حرم کی بنیادی مقدس شخصیت قرار دیا گیا۔

ہجرت کے بعد ابتدائی سالوں میں حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کے اختیارات کو دستورِ مدینہ بدیہی طور پر بیان کرتا ہے۔ آنے والے اگلے آٹھ سالوں میں آپ (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) اور آپ (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کے صحابہ کرام (رضی اللہ عنہم) نے اپنی توانائیاں مدینہ میں آپ (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کی اعلیٰ تر حاکمیت کے قیام کے لیے وقف کر دیں جس کے لیے اُنھوں نے اہلِ مکّہ کے خلاف موثر جدوجہد کی، مدینہ کے گرد آباد قبائل کے ساتھ ممکنہ حد تک اتحاد قائم کیا گیا، اُن کا تعاون حاصل کیا گیا اور مسلم معاشرے کے لیے اُصولوں اور اُس کے کردار کو واضح کیا گیا اور یہ سارے مراحل ساتھ ساتھ آگے بڑھتے رہے۔ اہلِ مکّہ کے خلاف جدوجہد نے مدینہ میں آپ (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کی طاقت کے استحکام میں اور بیرونی قبائل کی حمایت نے انجام کار آپ (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کی کامیابی میں کلیدی کردار ادا کیا۔[1]

---

[1] ہیو این کینیڈی (متوفی)، دی پرافٹ اینڈ دی ایج آف کیلی فیٹس،
(The Prophet and the Age of the Caliphates)، طبع لندن

ایڈورڈ گِبن

(Edward Gibbon,1737-1794)

ایڈورڈ گِبن انگریز مؤرّخ اور پارلیمنٹ کے ممبر تھے، اپنی سب سے مشہور کتاب ''دی ہسٹری آف دی ڈیکلائن اینڈ فال آف دی رومن ایمپائر'' (The History of the Decline and Fall of the Roman Empire) میں جو کہ ۱۷۷۶ء سے ۱۷۸۸ء تک چھ جلدوں میں شائع ہوئی، رقم کرتے ہیں، ''حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کو اپنے پر امن اور خیر خواہی کے مشن کی وجہ سے اپنے ہم وطنوں نے (مکّہ میں) ظلم کا نشانہ بنایا اور اپنے شہر سے نکال دیا۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کے آزاد لوگوں نے یعنی اہلِ مدینہ نے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کو ہجرت کرنے والے شخص سے ایک حکمران بنا دیا اور اہلِ مدینہ کی طرف سے (میثاق مدینہ کی صورت میں) آپ کو دوسری قوتوں کے ساتھ اتحاد تشکیل دینے اور دفاعی و اقدامی جنگیں کرنے کا اختیار دے دیا گیا۔ اہلِ مکّہ کے ظلم اور پھر مدینہ کے انتخاب سے ایک عام شہری حکمران اور ایک مبلغ عسکری قائد میں بدل گیا۔[1]

ماؤرس گاڈفرائے ڈی مامبائنز

(Maurice Gaudeferoy Demombynes, 1862-1957)

ماؤرس گاڈفرائے ڈی مامبائنز ایک فرانسیسی دانشور تھے۔ اُنھوں نے مذاہب کی تاریخ پر کام کیا۔ میثاقِ مدینہ سے متعلق وہ اپنی مشہور کتاب ''مسلم انسٹی ٹیوشنز'' (Muslim Institutions) میں لکھتے ہیں، ''اُن آخری سالوں کے دوران میں کیے جانے والے معاہدوں اور مومنوں کی جماعت کی قیادت کے کٹھن کام کے دوران میں حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) ایک منصف، قانون دہندہ اور سربراہ کا کردار حاصل کر چکے تھے اور ان حیثیتوں میں آپ (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کی

---

[1] ایڈورڈ گِبن (متوفی ۱۷۹۴ء)، دی ہسٹری آف دی ڈیکلائن اینڈ فال آف دی رومن ایمپائر
(The History of the Decline and Fall of the Roman Empire)

کارکردگی دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ مدینہ کی دہلیز پر قبا میں اپنے قدم رنجہ فرماتے ہی آپ (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) معجزانہ طور پر اُن اُمور کے لیے موزوں ہو چکے تھے۔ . . الخ۔ مدینہ پہنچتے ہی حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) نے مقامی عرب قبائل کے ساتھ ایک معاہدہ کیا جس کے تحت آپ (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) نے اُن کے اسلام کی طرف واضح طور پر نہ پلٹنے کے باوجود بھی اُنھیں اپنے سربراہی اختیار تسلیم کرنے کا پابند کر دیا۔''[1]

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کا قبولِ اسلام

(۱ہجری/ ۶۲۲ء)

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ ہجرت کے پہلے سال میں دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے۔ قبولِ اسلام سے پہلے تاریخ کی کتب میں اُن کے کئی نام نظر آتے ہیں مثلاً مابہ، روزبہ، ماہویہ، بہبود اور ناجیہ وغیرہ لیکن ان میں زیادہ معتبر نام ''روزبہ'' سمجھا جاتا ہے۔ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ کے قبولِ اسلام کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اُن کا نام سلمان رکھا تھا۔ اُن کی کنیت ابوعبداللہ، ابوالبنات اور ابوالمرشد ہے۔ یہ اصفہان کے رہنے والے تھے اور ایرانی النسل ہونے کی وجہ سے سلمانِ فارسی کے نام سے مشہور تھے۔[2]

کتاب ''اکمال الدین'' میں ابن بابویہ سے اور ''روضۃ الواعظین'' میں محمد افضال سے مروی ہے کہ ایک روز حضرت علی علیہ السلام نے جناب سلمان رضی اللہ عنہ سے کہا کہ اپنے اسلام لانے کا واقعہ بیان کرو تو اُنھوں نے کہا، ''میں شیراز کے ایک دہقان کا بیٹا ہوں، میرے ماں باپ مجھ سے بہت پیار کرتے تھے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ عید کے دن میں ایک راہب کے دَیر میں پہنچا اور وہاں ایک شخص کو کہتے سنا، ''اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللهُ وَ اَنَّ عِيْسٰى رُوْحُ اللهِ وَ اَنَّ مُحَمَّدًا حَبِيْبُ اللهِ'' حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کا نامِ گرامی سنتے ہی اُن کی محبت میرے رگ و ریشہ

---

[1] مادرس گاڈفرائے ڈی ماما ینز (متوفی ۱۹۵۷ء)، مسلم انسٹی ٹیوشنز (Muslim Institutions) طبع لندن ۱۹۵۴ء

[2] مولانا مقبول احمد، سلمانِ محمدی، ص ۴۰ تا ۴۳

میں سرایت کر گئی۔ جب میں گھر واپس آیا تو میری نظر اتفاقاً چھت میں لٹکی ہوئی ایک تحریر پر پڑی۔ میں نے اپنی والدہ سے پوچھا کہ یہ کیا ہے؟ کہنے لگیں کہ اِس کو مت چھونا ورنہ تیرا باپ تجھے مار ڈالے گا۔ میں اُس وقت تو چُپ ہو رہا مگر مجھ سے رہا نہ گیا اور رات ہوئی تو وہ تحریر لے کر پڑھنے لگا۔ اُس میں لکھا تھا، ''بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ، یہ عہد ہے اللہ کا آدم (علیہ السلام) کے لیے، میں اُس کے صُلب سے ایک نبی پیدا کرنے والا ہوں جس کا نام محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہوگا، وہ مکارم اخلاق کی تعلیم دے گا اور لوگوں کو بت پرستی سے منع کرے گا۔ اے روزبہ! تُو عیسیٰ (علیہ السلام) سے مل اور ایمان لا اور مجوسیت کو چھوڑ دے۔'' اپنے نام وہ تحریر پڑھ کر میں حیران رہ گیا اور پھر اُس پر عمل پیرا ہونے پر غور کرنے لگا۔ میرے والدین کو معلوم ہُوا کہ میں نے گھر چھوڑنے کا ارادہ کر لیا ہے تو اُنھوں نے مجھے سختی سے سمجھایا پھر ایک کنوئیں میں قید کر دیا اور کہا کہ اگر تُو اپنے ارادے سے باز نہ آیا تو ہم تجھے مار ڈالیں گے۔ جب مجھ پر یہ آفت آئی تو میں نے خدا سے دُعا کی کہ بحقِ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور وصیِ محمد (علیہ السلام) مجھے اِس مصیبت سے نکال۔ ناگاہ ایک سفید پوش شخص آیا جس نے میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے کنوئیں سے نکالا اور ایک راہب کے دیر میں لے گیا۔ میں نے راہب سے کہا، ''اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَ اَنَّ عِیْسٰی رُوْحُ اللّٰہِ وَ اَنَّ مُحَمَّدًا حَبِیْبُ اللّٰہِ'' اُس راہب نے مجھ سے کہا کہ اے روزبہ! تم میرے پاس رہو۔ چنانچہ میں دو سال تک اُس کے پاس رہا۔ جب اُس کا آخری وقت آیا تو اُس نے مجھے وصیّت کی کہ انطاکیہ کے راہب کے پاس چلے جاؤ۔ (انطاکیہ، روم کا ایک بہت بڑا اور مقدس شہر ہے۔ رومیوں نے تعظیماً اس کا نام ''اللہ کا شہر'' رکھا تھا۔ اس کو ''اُمّ المدن'' یعنی شہروں کی ماں بھی کہا جاتا ہے، یہ پہلا شہر ہے جہاں سے دینِ عیسوی ظاہر ہُوا، بقولے، اللہ کی طرف سے شمعون اور یوحنا یہیں بھیجے گئے تھے۔) پھر میں انطاکیہ کے راہب کے پاس گیا اور دو سال اُس کے پاس رہا۔ جب وہ مرنے لگا تو وصیّت کی کہ اسکندریہ کے راہب کے پاس جاؤ (اسکندریہ، مصر کا شہر ہے جو قاہرہ کے شمال مغرب میں دریا کے کنارے واقع ہے) اور وہ لوح جو کہ ہر راہب

دوسرے کے لیے دیا کرتا تھا مجھے دی اور کہا کہ اُس راہب کے سپرد کردینا۔ میں اسکندریہ کے راہب کے پاس پہنچا اور دو سال اُس کی خدمت میں رہا۔ جب اُس کا آخری وقت آیا تو میں نے پوچھا کہ اب میں کہاں جاؤں؟ اُس نے مجھے لوح دی اور کہا کہ اب حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا زمانہ قریب آ گیا ہے جب تُو اُن سے ملے تو میرا اسلام کہنا اور یہ لوح اُن کو دے دینا۔ اُس کے دفن کے بعد میں وہاں سے چل پڑا۔ راستے میں ایک منزل پر کچھ لوگ ملے، اُنھوں نے بکری ذبح کر کے پکائی اور کھانے بیٹھے تو مجھے بھی دعوت دی۔ میں نے کہا کہ میں راہب ہوں اور گوشت نہیں کھاتا۔ پھر اُنھوں نے شراب پیش کی، میں نے اُس سے بھی انکار کر دیا۔ اس پر وہ غصے میں آ گئے اور مجھے خوب مارا اور میں نے اس خوف سے کہ کہیں وہ مجھے قتل نہ کر دیں اُن میں سے ایک کی غلامی قبول کر لی۔ اُس نے مجھے ایک یہودی کے ہاتھ تین سو درہم میں بیچ دیا۔ یہودی نے مجھ سے میرا قِصَّہ پوچھا تو میں نے کہا کہ سوائے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی محبت کے میرا کوئی قصور نہیں۔ وہ کہنے لگا کہ پھر تو میں تیرا بھی دشمن ہوں اور محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا بھی۔ صبح کو اُس نے ریت کا ایک ڈھیر مجھے دکھا کر کہا کہ شام تک یہ سارا ڈھیر یہاں سے ہٹاؤ ورنہ میں تجھے مار ڈالوں گا۔ میں نے دن بھر اُسے اُٹھایا مگر وہ ختم نہ ہُوا۔ میں نے خدا سے دُعا کی تو ایک آندھی اُٹھی اور اُس ریت کو اُڑا کر لے گئی۔ صبح کو یہودی نے دیکھا تو کہنے لگا تُو ساحر ہے اور میں تجھ سے خائف ہوں۔ پس اُس نے مجھے ایک عورت کے ہاتھ بیچ دیا۔ اُس عورت کا ایک باغ تھا جس کی نگرانی میرے سپرد ہوئی۔ ایک دن سات آدمی وہاں آئے جن کے سروں پر اَبر سایہ فگن تھا۔ اُن میں ایک حضرت محمد مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، دوسرے اے علی (علیہ السلام)! آپ، تیسرے ابوذر غفاری (رضی اللہ عنہ)، چوتھے مقداد (رضی اللہ عنہ)، پانچویں عقیل (رضی اللہ عنہ)، چھٹے حمزہ (رضی اللہ عنہ) اور ساتویں زید (رضی اللہ عنہ) تھے۔ میں نے خرمے کا ایک تھال آپ سب کے سامنے رکھا اور کہا کہ یہ صدقہ ہے۔ اوروں نے کھا لیا لیکن حضرت رسولِ خدا (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور اے علی مرتضیٰ (علیہ السلام)! آپ نے اُسے چھوا تک نہیں۔ میں دوسرا تھال لایا اور یہ کہہ کر پیش کیا کہ یہ ہدیہ ہے قبول فرمائیں۔ رسول اللہ

(صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اور آپ نے وہ خرمے بسم اللہ پڑھ کر کھا لیے۔ میں نے دِل ہی دِل میں کہا کہ نبی آخر الزمان (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تین علامتوں میں سے دو تو میں نے پالیں یعنی اَبر کی سایہ فگنی اور صدقہ کا حرام ہونا، پس میں تیسری علامت کی جستجو میں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا، "اے روزبہ! کیا مُہرِ نبوّت کی تلاش ہے؟" یہ فرما کر آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنے شانے کھول دیے۔ میں نے مُہرِ نبوّت کی زیارت کی اور آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے قدموں میں گر پڑا۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ تم اپنی مالکہ سے کہو کہ محمد بن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پوچھتے ہیں کہ کیا تم اپنے اِس غلام کو بیچنا چاہتی ہو؟ میں نے عورت سے پوچھا تو اُس نے جواب دیا کہ ہاں! بیچتی ہوں مگر قیمت چار سو درخت خرما ہے۔ میں نے حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو آکر بتایا۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ منظور ہے۔ چنانچہ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اے علی (علیہ السلام)! آپ کو خرما کی چار سو گٹھلیاں جمع کر کے اُن کو بونے اور پانی دینے کا حکم دیا۔ آپ نے ایسا ہی کیا اور فوراً زمین سے درخت پھوٹ پڑے اور بڑھ کر لہلانے لگے۔ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مجھ سے فرمایا کہ اُس عورت سے جا کر کہو کہ تیری خواہش پوری ہوئی اب ہماری چیز ہمارے حوالے کر دو۔ پس اُس روز سے میں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں آ گیا۔ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مجھے آزاد کر دیا اور میرا نام سلمان رکھا۔[1]

ابن بابویہ نے بسندِ معتبر حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے روایت کی ہے کہ سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کہتے تھے مجھے چھ چیزوں کے بارے میں تعجب ہوتا ہے جن میں سے تین مجھے ہنساتی ہیں اور تین رُلاتی ہیں۔ جن تین چیزوں سے مجھ پر گریہ طاری ہوتا ہے اُن میں سے اوّل دوستوں کی مفارقت ہے جو کہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب رض ہیں، دوم ہولِ مرگ اور بعد از مرگ حالات، سوم خدا کے سامنے حساب کے لیے کھڑا ہونا اور جن تین چیزوں پر مجھے ہنسی آتی ہے یہ

---

[1] مولانا سید ظفر حسن، کتاب مستطاب مجمع الفضائل ترجمہ مناقب علامہ ابن شہر آشوب، ج ۱ ص ۲ تا ۴
مولانا مقبول احمد، سلمانِ محمدی، ص ۴۰ تا ۴۳۔ حیاتُ القلوب، ج ۲ باب ۵۹ ص ۹۳۳ تا ۹۳۶

ہیں، اوّل وہ شخص جو دُنیا کی طلب میں رہتا ہے جب کہ موت اُس کی طلب میں رہتی ہے، دوم وہ شخص جو آخرت کے احوال سے غافل ہے حال آنکہ خداوند عالم اور اُس کے فرشتے اُس سے غافل نہیں اور اُس کے اعمال کا اِحصا (شمار) کرتے رہتے ہیں، سوم وہ شخص جو اپنا منہ ہنسنے کے لیے کھولتا ہے مگر نہیں جانتا کہ خدا اُس پر راضی ہے یا غضبناک۔ [۱]

شیخ طوسی نے بسندِ معتبر حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام سے نقل کیا ہے کہ سلمان رضی اللہ عنہ کے دوستوں میں سے ایک شخص بیمار ہوگیا۔ جب چند روز تک اُس سے ملاقات نہ ہوئی تو اُس کا حال دریافت کیا کہ وہ کہاں ہے؟ لوگوں نے کہا کہ وہ بیمار ہے تو کہا آؤ اُس کی عیادت کو چلیں۔ غرض لوگ اُن کے ساتھ ہو لیے اور وہ اُس کے گھر پہنچے تو اُسے جان کنی کی حالت میں دیکھا۔ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے ملک الموتؑ سے خطاب کیا کہ خدا کے دوست کے ساتھ نرمی اور مہربانی سے پیش آیئے گا۔ ملک الموت نے جواب دیا جسے تمام حاضرین نے سُنا کہ اے ابوعبداللہ! میں تمام مومنین کے ساتھ نرمی کرتا ہوں اور اگر کسی کے سامنے اس طرح آؤں گا کہ وہ مجھے دیکھ سکے تو بیشک وہ تم ہی ہو گے۔ [۲]

حضرت عبداللہ بن سلامؓ کا قبولِ اسلام

(۱ ہجری/ ۶۲۲ء)

حضرت عبداللہ بن سلامؓ نے بھی سنہ ایک ہجری میں اسلام قبول کیا۔ اسلام لانے سے پہلے وہ ایک یہودی عالِم تھے۔ جب مقدر نے یاوری کی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور چند سوالات کیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جوابات سُن کر بہت متاثر ہوئے اور کہا کہ یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! یہودی جھوٹے اور بہتان طراز ہیں اگر میرے مسلمان ہونے

---

[۱] علامہ محمد باقر مجلسی (متوفی ۱۶۹۸ء)، حیاتُ القلوب، ج ۲ ص ۹۳۶

[۲] علامہ محمد باقر مجلسی (متوفی ۱۶۹۸ء)، حیاتُ القلوب، ج ۲ ص ۹۳۷

کی خبر سنیں گے تو مجھ پر بہتان لگائیں گے لہٰذا آپ (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) مجھے چھپالیں اور انھیں بلا کر میرے بارے میں اُن کی رائے دریافت فرمائیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اُن کی خواہش پر انھیں پوشیدہ کرلیا اور یہودیوں کو طلب فرما کر پوچھا کہ عبداللہ بن سلام تم میں کیسا شخص ہے؟ وہ بولے کہ وہ ہم میں بہترین اور بلند مرتبہ ہے، بہترین اور بلند مرتبہ کا بیٹا ہے، وہ ہمارا عالِم ہے اور ہمارے عالِم کا بیٹا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ اگر وہ مسلمان ہوجائے تو کیا تم لوگ بھی مسلمان ہوجاؤ گے؟ وہ کہنے لگے کہ خدا اُس کو اس فعل سے اپنی پناہ میں رکھے۔ یہ سُن کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے حضرت عبداللہ کو آواز دی اور فرمایا کہ اے عبداللہ! باہر آجاؤ۔ حضرت عبداللہ اُن کے سامنے آگئے اور کہا، "اَشْهَدُ اَنْ لَّآاِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ" یہودی کہنے لگے کہ یہ ہم میں بدترین اور جاہل شخص ہے اور بدترین اور جاہل شخص کا بیٹا ہے۔[۱]

زکوٰۃ کا حکم

(۱ ہجری/ ۶۲۲ء)

ابنِ خلدون کے مطابق اسی سال یعنی سنہ ایک ہجری میں زکوٰۃ فرض کی گئی۔[۲]

دفاعی منصوبہ بندی

(رمضان المبارک ۱ ہجری/ مارچ ۶۲۳ء)

مشرکینِ مکّہ کی پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے عداوت آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے مشن ہی کی وجہ سے تھی چنانچہ جُوں جُوں آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا مشن آگے بڑھنے لگا توں توں اُن کی دشمنی بھی پروان چڑھنے لگی

---

[۱] مولانا سید ظفر حسن، کتاب مستطاب مجمع الفضائل ترجمہ مناقب علامہ ابن شہر آشوب، ج ۱ ص ۲ تا ۴
مولانا مقبول احمد، سلمانِ محمدی، ص ۴۰ تا ۴۳

[۲] علامہ نجم الحسن کراروی (متوفی ۱۹۸۲ء)، چودہ ستارے، ص ۶۴ بحوالہ ابنِ خلدون

اور جب اُن کی مخالفت بے حد خطرناک ہوگئی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بحکمِ الٰہی مکّہ چھوڑ دیا اور ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے۔ مشرکوں کو گمان تھا کہ مدینہ میں تحریکِ اسلام مقامی خانہ جنگیوں کا شکار ہو کر ناکام ہوجائے گی کیونکہ مدینہ کے دو اہم قبیلے اوس اور خزرج ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے اور ایسے میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جس کے مہمان بنیں گے اُس کا مخالف قبیلہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بھی دشمن ہوجائے گا۔ لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب دونوں قبیلوں کے درمیان دیرینہ دشمنی کا خاتمہ کرا دیا اور دونوں ہی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر رہنے لگے تو قریش مایوس ہو کر دوسرے ذرائع تلاش کرنے لگے۔ عبداللہ بن اُبی بن سلول منافقین کی ایک جماعت کا سرغنہ تھا۔ اُس جماعت کے لوگ کسی مصلحت کی بنا پر بظاہر اسلام لے آئے تھے مگر در پردہ اپنے قدیم عقائد پر قائم تھے۔ قریش کو اُس کے بارے میں معلوم ہُوا تو اُس کی وساطت سے اہلِ مدینہ کو ایک خط لکھا جس کا مضمون کچھ یوں تھا، ''اے مدینہ والو! تم نے ہمارے خاندان کے ایک شخص محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو اپنے ہاں ٹھہرایا ہے۔ ہم تمھیں مطلع کرتے ہیں کہ تمھاری خیریت اسی میں ہے کہ اُن کو مدینہ سے نکال دو یا اُن سے جنگ کرو اور اُنھیں گرفتار کر کے ہمارے حوالے کر دو۔ ہم نے متفقہ طور پر حلفاً عہد کیا ہے کہ اگر تم نے ہماری مرضی کے مطابق عمل نہ کیا تو ہم تم پر حملہ کر کے تمھارے جوانوں کو قتل کر دیں گے اور تمھاری عورتوں کو اپنے قبضے میں لے لیں گے۔'' یہ خط ملنے پر عبداللہ بن اُبی نے اپنے ساتھیوں کو جمع کیا۔ اُس مجلس میں وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر قاتلانہ حملے کا منصوبہ بنا رہا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دِلوں کے بھید جاننے والے خداوند علیم وخبیر نے اُس کے منصوبے سے مطلع فرما دیا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عین موقع پر وہاں پہنچ گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُنھیں مخاطب کر کے فرمایا، ''تم قریش کے دھوکے میں آ گئے ہو۔ اگر تم نے اِس سرزمین پر خون ریزی کرنے کا ارادہ کیا تو تمھیں سخت نقصان ہوگا اور تمھیں اپنے اُن بھائیوں کا خون بہانا ہوگا جو ہمارا ساتھ دیں گے۔ پس جیسا کہ تمھاری قوم نے میرا ساتھ دینے کا عہد کیا ہے تمھارا فرض

بھی یہی ہے کہ اگر کوئی اس شہر پر حملہ آور ہو تو تم سب ہمارے ساتھ مل کر دفاع کرو۔"[1]

عبداللہ بن اُبیَ کی سازش بے نقاب ہوجانے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے خطاب سے وہ منصوبہ خاک میں مل گیا۔

مدینہ کی فضا اگرچہ اسلام اور مسلمانوں کے لیے سازگار تھی لیکن محفوظ نہیں تھی اور نہ صرف مشرکینِ مکّہ کی طرف سے ابھی تک خطرہ تھا بلکہ یہود اور اردگرد کی غیر مسلم قوتوں کی طرف سے بھی جنگ وجدال کا امکان تھا۔ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم صرف پیغمبرِ خدا اور تبلیغ و نصیحت کرنے والے اللہ کے خاص بندے ہی نہیں تھے بلکہ اعلیٰ سیاست، عسکری بصیرت اور علم و حکمت کا ایسا مکمل پیکر تھے جن کی سیاست و بصیرت اور دانائی و حکمت کے سامنے آج کے زیرک سیاست دان، بڑے بڑے حکمران اور ذہین ترین انسان بھی انگشت بدنداں ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم بخوبی سمجھتے تھے کہ عرب کی ظلمتوں میں روشن ہونے والا یہ چراغِ ہدایت کسی وقت بھی منہ زور آندھیوں کی زد میں آسکتا ہے پس آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے مدینہ میں قیام پذیر ہوتے ہی دفاعی منصوبہ بندی کا آغاز فرما دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا دفاعی منصوبہ تین حصّوں پر مشتمل تھا:

پہلا حصّہ مسلمانوں کی عسکری تربیت پر مشتمل تھا جس کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے مسجد نبوی کو فوجی صدر مقام بنا کر مومنین کی عسکری تربیت کا آغاز فرمایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اسلام کے نقطۂ نظر سے جہاد کی اہمیت و فضیلت کو واضح کر کے مسلمانوں میں جذبۂ جہاد پیدا کرتے تھے اور یہ جذبہ اتنا طاقتور تھا کہ مومنین دُنیا کی چند روزہ زندگی پر راہِ خدا میں شہید ہوجانے کو ترجیح دیتے تھے۔

دوسرا حصّہ اپنے دفاعی حصار کو مضبوط کرنے سے متعلق تھا۔ اس کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے قریش کی نقل و حرکت کی نگرانی شروع کروادی۔ اس کا مقصد قریش پر یہ ثابت کرنا تھا کہ

---

[1] کے اے حمید، مسلمانانِ عالم، حصّہ اوّل ص ۲۷

مسلمان دفاعی صلاحیتوں سے مالا مال ہیں اور اپنی سرحدوں کی حفاظت سے غافل نہیں اور یہ بھی مقصود تھا کہ اردگرد کے علاقوں کے سیاسی، عسکری اور جغرافیائی حالات سے آگاہی ہو سکے۔

اور تیسرا حصّہ قریش کے علاوہ اردگرد کی ریاستی طاقتوں اور منافقین کی ممکنہ سازشوں کی حوصلہ شکنی کرنا تھا تاکہ وہ کسی بھی موقع پر مومنین کے خلاف اغیار کی حمایت میں کھڑے نہ ہوسکیں۔ ہمارے عقیدے کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہستی سب سے زیادہ محترم اور بزرگ و برتر تو ہے ہی مگر علمی، سیاسی اور عسکری نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شخصیت میں کمال کی حکمت و بصیرت اور سیاست و دُور اندیشی نظر آتی ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پوری توانائی اور حکمت عملی سے میدانِ کارزار میں دفاعِ دین کے لیے سرگرم عمل دکھائی دیتے ہیں۔

جہاد

(رمضان المبارک ۱ ہجری / مارچ ۶۲۳ء)

تاریخ کے طالب علم جانتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مدینہ طیّبہ تشریف لے جانے اور اسلام کے تیزی سے پھیلنے کی خبر قریش پر بجلی بن کر گری۔ اُن کا جذبۂ انتقام بھڑک اُٹھا اور اسلام کی بڑھتی ہوئی قوت کو کچلنے کے لیے وہ مزید سرگرم ہو گئے۔ چنانچہ دُنیا کے نقشے پر اُبھرتی ہوئی ایک نئی اسلامی مملکت اور نئے دِین کو سخت خطرات درپیش تھے جن سے نپٹنے کے لیے ضروری تھا کہ اردگرد کی ریاستوں اور قبیلوں پر عموماً اور قریش پر خصوصاً نظر رکھی جائے اور کسی دراندازی کی صورت میں دشمن پر ایسی کاری ضرب لگائی جائے کہ آئندہ اُنھیں مسلمانوں کی طرف میلی آنکھ سے دیکھنے کی جرأت نہ ہو سکے۔ شروع میں چونکہ خداوند متعال کی طرف سے اذن جنگ نہیں تھا اس لیے مسلمانوں کی مہمات محض دشمن کی سرگرمیوں پر نظر رکھنے اور دفاعی منصوبہ بندی تک ہی محدود رہیں اور ہر طرح کی خونریزی سے اجتناب کیا گیا، پھر حکمِ الٰہی ہُوا:[۱]

---

[۱] سورۃ الحج آیت ۳۹ تا ۴۰

أُذِنَ لِلَّذِينَ يُقَاتَلُونَ بِأَنَّهُمْ ظُلِمُوا ۚ وَإِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ نَصْرِهِمْ لَقَدِيرٌ ﴿٣٩﴾ الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِن دِيَارِهِم بِغَيْرِ حَقٍّ إِلَّا أَن يَقُولُوا رَبُّنَا اللَّهُ ۗ وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ بَعْضَهُم بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَصَلَوَاتٌ وَمَسَاجِدُ يُذْكَرُ فِيهَا اسْمُ اللَّهِ كَثِيرًا ۗ وَلَيَنصُرَنَّ اللَّهُ مَن يَنصُرُهُ ۗ إِنَّ اللَّهَ لَقَوِيٌّ عَزِيزٌ ﴿٤٠﴾

(اِن مظلوموں کو (دفاعی جہاد کی) اجازت دی جاتی ہے جن سے جنگ کی جارہی ہے اس بنا پر کہ اِن پر ظلم کیا گیا ہے۔ اور بیشک اللہ اِن کی مدد کرنے پر قادر ہے۔ یہ وہ (مظلوم) ہیں جو ناحق اپنے گھروں سے نکال دیے گئے صرف اتنی بات پر کہ وہ کہتے تھے کہ ہمارا پروردگار اللہ ہے اور اگر خدا بعض لوگوں کو بعض کے ذریعے دفع نہ کرتا رہتا تو نصرانیوں کی خانقاہیں اور گرجے اور (یہود کے) عبادت خانے اور (مسلمانوں کی) مسجدیں جن میں بکثرت ذِکرِ خدا ہوتا ہے سب گرادی جاتیں، جو کوئی اللہ (کے دین) کی مدد کرے گا اللہ ضرور اُس کی مدد کرے گا، بیشک وہ طاقت والا (اور) غالب آنے والا ہے)

اس آیتِ کریمہ کی ابتدا لفظ ''اُذِنَ'' سے ہورہی ہے جس کا مطلب ''اجازت'' ہے، اور اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس آیتِ مبارکہ سے پہلے مسلمانوں کو جنگ کی اجازت نہیں تھی، پس مندرجہ بالا آیتِ کریمہ کے نزول کے بعد باقاعدہ جہاد کا آغاز کیا گیا جو کہ غزوات اور سریات پر مشتمل تھا۔

غزوہ اور سریہ وغیرہ کی تعریف

ایسی مہمات کو جن میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود شرکت فرمائی غزوہ کہا جاتا ہے اور جن میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے صحابہؓ میں سے کسی کو فوج کا سالار بنا کر بھیجا سریہ کہا جاتا ہے۔ سریہ کو بعث بھی کہا جاتا ہے۔ بعث کے لفظی معنی پیغام بر بھیجنا اور سریہ کا مطلب رات میں سیر کرنا ہے۔ اہلِ سیر کی اصطلاح میں لشکر کا وہ ٹکڑا جسے دشمن پر حملہ کرنے کے لیے بھیجا جاتا ہے سریہ کہلاتا ہے، اس کی تعداد پانچ سو تک ہوتی ہے، یہ لشکر سے جُدا ہوکر جاتا ہے اور پھر واپس اُسی لشکر میں لوٹ

آ تا ہے۔ پانچ سو سے زیادہ تعداد پر مشتمل لشکر کے ایسے ٹکڑے کو ''منسر'' کہتے ہیں اور اگر اس کی تعداد آٹھ سو سے زیادہ ہو تو ''جیش''، چار ہزار سے زیادہ ہو تو ''جحفل'' اور لشکرِ عظیم کو ''خمیس'' کہا جاتا ہے۔ خمیس مجتمع ہوتا ہے اور اس میں پانچ ٹکڑے ہوتے ہیں، مقدمہ، قلب، میمنہ، میسرہ، ساقہ اور کتیبہ۔ [1]

واضح رہے کہ عہدِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں رقم کیے گئے تمام سریات وغزوات میں اور خصوصاً اُن مہمات میں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ممانعتِ جنگ کے عرصہ میں رونما ہوئیں، دشمن پر حملہ کرنا یا اُسے لُوٹنا مقصود نہیں تھا اور نہ ہی ایسا کیا گیا، وہ تمام مہمات دفاعی تھیں یعنی اُن کا مقصد دینِ اسلام اور مسلمانوں کا دفاع کرنا تھا نہ کہ مخالفین کو بے جا نقصان پہنچانا یا اُن کا خون بہانا۔ یہ نظریہ اغیار کا ہے کہ اسلام تلوار کے زور پر پھیلا، ہمارا ایمان یہ ہے کہ اسلام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اخلاقِ حسنہ کی بدولت پھیلا اور حقیقت بھی یہی ہے۔

مزید برآں اکثر مہمات جنھیں تاریخ میں سریات یا غزوات کا نام دیا گیا ہے آج کل کی اصطلاح میں اُنھیں جنگ یا لڑائی کا نام نہیں دیا جاسکتا البتہ اُنھیں تادیبی کارروایاں کہا جاسکتا ہے جو کہ کسی معاہدے کی خلاف ورزی کی صورت میں یا مجرموں کی سرکوبی کے لیے کی جاتی ہیں۔ زمانۂ قدیم میں چونکہ ایسی اصطلاحات موجود نہیں تھیں اور مہمات کی تفریق کے لیے ذخیرۂ الفاظ ناپید تھا چنانچہ مؤرّخین نے جس طرح بدر واُحد اور خندق کو غزوات کے لفظ سے تعبیر کیا اسی طرح اُن مہمات کے لیے بھی ایسے ہی الفاظ چُن لیے۔ اب کیونکہ غزوہ اور سریہ وغیرہ کے ناموں سے یہ اصطلاحات رائج ہوچکی ہیں لہٰذا ہم بھی اس کتاب میں یہی الفاظ استعمال کریں گے لیکن اس فرق کو جس پر یہاں بقدرِ ضرورت روشنی ڈالی گئی ہے ان تمام مہمات میں پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے کہ سب غزوات وسریات کی نوعیت وہ نہیں جو غزوۂ بدر واُحد وغیرہ کی ہے۔ غزوۂ اُحد وبدر

---

[1] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۱۱۲

میں مخالف قوم سے مقابلہ تھا اور یہ ثابت ہے کہ وہ مقابلے بھی مدافعانہ طور پر ہوئے تھے نہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے کسی جارحانہ پیش قدمی کی بنا پر۔

غزوات کی مجموعی تعداد چھبیس ہے جن کے نام مندرجہ ذیل ہیں:

ابواء، بواط العشیرہ، بدر اولیٰ، بدر کبریٰ، اُحد، نجران، بنوسلیم، بنونظیر، ذات المرقاع، بدرالاخوۃ، دومتہ الجندل، خندق، بنوقریظہ، بنولحیان، بنوقرد، بنو مصطلق، الحدیبیہ، خیبر، الفتح، حنین، طائف، تبوک، بنوقینقاع، سویق اور بنواسد۔ اِن میں سے اکثر میں جنگ نہیں ہوئی۔ صرف دس غزوات میں جنگیں ہوئیں جن کے نام یہ ہیں:

بدر، اُحد، خندق، بنی قریظہ، بنی لحیان، خیبر، فتح (مکّہ) حنین، بنوالمصطلق اور طائف۔ [۱]

کتاب ''مدارج النبوّت'' کے مطابق غزوات کی تعداد ستائیس ہے جیسا کہ ''مواہب'' میں بھی ہے۔ ''روضۃ الاحباب'' کے قول کے بموجب اکیس اور ایک اور قول کے مطابق چوبیس بھی منقول ہے، نو غزوات میں قتال واقع ہُوا جن میں غزوۂ بنی لحیان کا نام شامل نہیں ہے۔ صحیح بخاری میں حضرت زید بن ارقمؓ سے روایت ہے کہ اُنیس غزوات تھے اور سینتالیس سریات، بعض چھپن بھی کہتے ہیں۔ [۲]

علامہ نجم الحسن نے سریوں کی تعداد چھتیس لکھی ہے جن میں سب سے مشہور سریہ ''موتہ'' ہے جس میں حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ شہید ہوئے۔ [۳] ابن اسحاق سے مروی ہے کہ سب سے پہلا غزوہ ''ابواء'' تھا پھر ''بواط'' اور پھر ''عشیرہ''۔ [۴]

---

[۱] مولانا سید ظفر حسن، مجمع الفضائل ترجمہ مناقب علامہ ابن شہر آشوب، ج ا ص ۹۰

[۲] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۱۱۲

بحوالہ احمد بن محمد قسطلانی (متوفی ۹۲۳ ہجری)، المواہبُ اللدنیۃ۔ جمال الدین محدث، روضۃ الاحباب

[۳] علامہ نجم الحسن کراروی (متوفی ۱۹۸۲ء)، چودہ ستارے، ص ۶۵

[۴] صحیح بخاری، باب غزوہ عشیرہ، حدیث ۳۹۴۷

''ابواء'' جحفہ کے قریب ایک مقام کا نام ہے۔ ابواء کی اصل ''اوبا'' سے تھی جو''وبا'' سے ہے، اس کو بدل کر ابواء کہا جانے لگا۔ ابواء کو''وِدّان'' بھی کہتے ہیں، بعض کتابوں میں یہ نام بھی آیا ہے۔ شیخ عبدالحق بحوالہ مواہب لکھتے ہیں کہ ابواء اور وِدّان دو مختلف جگہوں کے نام ہیں جو ایک دوسرے کے قریب واقع ہیں اور اُن میں تین میل کا فاصلہ ہے۔ ''بواط'' جہینہ کے پہاڑوں میں سے ایک کا نام ہے جو منع کے قریب ہے اور''عشیرہ'' کو''عسیرہ'' بھی کہتے ہیں جیسا کہ''بخاری'' میں آیا ہے۔ غزوہ عسرۃ بمعنی دشواری غزوۂ تبوک کا نام ہے جو آخری غزوہ ہے، اس میں لوگوں کو بہت دشواریاں پیش آئیں اور بہت تکالیف اٹھائی گئیں۔ [۱]

سریۂ حمزہ بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ/ سریۂ سیف البحر/ سریۂ عیص

(رمضان ۱ ہجری/ مارچ ۶۲۳ء)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سریے کی کمان حضرت امیر حمزہ رضی اللہ عنہ کو سونپی اس لیے اس کو سریۂ حمزہ رضی اللہ عنہ یا سریۂ سیف البحر کہا جاتا ہے اور اس کے مقام''عیص'' کی وجہ سے اسے''سریۂ عیص'' بھی کہتے ہیں۔ یہ پہلا سریہ تھا اور یہ رمضان ۱ ہجری (مارچ ۶۲۳ء) میں واقع ہُوا۔

مروی ہے کہ مدینہ طیبہ میں خبر پہنچی کہ قریش کی ایک جماعت مکّہ مکرمہ میں لُوٹ مار کر رہی ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں اسّی مہاجرین کا ایک دستہ مرتب فرما کر اُس جماعت کی سرکوبی کے لیے روانہ کیا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ دستہ انصار کے لوگوں پر مشتمل تھا لیکن محققین کے نزدیک انصار کو غزوۂ بدر سے پہلے کسی مہم پر روانہ نہیں کیا گیا چنانچہ یہ مہاجرین ہی کا دستہ تھا۔ روانگی سے پہلے ایک سفید جھنڈا تیار کیا گیا اور ابو مرشد غنوی کو لشکر کا علمدار بنایا گیا۔ بعض مؤرّخین کے مطابق فوجِ اسلام میں تیار کیا جانے والا یہ سب سے پہلا علم تھا۔ [۲]

---

[۱] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۱۱۲ بحوالہ مواہب، بخاری

[۲] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۱۱۴

اس سریے سے متعلق یہ بھی روایت کیا گیا ہے (ہمیں اس روایت سے اتفاق نہیں۔ مؤلف) کہ ابوجہل تین سو اُونٹوں پر مشتمل قریش کا ایک تجارتی کارواں لیے "عیص" کی طرف سے گذرنے والا تھا جسے روکنے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے تیس مجاہدین کا ایک دستہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی کمان میں روانہ کیا۔ اگرچہ مجاہدین کو جارحانہ کاروائی کا حکم نہیں تھا اور اُن کا مقصد محض قافلے کو روک کر اپنی جرأت وطاقت کا اظہار کرنا تھا مگر ابوجہل اُن کے تیور دیکھ کر گھبرا گیا۔ اُس نے قافلے کے لُٹ جانے کے خوف سے اُس علاقے کے سردار مجدی بن عمرو جہنی کو بیچ میں ڈالا جس نے اُس کا بچاؤ کرایا۔ [۱] ابوجہل اور اس کا قافلہ مکّہ کی طرف کوچ کر گیا اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ مدینہ طیّبہ لوٹ آئے۔ یعنی اُس موقع پر جنگ نہیں ہوئی۔

قریش کے تجارتی قافلوں پر حملوں کی تردید

ماضی اور حال کے بعض مؤرّخین اور مؤلفین نے سریۂ حمزہ کی طرح دیگر سریات میں بھی مسلمانوں کی طرف سے قریش کے تجارتی قافلوں کو روکنے، اُن پر حملہ آور ہونے اور لوٹ مار کرنے کا ذِکر کیا ہے جو ہمارے نقطۂ نظر سے بالکل غلط اور بے بنیاد ہے۔ اس کی توجیہہ مندرجہ ذیل حوالوں سے کی جاسکتی ہے:

۱) تجارتی قافلوں پر حملہ آور ہونا یا اُن کو لوٹنا راہزنی اور ڈکیتی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اللہ کے رسول ہیں جنھیں اُس نے تمام عالمین کے لیے رحمت بنا کر بھیجا (وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ) [۲] اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ذاتِ مبارکہ میں پیروی کے لیے بہترین نمونہ قرار دیا (لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ) [۳] پس آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ایسے کسی فعل کی اجازت کسی

---

[۱] ڈاکٹر نصیر احمد ناصر، کتاب: پیغمبر اعظم وآخر صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم، ص ۴۴۲

[۲] سورۃ الانبیاء، آیت ۱۰۷

[۳] سورۃ الانبیاء، آیت ۱۰۷

صورت میں نہیں دے سکتے تھے جو نوعِ انسانی کے ساتھ ظلم وزیادتی میں شمار ہوتا ہو۔

۲) مدینہ میں آکر آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا مقصد اہلِ مکّہ سے چھیڑ چھاڑ کرنا، اُن کو لُوٹنا یا اُن سے جنگ کرنا ہرگز نہیں تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تو اپنے مشنِ رسالت کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لیے اللہ کے اذن سے مدینہ آئے تھے۔ اس کا اعتراف بعض غیر مسلم دانشور بھی کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے مشن کی کامیابی کی وجہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا بہترین کردار تھا۔ یعنی اسلام تلوار سے نہیں بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے اعلیٰ کردار سے پھیلا۔ (اس کی تفصیل باب "میثاقِ مدینہ غیر مسلم دانشوروں کی نظر میں" میں صفحہ ۳۵۵ پر گزر چکی ہے)

۳) تاریخ شاہد ہے کہ انصار غزوۂ بدر سے پہلے کسی سریے میں نہیں گئے۔ مہاجرین تعداد میں قلیل اور بے سروسامان تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اُن کی آبادکاری کے لیے متفکر اور کوشاں تھے۔ ایسے میں وہ کمزور لوگ جو طاقتور دشمن کے ظلم وستم سے تنگ آکر ہجرت پر مجبور ہو گئے تھے بھلا اُن کے قافلوں پر کیسے حملہ آور ہو سکتے تھے؟

۴) اگر یہ فرض کر بھی لیا جائے کہ مسلمان دستے قریش کے تجارتی قافلوں پر حملہ آور ہوتے تھے تو اُن کے پاس لوٹ مار کا کثیر مال موجود ہونا چاہیے تھا یعنی بہترین لباس، اسلحہ اور شاندار سواریاں وغیرہ۔ جب کہ اسلام کی سب سے پہلی اور بڑی جنگ غزوۂ بدر میں مسلمانوں کی حالتِ زار ایسی تھی کہ محدود وسائل کی وجہ سے اُن کے پاس اسلحہ، رسد اور سواری کا خاطر خواہ انتظام بھی نہیں تھا۔ اُن کے لشکر میں صرف دو یا تین گھوڑے اور ستر اُونٹ تھے جن پر وہ باری باری سوار ہوتے تھے جب کہ اسلحے میں صرف چھ زِرّہیں اور آٹھ تلواریں تھیں اور اُس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم دُعا فرما رہے تھے، "اے ربِّ عالم! مسلمان پیادہ ہیں، اپنے فضل سے انھیں سوار کر، یہ بھوکے ہیں اِن کو شکم سیری عطا فرما، یہ عریاں ہیں انھیں لباس دے، یہ فقیر ہیں انھیں تونگر کر۔"[1]

---

[1] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۱۱۹

۵) گزشتہ صفحات پر جہاد کے باب میں آیتِ قرآنی کے حوالے سے بیان کیا جا چکا ہے کہ مسلمانوں کو شروع شروع میں جنگ کی اجازت نہیں تھی۔ جب اللہ عزوجل جنگ سے منع فرما رہا تھا تو اُس کے کلمہ گو اُس کی حکم عدولی کی جسارت کیسے کر سکتے تھے؟ کیا تجارتی قافلوں کو روکنا یا اُن پر حملہ آور ہونا جنگ کے لیے اُکسانے یا جنگ کے لیے پہل کرنے کے ضمن میں نہیں آتا؟

۶) قریشِ مکّہ کے لوگ دستوں کی صورت میں مدینہ کے گردونواح میں آ کر لُوٹ مار کیا کرتے تھے جن کے ساتھ مسلمان مہاجرین کا ٹکراؤ البتہ ہوتا رہتا تھا مگر اس میں بھی قابلِ غور نقطہ یہ ہے قریش کی حیثیت لٹیروں کی ہوتی تھی اور مسلمانوں کی محافظوں کی۔

پس ان مختصر دلائل کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ قریش کے تجارتی قافلوں کو روکنے یا اُن پر حملہ آور ہونے کی روایات درست نہیں ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قریش کی نقل و حرکت پر نظر رکھنے کے لیے یا اُن قافلوں کے ساتھ سفر کرنے والے شر پسند عناصر کی ممکنہ سازشوں سے آگاہ رہنے کے لیے مختلف مواقع پر مسلمانوں کو روانہ کیا ہو کیونکہ اُن کی طرف سے کسی بھی قسم کی تخریبی کاروائی اور حملے کا امکان تو بہر حال تھا۔

سریۂ رابغ یا سریۂ عبیدہ بن حارث رضی اللہ عنہ

(شوال ۱ ہجری/ اپریل ۶۲۳ء)

شوال ۱ ہجری/ اپریل ۶۲۳ء میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عبیدہ بن حارث رضی اللہ عنہ کو اسّی مہاجرین کے ایک دستے کے ساتھ ''رابغ'' روانہ کیا۔ اس لیے اس کو ''سریۂ رابغ'' اور حضرت عبیدہ بن حارث رضی اللہ عنہ کی وجہ سے ''سریۂ عبیدہ بن حارث'' کہا جاتا ہے۔ مؤرّخین نے اسے دوسرا سریہ لکھا ہے۔ دوسو افراد پر مشتمل قریش کا ایک قافلہ ابوجہل اور ابوسفیان کی قیادت میں ''ثنیّۃ المرۃ'' سے گزر رہا تھا کہ اُس کا سامنا حضرت عبیدہ رضی اللہ عنہ کے دستے سے ہو گیا۔ مسلمان مجاہدین نے قافلے پر حملہ نہیں کیا اور واپس چلے آئے۔ [۱]

---

[۱] ڈاکٹر نصیر احمد ناصر، کتاب: پیغمبر اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ص ۴۴۲

حضرت عائشہؓ کی رخصتی

(شوال ۱ ہجری، اپریل ۶۲۳ ء)

حضرت عائشہؓ کی رخصتی شوال ۱ ہجری، اپریل ۶۲۳ ء کو مدینہ منوّرہ میں ہوئی۔ [۱]

حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ حضور ﷺ کے پاس انصار کے مرد وزن کی ایک جماعت حلقہ بنائے بیٹھی تھی کہ میری والدہ مجھے لے کر آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ یہ آپ ﷺ کی زوجہ ہیں۔ [۲] واضح رہے کہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ اُمّ المومنین حضرت عائشہؓ کا نکاح شوال ۳ قبل ہجرت/ مارچ ۶۱۹ ء میں ہو چکا تھا۔

سریۂ خرّار یا سریۂ سعد بن ابی وقاص

(ذیقعدہ ۱ ہجری/مئی ۶۲۳ ء)

ذیقعدہ ۱ ہجری/مئی ۶۲۳ ء میں نبی اکرم ﷺ نے سعد بن ابی وقاص کو بیس سواروں کا ایک دستہ دے کر مدینہ کے جنوب مغرب میں وادی خرّار کی طرف روانہ کیا۔ خرّار پتھروں کی ایک وادی ہے جو جحفہ کے قریب واقع ہے۔ اس سریے میں بھی مسلمانوں کا دستہ بغیر لڑے واپس آ گیا تھا۔ [۳] یہ مسلمانوں کی تیسری مہم تھی۔ اس لشکر کے لیے بھی سفید علم تیار کیا گیا تھا جو حضرت مقداد رضی اللہ عنہ نے اُٹھا رکھا تھا۔

---

[۱] ڈاکٹر نصیر احمد ناصر، کتاب: پیغمبر اعظم و آخر ﷺ، ص ۴۴۳

[۲] شیخ عبد الحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۱۰۲

[۳] محمد ابن سعد (متوفی ۲۳۰ ہجری)، طبقات ابن سعد، ج ۲ ص ۹۰۶

ابن ہشام (متوفی ۸۳۳ ء)، سیرت ابن ہشام، ج ۱ ص ۶۵۰

سنہ ۲ ہجری

غزوۂ ودّان اور غزوۂ ابوا

(ماہِ صفر ۲ ہجری/ اگست ۶۲۳ء)

یہ پہلی مہم تھی جس کی قیادت رسول اللہ ﷺ نے خود فرمائی۔ [۱] ہجرت کے پہلے سال کے آخر میں یا دوسرے کے آغاز میں ماہِ صفر یعنی اگست ۶۲۳ء میں آپ ﷺ نے مدینہ کی ذمہ داری حضرت سعد بن عبادہؓ کو سونپی اور ستر صحابہ کرامؓ کی ایک جماعت کے ساتھ قریش کے ایک قبیلے بنی ضمیرہ کی طرف روانہ ہوئے۔ آپ ﷺ پہلے ''ودّان'' پہنچے پھر ''ابوا'' تشریف لے گئے۔ یہ دونوں مقام ضلع ''فرع'' میں ایک دوسرے سے تقریباً آٹھ میل کے فاصلے پر واقع ہیں اس لیے اس غزوہ کو تاریخ میں دونوں ناموں یعنی ''غزوۂ ودّان'' اور ''غزوۂ ابوا'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ''ابوا'' تجارتی شاہراہ پر واقع ایک اہم مقام تھا جہاں کارواں ٹھہرا کرتے تھے اس لیے یہ غزوہ ابوا کے نام سے زیادہ مشہور ہے۔ ابوا کی ایک وجہ شہرت یہ بھی ہے کہ اس مقام پر رسولِ اکرم ﷺ کی والدہ ماجدہ سیّدہ آمنہ علیہا السلام نے وفات پائی اور مدفون ہوئیں۔ اس غزوے میں حضرت حمزہ بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ علمبردار تھے۔

رسول اللہ ﷺ ابوا پہنچے تو قبیلہ بنی ضمیرہ کا سردار مخشی بن عمرو ضمیری ایک معاہدہ کرنے پر آمادہ ہوگیا چنانچہ آپ ﷺ بھی راضی ہوگئے، کوئی جنگ نہیں ہوئی اور صلح نامہ لکھا گیا۔ [۲]

اُس صلح نامے کا مضمون کچھ یوں تھا:

۱۔ اللہ رحمٰن الرحیم کے نام سے۔

---

[۱] صحیح بخاری، کتاب المغازی، باب العُشیرہ

[۲] محمد ابن سعد (متوفی ۲۳۰ ہجری)، طبقات ابن سعد ۲:۲

محمد حمید اللہ، رسولِ اکرم ﷺ کی سیاسی زندگی، ص ۳۵۸

۲۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانب سے بنی ضمرہ کے لیے یہ ایک تحریر ہے۔

۳۔ بنی ضمرہ کو جان و مال کی امان ہے۔

۴۔ اور جو کوئی ان پر ظلم سے اچانک حملہ کرے گا تو اُس کے مقابلے میں ان کی مدد کی جائے گی۔

۵۔ ان پر ضروری ہے کہ یہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدد اُس وقت تک کریں جب تک سمندر صدف کو گیلا کرتا رہے گا سوائے اس کے کہ اللہ کے دِین کے بارے میں لڑیں (یا ان سے جنگ کی جائے)۔

۶۔ اس بارے میں ان پر اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ذمہ ہے۔

۷۔ انھیں مدد اس شرط پر دی جائے گی کہ یہ وعدہ وفا کرتے رہیں اور عہد شکنی و بے وفائی وغیرہ سے بچتے رہیں۔

غزوۂ ابواء کے واقعے سے یہ حقیقت آشکار ہوتی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیش قدمی کا مقصد دشمن کا کشت و خون کرنا ہرگز نہیں ہوتا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسلام کی ترویج و اشاعت کے لیے قدم اُٹھاتے تھے اور اگر کوئی دشمن قبیلہ قبولِ اسلام کی بجائے کسی معاہدے پر ہی آمادہ ہو جاتا تھا تو بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنا دامنِ رحمت وا کرتے ہوئے امن کو ترجیح دیتے تھے۔ زیادہ تر غزوات و سریات میں اِسی وجہ سے کوئی کشت و خون نہیں ہُوا۔

غزوۂ بواط

(ربیع الاوّل یا ربیع الثانی ۲ ہجری/ اکتوبر ۶۲۳ء)

روایت ہے کہ ہجرت کے تیرہویں مہینے، ربیع الاوّل یا ربیع الثانی ۲ ہجری/ اکتوبر ۶۲۳ء میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک سو یا دو سو اصحاب کے ساتھ ''بواط'' کی طرف دشمنِ اسلام اُمیّہ بن خلف کی سرکوبی کے لیے عازمِ سفر ہوئے۔ اُمیّہ بن خلف کے ساتھ اُس وقت قریش کے سو آدمی تھے۔[1] اُسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیش قدمی کی خبر ہوئی تو وہ فرار ہو گیا۔

---

[1] جمال الدین محدث، روضۃ الاحباب

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے بواط تک اُس کا تعاقب کیا اسی نسبت سے اس غزوے کو غزوۂ بواط کہا جاتا ہے۔ بقولے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اس غزوے کے لیے تشریف لے جاتے ہوئے مدینہ کی ذمہ داریاں حضرت سائب بن عثمان بن مظعون کو سونپیں۔ [۱]

غزوۂ سفوان/غزوۂ بدر اُولیٰ
یا غزوۂ طلبِ کرز بن جابر فہری
(ربیع الثانی ۲ ہجری/اکتوبر ۶۲۳ء)

ربیع الثانی ۲ ہجری/اکتوبر ۶۲۳ء میں یہ غزوہ وادی سفوان میں ہُوا اس لیے اسے غزوۂ سفوان کہتے ہیں۔ وادی سفوان، بدر کے نواح میں واقع ہے اس حوالے سے اسے غزوۂ بدر اولیٰ بھی کہا جاتا ہے۔ ''روضتہ الاحباب'' میں اس غزوے کا نام ''غزوۂ طلبِ کرز بن جابر فہری'' بھی آیا ہے، ''مواہب'' میں اسے غزوۂ بدر اولیٰ کہا گیا ہے۔

روایت ہے کہ مکّہ کا ایک رئیس کرز بن جابر فہری ایک فوجی دستہ لے کر مدینہ کے مضافات میں مسلمانوں کی سرکاری چراگاہ پر حملہ آور ہُوا اور کئی جانور ہانک کر لے گیا۔ اُن جانوروں میں رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے اُونٹ بھی تھے۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو خبر ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے حضرت زید بن حارثہؓ کو مدینہ کا عامل مقرر کیا اور ستر صحابہؓ کی ایک جماعت لے کر کرز بن جابر فہری کے تعاقب میں روانہ ہوئے۔ اس مہم میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے علم امیر المومنین حضرت علی علیہ السّلام کے ہاتھ میں دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم وادئ سفوان پہنچے تو معلوم ہُوا کہ کرز بن جابر فہری یہاں سے نکل چکا ہے چنانچہ وہ ہاتھ نہ آسکا [۲] اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم واپس تشریف لے آئے۔

---

[۱] شیخ عبدالحق محدث دہلوی، (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲، ص ۱۱۵

[۲] ابن خلدون، تاریخ ابن خلدون۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی، (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۱۱۶

غزوۂ عُشیرہ

(جمادی الاوّل یا جمادی الثانی ۲ ہجری/نومبر، دسمبر ۶۲۳ء)

جمادی الاوّل یا جمادی الثانی ۲ ہجری/نومبر، دسمبر ۶۲۳ء میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم، حضرت ابوسلمہ بن عبدالاسد مخزومی رضی اللہ عنہ کو مدینہ کا عامل بنا کر ڈیڑھ سو مہاجرین کے ساتھ اور بروایتے دوسو کے ساتھ مدینہ طیبہ سے باہر تشریف لائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے سفید علم حضرت حمزہ بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ کے سپرد فرمایا اور ''عشیرہ'' کی طرف روانہ ہوئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے عشیرہ کے قبیلوں کو دعوتِ اسلام دینے اور دفاعی معاہدے کرنے کے لیے وہاں چند روز قیام فرمایا اور پھر بنی مدلج سے ایک دفاعی معاہدہ کیا اور واپس تشریف لے آئے۔[1] یہ معاہدہ بھی اُن ہی شرائط پر ہُوا جن پر بنو ضمرہ کے ساتھ معاہدہ ہُوا تھا۔ بنی مدلج مسلمانوں کے حلیف قبیلے بنوضمرہ کے دوست تھے۔

حضرت علی علیہ السلام کی کنیت ابوتراب کی وجہ

''روضۃ الاحباب'' اور ''معارج النبوۃ'' میں مذکور ہے کہ غزوۂ عشیرہ کے سفر میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہٗ کو ''ابوتراب'' کے نام سے نوازا۔ یہ نام بعد میں اُن کی کنیت کے طور پر مشہور ہوگیا۔ حضرت عمار یاسر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں اور حضرت علی مرتضیٰ علیہ السلام غزوۂ عشیرہ میں کھجور کے ایک درخت کے نیچے سو رہے تھے اور زمین پر لیٹنے کی وجہ سے ہمارے جسموں پر مٹی لگ گئی تھی۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہمارے سرہانے تشریف لائے اور ہمیں جگایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے علی المرتضیٰ علیہ السلام (کے بدن پر مٹی لگی دیکھ کر اُنھیں) ''یا ابوتراب!'' کہہ کر مخاطب کیا اور فرمایا، ''اے علی (علیہ السلام)! کیا میں تمھیں اس کی خبر نہ کروں کہ تمام

---

[1] شیخ عبدالحق محدث دہلوی، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۱۱۵ بحوالہ روضۃ الاحباب و معارج النبوۃ

لوگوں میں بد بخت کون ہے؟'' حضرت علی مرتضیٰ علیہ السلام نے عرض کیا، ''یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! ضرور خبر کیجیے۔'' حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، ''تمام لوگوں میں دو شخص سب سے زیادہ بد بخت ہیں، ایک وہ جس نے حضرت صالح علیہ السلام کی اُونٹنی کی کونچیں کاٹیں اور دوسرا جو تمھارے محاسن (یعنی داڑھی) کو گلگوں کرے گا اور خون سے رنگے گا۔'' حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ فرماتے جاتے اور اپنے دستِ مبارک سے حضرت علی علیہ السلام کے سر اور چہرے سے گرد جھاڑتے جاتے تھے۔

یہ روایت مندرجہ بالا دونوں کتابوں میں اسی طرح مذکور ہے لیکن مشہور واقعہ جسے بخاری و مسلم نے حضرت سہل بن سعد ساعدیؓ سے نقل کیا ہے یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت علی مرتضیٰ علیہ السلام کے گھر سیّدہ فاطمہ علیہا السلام کے پاس تشریف لائے۔ علی علیہ السلام آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آمد سے قبل گھر سے باہر تشریف لے جا کر مسجد میں سو گئے تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سیّدہ فاطمہ علیہا السلام سے فرمایا کہ تمھارے ابنِ عم (یعنی علی علیہ السلام) کہاں ہیں؟ (اہلِ عرب کی عادت ہے کہ وہ شوہر وغیرہ کہنے کی بجائے اسی طرح کہتے ہیں) سیّدہ فاطمہ علیہا السلام نے عرض کیا کہ وہ باہر چلے گئے ہیں۔ اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کسی سے فرمایا کہ دیکھو وہ کہاں ہیں؟ اُس شخص نے آکر بتایا کہ علی (علیہ السلام) مسجد میں آرام کر رہے ہیں۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسجد میں اُن کے سرہانے تشریف لائے اور اُن کو پہلو کے بل سوتے ہوئے ملاحظہ فرمایا۔ اُن کے پہلو پر نشانات پڑے ہوئے تھے اور جسمِ اطہر پر مٹی لگی ہوئی تھی۔ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، ''قم ابا تراب!'' (ابو تراب اٹھو!)۔ اُس روز سے اُن کی کنیت ابو تراب ہوگئی۔ علی علیہ السلام حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رکھی ہوئی یہ کنیت اپنی اصل کنیت ابوالحسن کے مقابلے میں بہت محبوب اور گرامی جانتے تھے۔ اُن کے مخالفین و معاندین اس کنیت کو بغرضِ تنقیص وتحقیر بولتے تھے حال آنکہ اس میں اُن کی کمال تعظیم و تکریم ہے۔[۱]

---

[۱] جمال الدین محدث، روضۃ الاحباب۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۱۱۵، ۱۱۶

سریہ دارِارقم

(سنہ ۲ ہجری)

روایت ہے کہ قریش کی ایک مسلح جماعت مسلمانوں کے خلاف کسی مہم پر مکّہ سے نکلی تھی۔ اُس کا سردار بقولے ابوسفیان بن حرب اور ایک قول کے مطابق عکرمہ بن ابوجہل تھا۔ حضوراکرم صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کو معلوم ہُوا تو آپ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے ساٹھ مہاجرین کا ایک دستہ حضرت عبید بن حارث بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں اُس جماعت کی سرکوبی کے لیے ''دارِارقم'' کی جانب روانہ کیا۔ قریش کی اُس جماعت سے سامنا ہُوا تو مسلمانوں نے اُن کو بھگانے کے لیے کچھ تیر ہوا میں چھوڑے چنانچہ وہ میدان چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ مسلمانوں نے اُن کا پیچھا نہیں کیا اور مدینہ لوٹ آئے۔[۱]

عَلم

احادیث میں لواء یعنی علم کا ذِکر آیا ہے۔ علم اُس جھنڈے کو کہتے ہیں جو جنگوں میں کھڑا کیا جاتا ہے اور اس سے سپہ سالار کے مقام کا پتا چلتا ہے۔ بسا اوقات علم کو مقدمۃ الجیش اُٹھاتا ہے۔ اہلِ لُغت کی ایک جماعت نے صراحت کی ہے کہ ''لواء'' اور ''رایۃ'' ہم معنی ہیں۔ بعض کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ''لواء'' چھوٹے جھنڈے کو اور ''رایۃ'' بڑے جھنڈے کو کہتے ہیں۔ مسند امام احمد اور ترمذی میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے ایک حدیث مروی ہے کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کا ''رایۃ'' سیاہ اور ''لواء'' سفید تھا۔ طبرانی کے نزدیک بھی حضرت بریدہ سے ایسا ہی مروی ہے۔ ابن عدی کے نزدیک حضرت ابوہریرہ سے اتنا زیادہ مروی ہے کہ اُس پر لکھا ہُوا تھا ''لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ''[۲]

---

[۱] شیخ عبدالحق محدث دہلوی، (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۱۱۳

[۲] شیخ عبدالحق محدث دہلوی، (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۱۱۴

سب سے پہلا عَلم

سریۂ دارِارقم کے لیے ایک سفید علم تیار کیا گیا تھا جسے مسطح بن اثاثہ بن عباد بن مُطلب بن عبد مناف قرشی نے اُٹھایا تھا۔ بروایتے سب سے پہلا علم جو لشکرِ اسلام کے لیے تیار ہُوا وہی تھا۔[۱] مندرجہ بالا قول سے لگتا ہے کہ یہ سریہ غزوۂ ابواء سے پہلے ہُوا کیونکہ غزوۂ ابوا میں بھی علم تھا جسے حضرت حمزہ بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ نے اُٹھا رکھا تھا۔

ایک روایات میں یہ بھی آیا ہے کہ پہلا علم سریۂ حضرت حمزہ بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ میں تھا جس کا ذِکر اُوپر گذر چکا ہے جب کہ ابن اسحٰق اور ابوالاسود نے عروہ سے نقل کیا ہے کہ سب سے پہلا علم غزوۂ خیبر میں تیار کیا گیا تھا۔[۲]

سریۂ عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ یا سریۂ نخلہ

(رجب ۲ ہجری/ جنوری ۶۲۴ء)

مؤرّخین لکھتے ہیں کہ سریۂ عبداللہ بن جحش جسے سریۂ نخلہ بھی کہتے ہیں رجب ۲ ہجری (جنوری ۶۲۴ء) میں واقع ہُوا۔ یہ سریہ حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ سے منسوب ہے جو کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے پھوپھی زاد بھائی اور اُمّ المومنین حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کے بھائی تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اُن کو آٹھ اور بقولے بارہ افراد کے ساتھ جن میں سعد بن ابی وقاص، عکاشہ بن محصن، عتبہ بن غزوان اور واقد بن عبداللہ تمیمی وغیرہ شامل تھے، نخلہ کی مہم پر روانہ فرمایا۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے حضرت عبداللہ بن جحش کو روانہ کرتے وقت ایک بند لفافہ دیا اور فرمایا کہ دو دن بعد اسے کھول کر پڑھنا اور اس میں دی گئی ہدایات پر عمل کرنا۔ دو دن بعد حضرت

---

[۱] سید امیر جمال الدین عطاء اللہ، روضۃ الاحباب

[۲] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۱۱۳، ۱۱۴

عبداللہ بن جحش ؓ نے اُس خط کو پڑھا۔ خط میں لکھا تھا کہ اے عبداللہ! خدائے عَزَّ اِسْمُہٗ کے نام اور اُس کی برکت کے ساتھ اپنے ساتھیوں کو لے کر اُس جگہ تک جاؤ جس کا نام ''بطن نخلہ'' ہے اور وہاں قیام کرو۔ تم پر لازم ہے کہ کسی کو اپنے ساتھ جبراً نہ لے جانا، جو جانا چاہے جائے اور جو نہ جانا چاہے لوٹ آئے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن جحش ؓ حسبِ فرمان بطن نخلہ کی جانب روانہ ہوئے۔ مروی ہے کہ اُن کے ساتھیوں میں سے سعد بن ابی وقاص اور عتبہ بن غزوان کہنے لگے کہ ہمارا اُونٹ جس پر ہم دونوں سوار ہوتے تھے گم ہو گیا ہے اور ہم اُسے تلاش کرنا چاہتے ہیں۔ پس وہ دونوں اُونٹ کو تلاش کرنے نکل گئے اور پیچھے رہ گئے۔ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے خط میں یہ واضح ہدایت کہ ''اور تم پر لازم ہے کہ کسی کو اپنے ساتھ جبراً نہ لے جانا، جو جانا چاہے جائے اور جو نہ جانا چاہے لوٹ آئے۔'' کیا اِنہی دو اصحاب سعد بن ابی وقاص اور عتبہ بن غزوان کے بارے میں تھی؟ کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پہلے سے یہ جانتے تھے کہ یہ دونوں اصحاب حضرت عبداللہ بن جحش کے ساتھ مہم پر نہیں جائیں گے؟) پس حضرت عبداللہ ؓ بطن نخلہ پہنچے جہاں اُن کا ٹکراؤ عمرو بن حضرمی، حکم بن کیسان، عثمان بن عبداللہ اور اس کے بھائی نوفل بن عبداللہ مخزومی سے ہُوا۔ بروایتے اُس دن رجب کی پہلی تاریخ تھی مگر مسلمانوں کو یہ شبہ ہُوا کہ یہ جمادی الآخر کی آخری تاریخ ہے۔[۱]

چنانچہ اُنھوں نے جلدی کی کہ مبادا ماہ رجب شروع ہو جائے اور اُس ماہِ حرام کی بے حرمتی ہو، اور فوراً اُن پر حملہ کر دیا۔ (حرمت والے مہینے یعنی جن میں جنگ وجدال حرام تھا چار تھے، محرم، رَجب، ذوالقعدہ اور ذوالحجہ)۔[۲]

واقد بن تمیمی نے عمرو بن حضرمی پر ایک تیر چلایا جس سے وہ ہلاک ہو گیا۔ حکم بن کیسان اور عثمان بن عبداللہ کو گرفتار کر لیا گیا۔ باقی کفّار بھاگ کھڑے ہوئے۔

---

[۱] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۱۱۶، ۱۱۷

[۲] محمد بن اسماعیل بخاری، صحیح بخاری کتاب المغازی، باب حجۃ الوداع، حدیث ۴۴۰۶

حضرت عبداللہ بن جحشؓ اُن قیدیوں کو بارگاہِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم میں لائے۔ جب مشرکین اور یہود کو اس واقعے کی خبر ہوئی تو اُنھوں نے طعنہ زنی شروع کردی اور کہنے لگے کہ مسلمانوں نے ماہِ حرام کی بے حرمتی کی اور خون بہایا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے حضرت عبداللہ بن جحشؓ سے فرمایا کہ کیا میں نے تمھیں خبردار نہیں کیا تھا کہ ماہِ حرام میں قتال نہ کرنا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے تنبیہ فرمائی اور اُن کے ساتھیوں پر بھی ناراضی کا اظہار کیا چنانچہ حضرت عبداللہ اور اُن کے ساتھی پریشان و غمزدہ ہوگئے اور اپنے کیے پر پشیمان ہوئے۔ ہر چند کہ اُنھیں اس میں اشتباہ لاحق ہُوا تھا پھر بھی وہ ڈر رہے تھے کہ اللہ کی طرف سے اُن پر کہیں غضب نازل نہ ہو مگر ساتھ ہی یہ اُمید بھی تھی کہ حق تعالیٰ اُن کی توبہ کو قبول فرما کر درگذر فرمادے۔ بروایتے اس موقع پر سورۃ البقرہ کی یہ آیت کریمہ نازل ہوئی: يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ ۭ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ ۭ وَصَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَكُفْرٌۢ بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۤ وَاِخْرَاجُ اَھْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ ۭ[1] (اے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم!) لوگ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) سے حُرمت والے مہینے میں جنگ کرنے سے متعلق سوال کرتے ہیں۔ کہہ دیجیے اس میں جنگ کرنا بڑا جرم ہے (مگر) خدا کی راہ سے روکنا، اور اُس کا انکار کرنا اور مسجد (کی حرمت) کا انکار کرنا (اور لوگوں کو اس سے روکنا) اور اُس کے باشندوں کو وہاں سے نکالنا، خدا کے نزدیک اِس (جنگ) سے بھی بڑا جرم ہے۔ اور فتنہ گری قتل سے بھی زیادہ سنگین گناہ ہے)

اس کے بعد حضرت عبداللہ بن جحش کے دِل سے غم کا بوجھ اُتر گیا اور اُن کے ساتھیوں نے خوشی و مسرت کا اظہار کیا۔

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّاٰلِ مُحَمَّدٍ ○

[1] سورۃ البقرہ، آیت ۲۱۷

تحویل خانہ کعبہ

(شعبان سنہ ۲ ہجری/جنوری،فروری ۶۲۴ء)

شعبان، سنہ ۲ ہجری (جنوری، فروری ۶۲۴ء) میں قبلہ کا رُخ تبدیل کر کے بیتُ المَقدِس سے خانہ کعبہ کی طرف کر دیا گیا۔ یہ تبدیلی دورانِ نماز میں ہوئی تھی اور صرف حضرت علی علیہ السلام نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیروی کرتے ہوئے اپنا رُخ خانہ کعبہ کی طرف تبدیل کیا۔ حضرت علی علیہ السلام فرمایا کرتے تھے، ''اَنَا مُصَلِّی الْقِبْلَتَین'' یعنی میں وہ ہوں جس نے (بیک وقت) دو قبلوں کی طرف نماز پڑھی۔[1]

حضرت رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مدینہ طیّبہ میں تشریف لانے کے بعد سولہ یا سترہ ماہ تک بیتُ المَقدِس کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھی جاتی رہی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قبلہ خانہ کعبہ تھا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خواہش تھی کہ خانہ کعبہ ہی مسلمانوں کا قبلہ ہو اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اِس کے لیے وحیِ الٰہی کے منتظر رہتے تھے۔[2] چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تمنا پوری فرمائی اور بقولے نمازِ ظہر کے دوران میں یا بروایتے نمازِ عصر کے دوران میں،[3] یعنی عین حالتِ نماز میں جبرائیل علیہ السلام یہ آیت لے کر نازل ہوئے:[4]

''قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا ۪ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ'' (اے محبوب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! بے شک ہم نے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو آسمان کی جانب اپنا چہرہ بار بار کرتے دیکھا تو ضرور ہم اُسی قبلہ کی طرف آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو پھیر دیں گے جس سے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) راضی ہیں تو (اے محبوب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! اپنا رُخ مسجد حرام کی جانب پھیر لیجیے۔)

---

[1] علامہ نجم الحسن کراروی (متوفی ۱۹۸۲ء)، چودہ ستارے، ص ۶۵

[2] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۱۰۷

[3] صحیح بخاری حدیث ۴۴۸۶، ۷۲۵۲، جمال الدین محدث، روضۃ الاحباب

[4] سورۃ البقرہ، آیت ۱۴۴

اِدھر حکمِ الٰہی ہُوا اُدھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حالتِ نماز میں ہی اپنا رُخ بیتُ المقدِس سے خانہ کعبہ کی طرف موڑ لیا اور اِس طرح خانہ کعبہ مسلمانوں کا قبلہ قرار پایا۔ چنانچہ ہر مسلمان چاہے وہ کسی بھی خطۂ ارض پر موجود ہو اُسی کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھتا ہے۔ یہاں یہ سوال اہم اور دلچسپ ہوگا کہ اگر کوئی مسلمان چاند یا کسی اور سیارے پر موجود ہو تو وہ کس طرف رُخ کر کے نماز پڑھے گا؟

علما کا کہنا ہے کہ وہ زمین کی طرف رُخ کرے گا کیونکہ خانہ کعبہ زمین پر موجود ہے۔ واضح ہو کہ چاند اور دیگر سیاروں سے زمین اُسی طرح دکھائی دیتی ہے جس طرح زمین سے وہ نظر آتے ہیں۔

تحویل کعبہ کا واقعہ جس مسجد میں پیش آیا اُسے ''مَسْجِدِ قِبْلَتَیْن'' یعنی دو قبلوں والی مسجد کہتے ہیں۔ یہ مسجد بئر رومہ کے قریب مدینہ طیّبہ کے محلہ بنوسلمہ میں واقع ہے۔ مسجد کی نئی عمارت کی دو منزلیں ہیں جب کہ میناروں اور گنبدوں کی تعداد بھی دو، دو ہے۔ مسجد کا مجموعی رقبہ ۳۹۲۰ مربع میٹر ہے۔ اِس مسجد میں دو محراب ہیں، ایک حقیقی محراب ہے جس کا رُخ خانہ کعبہ کی طرف ہے جب کہ بیتُ المقدِس کی سمت والے محراب کی علامت بنائی گئی ہے جو مسجد کے داخلی دروازے کے اُوپر واقع ہے۔

روزہ

(شعبان دو ہجری/فروری ۶۲۴ء)

جنگ بدر سے پہلے، شعبان دو ہجری (فروری ۶۲۴ء) میں روزہ فرض کیا گیا۔ پس ارشادِ پروردگار ہُوا، ''یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَیْكُمُ الصِّیَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴿۱۸۳﴾'' (اے ایمان والو! روزہ اس طرح تم پر لکھ دیا گیا ہے (فرض کر دیا گیا ہے) جس طرح تم سے پہلے والوں پر لکھ دیا گیا تھا تاکہ تم پرہیزگار بن جاؤ)۔[۱]

---

[۱] سورۃ البقرہ، آیت نمبر ۱۸۳

غزوۂ بدر

(۱۷ یا ۱۹ رمضان المبارک/ ۱۳ یا ۱۵ مارچ ۶۲۴ء)

یہ غزوہ، بدر کے مقام پر ہجرتِ نبوی کے اُنیس ماہ بعد ۱۷ یا ۱۹ رمضان المبارک بمطابق ۱۳ یا ۱۵ مارچ سنہ ۶۲۴ء کو [۱] اور ایک قول کے مطابق ۱۲ تا ۱۷ رمضان المبارک بمطابق ۸ مارچ تا ۱۳ مارچ سنہ ۶۲۴ء کو وقوع میں آیا۔ [۲]

اس کو ''غزوۂ بدر کبریٰ'' اور ''غزوۂ بدر عظمیٰ'' بھی کہتے ہیں۔ یہ غزوہ چونکہ رمضان المبارک میں ہُوا چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اُس سال ''اعتکاف'' نہ فرما سکے جس کے بدلے اگلے سال آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بیس دن کا اعتکاف کیا، دس دن اِس سال کے اور دس گزشتہ سال کی قضا کے طور پر۔ [۳]

بروایتے ''بدر'' کا نام، بدر بن مخلد نضر بن کنانہ کے نام پر رکھا گیا تھا کیونکہ اُس نے وہاں قیام کیا تھا۔ ایک روایت کے مطابق وہاں پر ایک بوڑھا شخص عرصۂ دراز سے مقیم تھا جس کا نام بدر تھا اور یہ بستی اُسی کے نام سے موسوم ہے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اس بستی کا نام بدر بن حارث کے نام پر مشہور ہُوا جس نے وہاں ایک کنواں کھودا تھا۔ [۴]

غزوۂ بدر کا پس منظر

غزواتِ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں سے یہ غزوہ بہت اہم اور عظیم تھا کیوں کہ اس میں پہلی مرتبہ با قاعدہ ایک منظم طریقے سے کفّار کی فوج اور چند مسلمان مجاہدین جنگ کے لیے ایک دوسرے کے

---

[۱] علامہ علی نقی، تاریخ اسلام، ص ۱۷۲ بحوالہ سید محسن امین عاملی (متوفی ۱۹۵۳ء)، اعیان الشیعہ، ج ۲ ص ۱۵۲

[۲] ڈاکٹر نصیر احمد ناصر، کتاب: پیغمبر اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ص ۴۶۱

[۳] فقہ الرضا علیہ السلام، مطبوعہ طہران، ص ۲۱

[۴] شیخ عبد الحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۱۱۸

آمنے سامنے صف آرا ہو رہے تھے۔ کفّار عرصۂ دراز سے اس جنگ کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ اُنھوں نے اپنے سارے وسائل اس میں جھونک دیے تھے اور وہ مسلمانوں کا قلع قمع کرنے کے لیے پوری طرح کمر بستہ تھے۔ یہ جنگ مسلمانوں کی ہلاکت و بربادی اور تحریکِ اسلام کے استیصال (جڑ سے اُکھاڑنا) کا سبب بھی بن سکتی تھی اس لیے اس میں فتح یاب ہونا ازبس ضروری تھا۔ چنانچہ گھمسان کا رَن پڑا اور ربُّ الافواج نے اپنے جسمانی طور پر کمزور اور ایمانی طور پر مضبوط بندوں کو طاقتور مشرکوں پر فتح و نصرت عطا فرمائی، عزت و بزرگی سے سرفراز کیا اور فرمایا:

وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ ۚ [1]

(بے شک بدر میں اللہ تمھاری مدد کر چکا تھا حال آنکہ تم (اُس وقت) بہت کمزور تھے)

اس غزوہ کے دن کو ''یوم الفرقان'' بھی کہتے ہیں کیونکہ اس دن حق و باطل کے درمیان فرق و امتیاز واضح ہُوا تھا۔

مسلمان اگرچہ مکّہ سے ہجرت کر کے مدینہ چلے آئے تھے لیکن کفّارِ مکّہ ابھی تک اُنھیں اپنا مجرم سمجھتے ہوئے اُن کے تعاقب میں تھے۔ وہ اس تاک میں تھے کہ کب موقع ملے تو مسلمانوں پر ایک کاری ضرب لگائیں، ایسی ضرب جس سے مسلمان اور اُن کا دِین دونوں نابود ہو جائیں۔ اس مقصد کے لیے اُنھوں نے متحد ہو کر ایک بہت بڑی جنگ کی تیاریاں شروع کر دیں اور جنگ کے لیے اسلحہ اور دیگر ساز و سامان حاصل کرنے کے لیے کثیر سرمایہ بھی جمع کیا۔

قافلہ

مؤرّخین لکھتے ہیں تمام کافروں نے سرمایہ جمع کرنے کی مہم میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا حتیٰ کہ خواتین نے اپنے طلائی زیورات تک جنگ کے فنڈ میں جمع کرا دیے۔ جمع شدہ مال میں خوب اضافہ کرنے کی خاطر اُسے تجارت میں لگانے کا منصوبہ بنایا گیا چنانچہ ابوسفیان اُس مال سے

---

[1] سورۃ آلِ عمران، آیت ۱۲۳

تیار کیا گیا ایک بہت بڑا تجارتی قافلہ لے کر شام روانہ ہُوا۔ مؤرّخین کے اندازے کے مطابق قافلے میں پچاس ہزار سُرخ دینار (سونے کی اشرفیاں) کی مالیّت کا تجارتی سامان تھا۔ اتنی بڑی مالیّت کے تجارتی سامان کے ساتھ سفر کرتے ہوئے ابوسفیان خوفزدہ تھا کہ میرے ساتھ تو محافظ بھی صرف تیس چالیس ہیں، کہیں راہزنی کی کوئی واردات ہی نہ ہوجائے۔ چنانچہ وہ پھونک پھونک کر آگے بڑھ رہا تھا۔ واپسی پر بدر کے ایک کنویں پر اُس کی ملاقات اپنے ایک دوست مجدی بن عمرو جہنی سے ہوئی۔ مجدی علاقے کا سردار تھا، ابوسفیان نے اُس سے معلومات حاصل کرتے ہوئے پوچھا کہ تم نے آس پاس اجنبی یا مشکوک لوگ تو نہیں دیکھے؟ مجدی نے بتایا کہ ابھی کچھ دیر پہلے اس کنویں پر دو اجنبی آئے تو تھے۔ ابوسفیان نے کنویں کی طرف نگاہ دوڑائی تو اُسے اُونٹ کی تازہ مینگنیاں نظر آئیں۔ وہ فوراً اُن کی طرف لپکا اور اُنھیں توڑ کر اُن کا جائزہ لینے لگا۔ عرب کے لوگ قیافہ شناسی میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے، سواری کے پاؤں کے نشان اور مینگنیوں کو دیکھ کر سواری اور اُس کے سوار کے متعلق قیاس کرنا اُن کے لیے ایک عام سی بات تھی اس لیے وہ بھانپ گیا کہ آنے والوں کا تعلق مدینہ سے تھا۔ وہ اِس وہم میں مبتلا ہوگیا کہ مسلمان اُس کی جاسوسی کر رہے ہیں اور کسی وقت بھی قافلے پر حملہ آور ہوسکتے ہیں۔ پس وہ تیزی سے لوٹا اور قافلے کا رُخ بدر سے موڑ کر ساحلی راستے سے مکّہ کی طرف روانہ ہوگیا۔ ساتھ ہی اُس نے ایک تیز رفتار سوار جس کا نام ضمضم بن عمرو غفاری تھا مکّہ روانہ کر دیا تاکہ وہ مکّہ والوں کو مسلمانوں کے ممکنہ حملے کی خبر کرے اور وہاں سے قافلے کی حفاظت کے لیے کمک روانہ کرے۔

ضمضم نے مکّہ پہنچ کر کفّارِ قریش کو ابوسفیان کا پیغام خوب بڑھا چڑھا کر سنایا۔ بروایتے، اُس نے دہشت پھیلانے کے لیے مکّہ میں داخل ہونے سے پہلے اپنے اُونٹ کی نکیل کاٹ دی، پالانِ شتر اُلٹ دیا، اپنے کپڑے پھاڑ ڈالے اور چیخنا شروع کر دیا کہ اے قریش والو! تمھارا مال جو ابوسفیان کے ساتھ ہے، اُس پر محمد (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) اور اُن کے اصحاب نے حملہ کر دیا ہے، جلدی خبر لو، الغوث! الغوث! (فریاد ہے! فریاد ہے!)۔ اُس کی حالت زار کو دیکھ کر اور چیخ و پکار سُن کر قریش

بدحواس ہو گئے اور فوراً قافلے کی طرف جانے پر تیار ہو گئے۔[1] حال آنکہ حقیقت یہ تھی مسلمانوں نے کبھی کسی قافلے کو نہیں لُوٹا تھا اور نہ ہی اُن کا کوئی ارادہ اُس قافلے پر حملہ آور ہونے کا تھا۔

ابوجہل کہنے لگا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) اور اُن کے ساتھی اس غلط فہمی میں ہیں کہ یہ قافلہ عمرو بن الحضرمی کی جماعت جیسا ہے، خدا کی قسم! ایسا نہیں۔ (اُس کا اشارہ اِسی سال رجب میں ہونے والے سریۂ عبداللہ بن جحش جسے سریۂ نخلہ بھی کہتے ہیں کی طرف تھا جس میں عمرو بن حضرمی مسلمانوں کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔ اس کی تفصیل سریہ عبداللہ بن جحش صفحہ ۳۸۹ پر گذر چکی ہے۔ مؤلف)

مؤرّخین لکھتے ہیں کہ ابوسفیان کے ایلچی نے مکّہ والوں کو مسلمانوں کے ہاتھوں قافلے کی متوقع غارت گری کی خبر اس انداز میں دی کہ مکّہ میں ایک ہیجان پیدا ہو گیا اور قریش غضبناک ہو کر مدینہ پر حملہ کرنے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے۔

میرے خیال میں یوں کہنا زیادہ مناسب ہے کہ قریش تو پہلے ہی مسلمانوں کے ساتھ ایک بڑی جنگ کے لیے کمر بستہ تھے، ابوسفیان کا بلاوا آیا تو فوراً اُٹھ کھڑے ہوئے۔

خواب

مروی ہے کہ ضمضم کے مکّہ پہنچنے سے پہلے ہی حضرت عاتکہ بنت عبدالمطلب نے ایک خواب دیکھا کہ کچھ شتر سوار آئے ہیں اور مقام ابطح پر کھڑے بآوازِ بلند کہہ رہے ہیں کہ اے قریش کے لوگو! جلدی کرو اور اپنی قتل گاہ کی طرف آؤ۔ ابوجہل نے یہ خواب سنا تو حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے کہنے لگا کہ تم میں یہ عورت کب سے ''نبی'' بنی ہے؟ کیا تم اس پر راضی نہیں ہو کہ تمھارے مرد ہی نبوّت کا دعویٰ کریں جو اَب یہ عورت بھی مدعی بن گئی ہے؟ میں تین دن تک انتظار کروں گا، اگر اس خواب کی کوئی تعبیر رونما نہ ہوئی تو میں عرب کے تمام قبیلوں کو لکھ بھیجوں گا کہ بنی ہاشم عرب میں سب سے زیادہ دروغ گو ہیں۔[2]

---

[1] ابوجعفر محمد بن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ ہجری)، تاریخ طبری، ج ۲ ص ۲۷۲

[2] شیخ عبدالحق محدث دہلوی، (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۱۲۰

ایک اور روایت کے مطابق حضرت عاتکہ نے جنگِ بدر سے کچھ دن پہلے خواب میں دیکھا کہ ایک سوار نے کوہ ابوقبیس سے ایک پتھر اُٹھا کر رکنِ کعبہ پر کھینچ مارا، وہ پتھر ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو گیا اور اُس کے ریزے بنو زہرہ کے سوا قریش کے ہر گھر میں جا گرے۔ یہ خواب سُن کر کافروں نے خوب ہنسی اڑائی اور کہنے لگے کہ اب تو بنی ہاشم کی عورتیں بھی نبوّت کرنے لگیں۔ لیکن اس خواب کا نتیجہ وہی نکلا جو خواب میں دکھایا گیا تھا۔[۱]

تاریخ میں ایک خواب ضمضم سے بھی نقل کیا گیا ہے۔ اُس نے کہا کہ جس وقت میں قافلے سے الگ ہو کر مکّہ کی طرف چلا تو میں نے خواب میں دیکھا کہ ایک اُونٹ پر سوار ہوں اور ایک ایسی گھاٹی سے گزر رہا ہوں جو خون سے لبریز ہے۔ چنانچہ بیدار ہُوا تو میں سمجھ گیا کہ قریش کو کسی بڑی مصیبت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ مؤرّخین بیان کرتے ہیں کہ ضمضم کے اس خواب سے بنی ہاشم بہت خوش ہوئے کیونکہ یہ خواب حضرت عاتکہ کے خواب کی شہادت دے رہا تھا۔[۲]

ایسی ایک اور روایت بھی ملتی ہے جس کے مطابق جب قریش کا لشکر جحفہ پہنچا تو جہم بن صلت بن مخزوم بن مطلب بن عبد مناف نے خواب میں دیکھا کہ ایک گھڑ سوار آ رہا ہے جس کے ساتھ ایک اُونٹ بھی ہے اور وہ کہہ رہا ہے کہ عقبہ، شیبہ، ابوالحکم بن ہشام (ابوجہل) اُمیّہ اور فلاں فلاں مارے گئے ہیں۔ پھر اُس نے اپنے اُونٹ کی گردن پر چھری چلائی تو خون کے چھینٹے لشکر کے تمام خیموں پر پڑے۔ اُونٹ ذبح کر کے وہ شخص چلا گیا۔ یہ خواب ابوجہل نے سنا تو کہنے لگا کہ بنی مُطلب میں یہ ایک اور نبی پیدا ہو گیا ہے۔ جو طاقت اور اتحاد ہمیں حاصل ہے اُس کی وجہ سے عنقریب سب کو معلوم ہو جائے گا کہ خون کس کا بہتا ہے؟[۳]

---

[۱] قاضی محمد سلمان منصور پوری، کتاب: رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم، ج ۲ ص ۳۴۸

[۲] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۱۲۰

[۳] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۱۲۲

لشکرِ کفّار کی جنگ کے لیے روانگی

کفّار نے بہت زور و شور سے جنگ کی تیاریاں کیں جو مکمل ہوئیں تو منادی کرادی گئی کہ ہر پیر و جواں جنگ کے لیے مکّہ سے باہر آجائے اور جو کسی مجبوری کی بنا پر خود نہیں آسکتا وہ اپنی جگہ کسی دوسرے کو بھیجے۔ قریش کے سرداروں میں سے ابولہب کے سوا کسی نے توقف نہ کیا، اُس نے اپنی جگہ ابوالبختری عاص بن ہشام بن مغیرہ کو بھیجا۔[1] اُمیّہ بن خلف نے بھی بہت چاہا کہ مکّہ سے باہر نہ جائے مگر ابوجہل نے، جو اس جنگ کے لیے پیش پیش تھا، اُس کی ایک نہ چلنے دی۔ دراصل اُمیّہ بن خلف موت سے خوف زدہ تھا، اُس نے سُن رکھا تھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے کسی موقع پر حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا کہ اُمیّہ بن خلف میرے صحابہ کے ہاتھوں مارا جائے گا۔ چونکہ قریش نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو 'صادق' مانتے تھے چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی پیشین گوئی اُس کے نزدیک بلاشک و تردد سچی تھی۔ ابوجہل کو اُس کے انکار کی خبر ہوئی تو اُس کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ اے ابوصفوان! تُو مکّہ والوں کا سردار ہے جب اُنھیں معلوم ہوگا کہ تُو پیٹھ دکھا رہا ہے تو سب ہمت ہار بیٹھیں گے اور یہ مہم ناکام ہوجائے گی۔ اُس نے اتنا اصرار کیا کہ آخرکار اُمیّہ بن خلف کو بادلِ ناخواستہ آمادہ ہونا ہی پڑا۔

روایت ہے کہ ابوجہل خانہ کعبہ کی چھت پر چڑھ گیا اور چیخ چیخ کر کہنے لگا، ''اے مکّہ والو! جلدی کرو، باہر نکلو اور اپنے اموال اور قافلے کے پاس پہنچو۔ اگر محمد (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کے ساتھی تم سے پہلے پہنچ گئے تو پھر تمھاری خیر نہیں۔'' اُس کی آواز پر ایک ہزار جنگجو بصد کرّ و فر اور غرور و تکبر نکل آئے۔ وہ لڑنے کے لیے سامانِ حرب سے پورطرح لیس تھے اور اپنی متوقع فتح کا جشن منانے کے لیے آلاتِ موسیقی بھی اُٹھائے ہوئے تھے۔

---

[1] ابوجعفر محمد بن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ھ)، تاریخ طبری، ج ۲ ص ۲۷۱

بعض لوگ لکھتے ہیں کہ جب ابوسفیان اپنے قافلے کو نکال لے گیا تو ایک فرستادہ قریش کے پاس بھیجا کہ قافلہ اب خطرے سے باہر نکل آیا ہے لہٰذا تم لوگ واپس چلے جاؤ۔ قریش کے کچھ اور لوگوں کی بھی یہی رائے تھی لیکن جہلا کے سر پر جہالت کا بھوت سوار تھا اور وہ جنگ کے لیے بیتاب تھے۔ ابوجہل خوں گرفتہ، جو کبھی فتنہ وفساد سے باز نہیں آتا تھا، کہتا تھا،''ہم محمد (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) سے ضرور جنگ کریں گے، خدا کی قسم! ہم بدر پہنچے بنا واپس نہیں جاسکتے۔''[1]

بروایتے اُس نے کہا،'' ہم وہاں تین دن قیام کریں گے، اُونٹوں کو ذبح کر کے کھائیں گے، شراب پئیں گے، گانے بجائیں گے، جشن منائیں گے اور خوب لطف اندوز ہوں گے تاکہ ہماری شان وشوکت کا چرچا چہار سُو ہو جائے، پھر سبھی ہم سے خوف کھائیں گے۔'' بقولے، ابوسفیان نے ایلچی تو روانہ کر دیا لیکن جب اُس کا قافلہ مکّہ پہنچ گیا تو اُس کا ارادہ بدل گیا اور وہ بھی بدر جانے کے لیے قریش کے لشکر میں شامل ہو گیا۔

اکثر محققین یہ بھی لکھتے ہیں کہ قریش کا لشکر قافلے کے مکّہ پہنچنے سے پہلے ہی بدر کی طرف روانہ ہو چکا تھا۔ ایک طرف سے قافلہ آرہا تھا اور دوسری طرف سے قریش کی فوج پیش قدمی کر رہی تھی، جس کی روانگی مسلمانوں کی طرف سے کسی حملے کے امکان پر مبنی نہ تھی۔ اس کے برعکس مسلمانوں کو جنگ کے لیے روانگی کا حکم فوجِ کفّار کے مدینہ کے قریب پہنچ جانے کے بعد ہُوا۔[2]

اس کی تاویل قرآن کریم کی اس آیت مبارکہ سے کی جاتی ہے:[3]

''اِذْ اَنْتُمْ بِالْعُدْوَۃِ الدُّنْیَا وَھُمْ بِالْعُدْوَۃِ الْقُصْوٰی وَالرَّکْبُ اَسْفَلَ مِنْکُمْ ط''

(جس وقت تم قریب کے ناکہ پر تھے اور وہ دُور کے ناکہ پر اور قافلہ تم سے ادھر نیچے تھا)

---

[1] ابوجعفر محمد بن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ ہجری)، تاریخ طبری، ج ۲ ص ۲۷۸

[2] علامہ علی نقی نقوی، تاریخ اسلام، حصّہ دوم، ص ۱۷۶

[3] سورۃ الانفال، آیت ۴۲

لشکرِ کفّار کی تعداد

مشرکین کے لشکر میں ایک ہزار نو سو پچاس (۱۹۵۰) اور بقولے ایک ہزار (۱۰۰۰) جنگجو تھے۔[۱]

لشکرِ کفّار کا سامانِ حرب

لشکرِ قریش کے ساتھ تین سو (۳۰۰) گھوڑے اور سات سو (۷۰۰) اُونٹ تھے جو مکمل سازوسامان سے آراستہ تھے۔[۲] سوار اور پیادہ سبھی زِرّہ پوش تھے۔ اُن کے ہمراہ گانے والیاں اور آلاتِ موسیقی بھی تھے، دورانِ سفر میں وہ جہاں بھی ٹھہرتے وہ عورتیں گانا بجانا شروع کر دیتیں اور اپنے گیتوں کے ذریعے اہلِ اسلام پر زبانِ طعن دراز کرتیں۔ قریش کے سرداروں میں سے کوئی نہ کوئی سب کے لیے کھانا تیار کرواتا تھا جس میں روزانہ دس اُونٹ ذبح کیے جاتے تھے۔[۳]

جبرائیل علیہ السلام کی اطلاع اور مجلسِ مشاورت

لشکرِ کفّار کے پیش قدمی کرتے ہی جبرائیل علیہ السلام بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوئے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس کی اطلاع دی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُسی وقت مجلسِ مشاورت منعقد کی لوگوں کو صورتِ حال سے آگاہ کیا اور فرمایا، ''اَشِیْرُوْا عَلَیَّ اَیُّهَا النَّاسُ!'' اے لوگو! تمھاری کیا رائے ہے؟ کچھ لوگ پریشان ہو گئے اور کہنے لگے کہ یا نبی اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ہمیں پہلے کیوں نہیں بتایا؟ اگر پہلے خبر کر دی ہوتی تو ہم سامانِ حرب کا انتظام کر کے جنگ کے لیے تیار ہو جاتے، اور اب ہم تیار نہیں اس لیے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جنگ سے اجتناب ہی کریں۔ حضور

---

[۱] کے اے حمید، مسلمانانِ عالم، حصّہ اوّل، ص ۴۷
ابو جعفر محمد بن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ھ)، تاریخ طبری، ج ۲ ص ۱۲۸

[۲] کے اے حمید، مسلمانانِ عالم، حصّہ اوّل، ص ۴۷

[۳] ابو جعفر محمد بن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ھ)، تاریخ طبری، ج ۲ ص ۲۷۰

صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم یہ سُن کر غضبناک ہو گئے اور چہرۂ انور سرخ ہو گیا۔

مہاجرین میں سے کچھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو اپنی وفاداری وجاں نثاری کا یقین دلایا، اُن میں حضرت مقداد رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ ابن اسحاق روایت کرتے ہیں کہ مقداد رضی اللہ عنہ کھڑے ہوئے اور عرض کیا، ''یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم)! ہم آپ (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کے ساتھ ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم جہاں چاہیں ہمیں لے جائیں۔ ہم کبھی بھی وہ بات مُنہ سے نہ نکالیں گے جو بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہی تھی یعنی آپ اور آپ کا خدا دونوں چلے جائیں اور جا کر لڑیں ہم تو یہیں بیٹھے ہیں۔ یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم)! قسم ہے اُس ذات کی جس نے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کو حق کے ساتھ مبعوث فرمایا، جہاں آپ (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) جائیں گے ہم آپ (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کے ساتھ جائیں گے چاہے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) ''برک الغماد'' (حبشہ کے شہروں میں سے ایک شہر) تک ہی کیوں نہ جائیں اور ہم آپ (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کے ساتھ مل کر مردانہ وار لڑیں گے۔'' حضرت مقداد رضی اللہ عنہ کی بات سُن کر حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے تبسم فرمایا اور اُن کے لیے دُعائے خیر کی۔[1]

(ہمارا نظریہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے یہ مجلسِ مشاورت مشورہ لینے کے لیے نہیں بلکہ اپنے ساتھیوں کا عندیہ معلوم کرنے کے لیے منعقد فرمائی ہوگی تاکہ سب پر واضح ہو جائے کہ کس کا ایمان کتنا کامل ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو کسی بشر کے مشورے کی کوئی ضرورت نہیں تھی کیونکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تو اپنے اللہ کے حکم پر عمل فرماتے تھے اور اُسی کی طرف رجوع کرتے تھے۔ مؤلف)

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ میں نے مقداد (رضی اللہ عنہ) کا جو مَوقِف اور عزم دیکھا تھا وہ اگر مجھے حاصل ہوتا تو میرے لیے دُنیا کی ہر چیز سے زیادہ پسندیدہ ہوتا۔ وہ ایک شہسوار شخص تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم جب غضبناک تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے دونوں رخسار سرخ ہو گئے تھے تو اُس حالت میں وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم! بخدا ہم آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے اُس طرح نہیں کہیں گے جس طرح بنی اسرائیل نے

---

[1] ابوجعفر محمد بن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ھ)، تاریخ طبری، ج ۲ ص ۲۷۳

موسیٰ علیہ السّلام سے کہا تھا کہ تم اور تمھارا پروردگار جاؤ ہم تو یہاں بیٹھے رہیں گے۔ بلکہ قسم اُس کی جس نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حق کے ساتھ بھیجا ہے کہ ہم آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آگے پیچھے اور دائیں بائیں رہیں گے یہاں تک کہ اللہ عزوجل آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فتح و نصرت سے ہمکنار کرے۔[1]

پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم انصار کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا، ''تم کیا مشورہ دیتے ہو؟'' یاد رہے کہ بیعتِ عقبہ کے موقع پر انصار نے کہا تھا کہ ہم اُس وقت تک آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حفاظت کے ذمہ دار نہیں جب تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمارے گھر (مدینہ) نہیں تشریف لاتے۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمارے ہاں تشریف لے آئیں گے تو ہم آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حفاظت ایسے کریں گے جیسے اپنے بیوی بچّوں کی کرتے ہیں۔ عہد و پیمان کے اس انداز میں یہ پہلو نکلتا ہے کہ اُس وقت انصار مدینہ کے اندر تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حفاظت کی ذمہ داری قبول کر رہے تھے لیکن مدینہ سے باہر نہیں۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسی نقطۂ نظر سے دریافت فرمایا کہ تم اس میں کیا رائے دیتے ہو؟

انصار میں سے حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے عرض کیا، ''یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! کیا یہ سوال ہم سے ہے؟'' آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، ''ہاں!'' ابنِ معاذ نے عرض کیا، ''یا نبی اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! ہم آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر ایمان لائے ہیں، آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تصدیق کی ہے اور ہر اُس امر کی گواہی دی ہے جو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اللہ کی طرف سے لائے ہیں۔ ہم نے اپنے عہد و پیمان کے ذریعے اطاعت اور فرمانبرداری کا آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو یقین دلایا ہے لہٰذا چلیے جہاں آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی مرضی ہو۔ قسم ہے اُس ذاتِ کریم کی جس نے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو حق کے ساتھ بھیجا، ہم آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیچھے دریا میں بھی اُتر جائیں گے اور ہم میں سے کوئی پیچھے نہ رہے گا۔ ہمیں اپنے دشمن کے ساتھ ٹکرانے میں کوئی عذر نہیں، دشمن سے لڑائی کے وقت آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہمیں صابروں اور صادقوں میں سے پائیں گے اور اُمید ہے کہ اُس وقت اللہ تعالیٰ ہماری طرف سے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے قلب و نظر کو ٹھنڈک اور روشنی عطا کرے گا لہٰذا آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جہاں چاہیں

---

[1] ابو جعفر محمد بن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ھ)، تاریخ طبری، ج ۲ ص ۲۷۴

ہمیں لے جائیں۔''

حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی پُرخلوص اور جذبۂ ایمانی سے لبریز گفتگو سماعت فرما کر حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم خوش ہوئے اور فرمایا، ''اللہ تعالیٰ اپنی برکت کے ساتھ تمھیں خوش رکھے اور تمھیں نوید ہو کہ فتح تمھاری ہی ہے، بے شک حق تعالیٰ نے مجھ سے نصرت کا وعدہ فرمایا ہے۔[۱] روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے یہ بھی فرمایا کہ خدا کی قسم! میں اُن (کافروں) کا مقتل دیکھ رہا ہوں۔'' چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے کفّار کے بدر میں مارے جانے کے مقامات کی طرف اشارہ فرمایا۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، ''رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) زمین پر اپنا دستِ مبارک رکھ کر فرماتے تھے کہ یہ فلاں کے مرکر گرنے کی جگہ ہے، یہ فلاں کے ہلاک ہونے کی جگہ ہے، یہ فلاں کا مقتل ہے اور یہ فلاں کی قتل گاہ ہے، پس قتل ہونے والے ایک ایک کافر کا نام اور اُس کے مقتل کا نشان بتایا اور اُن میں سے کوئی بھی حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی بتائی ہوئی جگہ کی بجائے کہیں اور نہ مارا گیا۔''[۲]

لشکرِ اسلام کی روانگی

روایت ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے حضرت ابولبابہ رضی اللہ عنہ انصاری کو مدینہ میں عامل مقرر کیا اور مسلمانوں کی ایک مختصر جماعت کے ساتھ لشکرِ قریش کی سرکوبی کے لیے بدر کی طرف روانہ ہوئے۔[۳] یہ ۸ مارچ ۶۲۴ء یعنی ہجرت کا اُنیسواں مہینہ اور رمضان المبارک کی ۸ یا ۱۲ تاریخ تھی۔ بروایتے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے حضرت عمرو بن اُمّ کلثوم رضی اللہ عنہ کو مدینہ کا عامل مقرر فرمایا تھا لیکن روحا کے مقام پر پہنچ کر حضرت ابولبابہ بن عبدالمنذر رضی اللہ عنہ کو قائم مقام حاکم بنا کر واپس بھیج دیا۔[۴]

---

[۱] ابوجعفر محمد بن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ھ)، تاریخ طبری، ج ۲ ص ۲۷۴

[۲] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۱۲۲

[۳] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۱۱۸

[۴] ڈاکٹر نصیر احمد ناصر، کتاب: پیغمبرِ اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم، ص ۴۶۳

اس مرتبہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ انصار بھی تھے حال آنکہ اس سے پہلے اُنھوں نے کسی غزوے یا سریے میں شرکت نہیں کی تھی۔ مؤرّخین نے اس کی وجہ یہ بیان کی ہے کہ بیعتِ عقبہ میں اُنھوں نے یہ پیمان کیا تھا کہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حفاظت اور دشمنانِ دین سے مدافعت اپنے گھروں میں یعنی مدینہ میں کریں گے چنانچہ اُنھوں نے ہمیشہ ایسا ہی کیا اور اُس پیمان کی وجہ سے ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُنھیں اس سے پہلے کسی مہم پر روانہ نہیں کیا۔

اسلامی لشکر کی تعداد

اس غزوے میں مسلمانوں کی تعداد تین سو تیرہ (۳۱۳) تھی۔ بقول ابنِ عباسؓ ان میں ستتر (۷۷) مہاجرین اور دو سو چھتیس (۲۳۶) انصار تھے۔[1] تمام مسلمان روزے سے تھے۔ بروایتے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہمراہ صرف تین سو پانچ (۳۰۵) اصحاب تھے جن میں سے اسّی (۸۰) مہاجرین اور دو سو پچیس (۲۲۵) انصار تھے۔ باقی آٹھ (۸) اصحاب وہ تھے جو کسی عذر کی وجہ سے نہیں آئے تھے اور چونکہ اموالِ غنیمت میں سے اُن کو بھی حصّہ عطا کیا گیا تھا چنانچہ اہلِ سیر اُن کو بھی اہلِ بدر میں شمار کرتے ہیں، اُن میں سے تین (۳) مہاجرین تھے جن میں سے ایک حضرت عثمان بن عفانؓ تھے، دوسرے طلحہ اور تیسرے سعید بن زید اور باقی پانچ (۵) انصار تھے۔[2]

لشکرِ اسلام کے عَلم اور علمبر دار

اعلانِ بعثت کے وقت حضرت علی علیہ السلام کی عمر صرف دس سال تھی۔ اس کے بعد تیرہ سال جو مکّہ میں گذرے وہ تمام زحمتوں، مشقتوں اور قریش کی سازشوں کا سامنا کرتے ہوئے بسر ہوئے جن میں جنگ کی نوبت کبھی نہیں آئی جو آپ تیغ آزمائی کرتے۔ جنگِ بدر اس لحاظ سے پہلا موقع تھا اور یہ حبیبِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نگاہِ انتخاب تھی جو علی ابن ابی طالب علیہ السلام کی صلاحیتوں

---

[1] ابو جعفر محمد بن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ھ)، تاریخ طبری، ج ۲ ص ۲۷۲

[2] شیخ عبد الحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۱۱۹

کو بغیر کسی آزمائش کے خوب دیکھ رہی تھی جبھی جناب حمزہ رضی اللہ عنہ جیسے مردِ میدان کے موجود ہونے کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مہاجرین کا علم جناب علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے سپرد کیا اور انصار کا علم حضرت سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ کو دیا۔[1] بروایتے اس غزوے میں لشکرِ اسلام کے تین علم تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تیسرا علم حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو دیا جس کا رنگ سفید تھا۔[2]

اسلامی لشکر کا سامانِ حرب

غزوۂ بدر کی تیاری میں مسلمانوں نے حتّی المقدور حصّہ لیا تھا لیکن محدود وسائل کی بنا پر اسلحہ، رسد اور سواری کا خاطر خواہ انتظام نہ ہو سکا جس کی وجہ سے اُن کے پاس صرف دو یا تین (۲ یا ۳) گھوڑے، ستر (۷۰) اُونٹ، چھ (۶) زِرّہیں اور آٹھ (۸) تلواریں تھیں۔ ایک اُونٹ پر چار یا پانچ مسلمان باری باری سواری کرتے تھے۔[3] رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سواری میں حضرت علی مرتضیٰ علیہ السلام اور حضرت زید بن حارث رضی اللہ عنہ شامل تھے۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیدل چلنے کی باری آتی تو یہ دونوں جاں نثار عرض کرتے کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سوار ہی رہیے ہمیں اپنی رکاب میں پیدل چلنے کی سعادت حاصل کرنے دیجئے مگر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے کہ تم مجھ سے زیادہ قوی نہیں ہو اور میں اَجر کے معاملے میں تم سے زیادہ بے نیاز نہیں ہوں۔[4]

اسلامی لشکر کا بدر میں پڑاؤ

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رکاب میں مختصر سا اسلامی لشکر بدر کے قریب اُترا۔ لشکرِ کفّار کا پڑاؤ وادی کی دوسری جانب تھا۔ قرآن کریم میں اس کا ذِکر یوں آیا ہے:[5]

---

[1] ابوجعفر محمد بن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ھ)، تاریخ طبری، ج ۲ ص ۲۷۲

[2] ابوجعفر محمد بن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ھ)، تاریخ طبری، ج ۲ ص ۲۷۲

[3] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۱۱۹

[4] کے اے حمید، مسلمانانِ عالم حصّہ اوّل، ص ۴۷

[5] سورۃ الانفال، آیت ۴۲

''اِذْ اَنْتُمْ بِالْعُدْوَةِ الدُّنْیَا وَهُمْ بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوٰى وَالرَّكْبُ اَسْفَلَ مِنْكُمْ ؕ''

(جس وقت تم قریب کے ناکہ پر تھے اور وہ دُور کے ناکہ پر اور قافلہ تم سے ادھر نیچے تھا)

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہاں پہنچتے ہی ایک مستعد و ماہر حربیات اور عبقری (ذہین و فطین اور اعلیٰ پائے کا سردار) کی طرح اپنے دستِ راست حضرت علی علیہ السلام کو دو ساتھیوں کے ہمراہ میدانِ جنگ کا نقشہ، لشکرِ قریش کی قوت و نقل و حرکت اور دیگر جنگی معلومات حاصل کرنے کے لیے آگے روانہ کیا۔ پس معلوم ہُوا کہ دشمن کی تعداد نوسو (۹۰۰) سے ایک ہزار (۱۰۰۰) تک ہے اور اُس کا پڑاؤ پہاڑ کی دوسری جانب ہے۔[۱]

مسلمان جہاں اُترے تھے وہ علاقہ ریتلا تھا اس لیے اُن کے پاؤں اور گھوڑوں کے سُم ریت میں دھنس جاتے تھے اور اُنھیں چلنے پھرنے میں سخت مشکل درپیش تھی۔ اس پر ستم یہ کے وہاں پانی بھی نہیں تھا اور وہ پیاس سے نڈھال تھے۔ دوسری طرف کافروں نے جہاں پڑاؤ ڈالا وہ عام مٹیالی زمین تھی اور وہاں پانی بھی موجود تھا۔ اُس وقت شیطان مردود نے کچھ مسلمانوں کے دِلوں میں یہ وسوسہ ڈالا کہ تم سمجھتے ہو کہ تمھارے ساتھ نبی اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہیں، تم حق پر ہو اور خدا کے پسندیدہ بندے ہو جب کہ صورتِ حال یہ ہے کہ تم پیاس سے مغلوب ہو، پانی پر مشرکوں کا قبضہ ہے اور وہ منتظر ہیں کہ تم جان بلب ہو جاؤ تو وہ تمھیں نیست و نابود کر دیں۔ اِدھر شیطان نے یہ وسوسہ ڈالا اُدھر رحمٰن کی رحمت جوش میں آئی اور ابرِ کرم ایسا برسا کہ پوری وادی میں جل تھل ایک ہو گیا۔ پیاسے مسلمان پانی سے سیراب ہوئے، کسی نے غسل کیا، کسی نے وضو، اُونٹوں کو پانی پلایا اور مشکیزے بھر لیے۔ بارش کی وجہ سے مسلمانوں کی ریتلی اقامت گاہ گیلی ہو کر آرام دہ اور چلنے پھرنے کے لیے سہل ہو گئی اور کفّار کی مٹیالی زمین کیچڑ زدہ ہو کر اُن کے لیے دشوار گذار ہو گئی۔ شیطان کا وسوسہ جاتا رہا اور مسلمانوں کو اطمینان و سکون میسّر آیا۔

پس ارشادِ باری تعالیٰ ہُوا:[۲]

---

[۱] ابو جعفر محمد بن جریر طبری، (متوفی ۳۱۰ھ)، تاریخ طبری، ج ۲ ص ۱۲۸

[۲] سورۃ الانفال، آیت ۱۱

''وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَآءً لِّيُطَهِّرَكُمْ بِهٖ وَيُذْهِبَ عَنْكُمْ رِجْزَ الشَّيْطٰنِ وَلِيَرْبِطَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ وَيُثَبِّتَ بِهِ الْاَقْدَامَ ﴿۱۱﴾'' (اے لوگو! اللہ آسمان سے تم پر پانی برسا رہا تھا تا کہ تمھیں پاک صاف کرے اور تم سے شیطان کی نجاست و ناپاکی دُور کرے اور تمھارے دِلوں کو مضبوط کرے اور تمھارے قدموں کو جمائے۔)

قریش وادی میں نچلی طرف تھے، پانی کا بہاؤ بھی ہمیشہ نیچے کی طرف ہوتا ہے اس لیے بارش کے پانی سے اُن کی کچی زمین کیچڑ زدہ اور دلدلی ہوگئی تھی اور اُنھیں میدانِ جنگ تک پہنچنے میں دشواری ہونے لگی۔ مسلمان وادی میں بلندی کی طرف تھے جہاں کی زمین ریتلی تھی جو بارش کے بعد چلنے پھرنے کے لیے سہل ہوگئی تھی چنانچہ مسلمان، کفّار سے پہلے میدانِ جنگ میں پہنچ گئے۔

عسکری ماہرین کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ایک ماہر سپہ سالار کی طرح پوری طرح مستعد اور چاک و چوبند تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے میدانِ جنگ میں قریش کے تاخیر سے پہنچنے کا بھرپور فائدہ اُٹھایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم بدر کے وسط میں میٹھے پانی کے چشموں پر اُترے اور سورج اور ہوا کا رُخ معلوم کر کے صف بندی کے لیے اپنے لیے بہترین جگہ کا انتخاب کیا، یعنی اپنے دستوں کو اس طرح ترتیب دیا کہ سورج لشکرِ اسلام کے عقب یا پہلو میں جب کہ لشکرِ کفّار کے مقابل تھا اور ہوا کا رُخ بھی قریش کی طرف تھا۔ اس حکمت عملی سے لشکرِ کفّار کو بیک وقت تین دشمنوں سے لڑنا پڑتا، ایک لشکرِ اسلام، دوسرا آنکھوں کو چندھیا دینے والا سورج اور تیسری ریتلی ہوا۔ مزید برآں آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے دشمن کی قوّت کے پیشِ نظر اپنی قلیل فوج کو اس طرح ترتیب دیا کہ حملے کے وقت دشمن اپنی ساری فوج کو بیک وقت نہ لڑا سکے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے لشکر کے قلب کی حفاظت کے لیے میمنہ اور میسرہ پر تیر اندازوں کو متعین فرمایا اور عقب میں مجاہدین کا ایک طاقتور دستہ ہنگامی حالات کے لیے محفوظ رکھا جسے فوجی اصطلاح میں ''ملٹری ریزرو فورس (Miltary Reserve Force)''، یعنی محفوظ فوج کہا جاتا ہے۔

عریش

بقولے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قیام کے لیے بدر میں ایک ''عریش'' (شاخوں اور پتوں سے بنائی گئی جھونپڑی) بھی بنائی گئی جس کے باہر انصار کی ایک جماعت پہرے پر ایستادہ ہوگئی۔ [۱]

''عریش'' کے معاملے پر علما میں اختلاف پایا جاتا ہے، مندرجہ بالا قول کے مطابق ایک مکتبِ فکر کے علما کہتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے عریش بنائی گئی جب کہ دوسری جماعت کے علما کا کہنا ہے کہ کوئی عریش نہیں بنائی گئی تھی۔ [۲]

عریش کی نفی کرنے والوں کا موقف یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے ساتھیوں سے الگ ہو کر کسی محفوظ مقام پر کوئی قیام نہیں فرمایا بلکہ اُن کے ساتھ بنفسِ نفیس میدانِ جنگ میں موجود رہے۔ اس ضمن میں حضرت علی علیہ السلام کی اس روایت سے بھی استدلال پیش کیا جاتا ہے کہ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا، ''جب بدر کا موقع تھا اور مقابلہ آن پڑا تو تمام فوج رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پناہ میں تھی اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جرأت و ہمت سب سے نمایاں تھی اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہم سب سے زیادہ دشمن کے قریب تھے۔'' [۳]

ہم اس استدلال کی نفی کرنے کی جسارت بالکل نہیں کر سکتے کیونکہ ہم آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جرأت و ہمت اور شجاعت و استقامت پر مکمل ایمان رکھتے ہیں اور ہمارا عقیدہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے اصحاب (رضی اللہ عنہم) کے ساتھ میدانِ کارزار میں بنفسِ نفیس موجود رہے، اُن کا حوصلہ بڑھاتے رہے اور اُن کو ہدایات جاری فرماتے رہے۔

---

[۱] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۱۲۳

[۲] علامہ سید جعفر مرتضیٰ عاملی، الصحیح من سیرۃ النبی اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ج ۳ ص ۲۶۸

[۳] علامہ علی نقی نقوی، تاریخ اسلام ص ۱۹۶۔ ابو جعفر محمد بن جریر طبری، تاریخ طبری، ج ۲ ص ۲۷۰

حق و باطل کا ٹکراؤ

مؤرّخین لکھتے ہیں کہ قریش نے ایک لشکری کو مسلمانوں کی تعداد معلوم کرنے کے لیے بھیجا۔ اُس نے اسلامی لشکر کا ایک چکر لگایا اور خدا جانے کیا محسوس کیا کہ واپس جا کر بتایا، ''مسلمان کم و بیش تین سو ہیں مگر اے گروہِ قریش! میں نے اموات بر دوش بلاؤں کو دیکھا ہے اور یثرب کے اُن اُونٹوں کا نظارہ کیا ہے جو زہرِ قاتل کا بوجھ اُٹھائے ہوئے ہیں لٰہذا خیریت چاہتے ہو تو لوٹ جاؤ۔'' مطلب یہ کہ مسلمانوں سے جنگ کرنا تمھاری ہلاکت کا باعث ہوگا اور تمھاری سلامتی اِسی میں ہے کہ تم جنگ سے باز رہو اور واپس چلے جاؤ۔

حکیم بن حزام نے یہ سنا تو عتبہ سے کہا کہ اے ابو ولید! تُو قریش کا بزرگ اور سردار ہے، کیا تُو چاہتا ہے کہ تیرا ذِکر آخری زمانے تک رہے؟ عتبہ بولا، تم کہنا کیا چاہتے ہو اے حکیم؟ حکیم کہنے لگا کہ میں چاہتا ہوں کہ ہم لوگ واپس چلے جائیں۔ عتبہ بولا مجھے تمھاری بات منظور ہے لیکن تم ابنِ حنظلہ (ابو جہل) کے پاس جاؤ اور اُسے واپسی کے لیے کہو ممکن ہے وہ آمادہ ہو جائے اور لوگوں کو واپس لے چلے۔ چنانچہ حکیم بن حزام ابو جہل کے پاس گیا اور عتبہ کے ساتھ ہونے والی بات چیت بیان کی۔ ابو جہل سیخ پا ہو گیا، فوراً عتبہ کے پاس گیا اور طعنہ زنی کرتے ہوئے بولا ''انتفخ منحرك'' (تیرے پھیپھڑے میں ہوا بھر گئی ہے)۔ عرب میں یہ محاورہ بزدلی و نامردی کا طعنہ دینے کے لیے بولا جاتا ہے یعنی اُس نے عتبہ سے کہا کہ تُو نامرد اور بزدل ہو گیا ہے۔ عتبہ نے کہا کہ عنقریب پتا چل جائے گا کہ کس کا پھیپھڑا پھولا ہُوا ہے اور کون بزدل ہے۔

الغرض، لشکرِ باطل ٹڈی دل کی طرح بدر کے میدان میں نمودار ہُوا۔ اُس وقت لشکرِ حق بھی میدان میں اُترا۔ نبی معظم صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم نے اپنی صفوں کو ترتیب دی اور فرمایا کہ جب تک میں نہ کہوں دشمن پر حملہ نہ کرنا اور اگر وہ تمھارے قریب آجائیں تو صرف تیر اندازی شروع کر دینا لیکن اتنی احتیاط سے کہ تیر ضائع نہ ہوں۔

اس جگہ اربابِ سیر ایک عجیب و غریب روایت بیان کرتے ہیں کہ جب جناب سرورِ

انبیا ﷺ لشکرِ اسلام کی صفیں سیدھی فرما رہے تھے تو آپ ﷺ کے دستِ مبارک میں ایک چھڑی تھی۔ سواد بن عزیہؓ ایک پُرجوش اور خوش طبع صحابی تھے جو صفوں سے آگے نکل کر کھڑے تھے، حضور ﷺ نے اُس چھڑی سے اُن کے سینے کو چھوتے ہوئے فرمایا،''استو یا سواد'' یعنی اے سواد صف کو برابر کرو۔ سوادؓ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ ﷺ! آپ ﷺ نے مجھے چھڑی سے ضرب لگائی اور تکلیف پہنچائی ہے جب کہ اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو حق کے ساتھ بھیجا اور عدل وانصاف آپ ﷺ کے دستِ اقدس میں دیا پس آپ ﷺ میرا قصاص دیجیئے۔ رسولِ کریم ﷺ نے اپنے سینۂ اقدس سے لباس کو ہٹا کر فرمایا،''اے سواد! اِسی وقت اپنا قصاص لے لو۔'' حضرت سوادؓ نے فی الفور اپنا مُنہ حضور ﷺ کے سینۂ اقدس پر رکھ کر بوسہ لے لیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا،''سواد! یہ کیا کر رہے ہو؟'' حضرت سوادؓ نے عرض کیا،''یارسول اللہ ﷺ! ہوسکتا ہے کہ میں اس معرکے میں شہید ہو جاؤں، میری آرزو ہے کہ آخری وقت آنے سے پہلے میرا بدن آپ ﷺ کے مبارک جسم سے مَس ہو جائے۔'' حضور ﷺ نے حضرت سوادؓ کا جذبۂ عقیدت دیکھ کر اُن کے لیے دُعائے خیر فرمائی۔[1]

یہ ۱۷ رمضان المبارک ۲ ہجری یعنی ۱۳ مارچ ۶۲۴ء کا دن تھا۔ عرب کے رواج کے مطابق سب سے پہلے دُو بدو لڑائی کا آغاز ہُوا۔ لشکرِ کفّار کی طرف سے عتبہ بن ربیعہ، اُس کا بھائی شیبہ بن ربیعہ اور بیٹا ولید بن عتبہ میدان میں آئے اور مُبارزت طلب کی۔ اُن کے مقابلے کے لیے تین انصار میدان میں اُترے، عوف بن حارثؓ، معاذ بن حارثؓ اور عبداللہ بن رواحہؓ[2] یا بروایتے معاذ بن عفراءؓ، معوذ بن عفراءؓ اور عبداللہ بن رواحہؓ۔[3] کافروں نے کہا تم انصاری ہو تمھارے ساتھ ہمیں کوئی سروکار نہیں ہم تو اپنے چچاؤں کے بیٹوں (قریشیوں) کو

[1] شیخ عبدالحق محدث دہلوی، (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۱۲۴

[2] شیخ عبدالحق محدث دہلوی، (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۱۲۵

[3] ڈاکٹر نصیر احمد ناصر، کتاب: پیغمبر اعظم و آخر ﷺ، ص ۷۱۴

بلاتے ہیں۔ پھر اُن میں سے ایک نے آواز لگائی، اے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! ہماری قوم میں سے ہمارے، ہم پلہ لوگ بھیجیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام، حضرت حمزہ اور حضرت عبیدہ بن حارث رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ جاؤ ان کا مقابلہ کرو۔ مؤرخ لکھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، ''یا علی قم، یا حمزۃ قم، یا عبیدۃ بن الحارث قم'' (اے علی! اُٹھو، اے حمزہ! اُٹھو، اے عبیدہ بن حارث! اُٹھو)۔ [1] حیدرِ کرار جناب علی ابن ابی طالب علیہ السلام شاید اِسی حکم کے منتظر تھے، میدان میں ایسے کود پڑے جیسے شیر اپنے شکار کی طرف جست لگاتا ہے، اُن کے ساتھ ہی حضرت حمزہ بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ اور جناب عبیدہ بن حارث رضی اللہ عنہ بھی لپکے۔ یہ تینوں مردانِ حق میدان میں آئے تو کافروں نے کہا کہ ہاں! یہ ہماری ٹکر کے ہیں۔ حضرت عبیدہ رضی اللہ عنہ اسّی سالہ ضعیف آدمی تھے، وہ عتبہ کے مقابلے پر آئے اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ جو اُس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہم عمر تھے، شیبہ سے ٹکرائے۔ ایک روایت میں اس کے برعکس یوں آیا ہے کہ حضرت عبیدہ رضی اللہ عنہ شیبہ کے اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ عتبہ کے مقابل آئے۔ حضرت علی مرتضیٰ علیہ السلام نوجوان تھے، آپ نے قریش کے جوان ولید بن عتبہ کو واصل جہنم کیا اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے اپنے مقابل کو ہلاک کیا لیکن حضرت عبیدہ رضی اللہ عنہ اور اُن کے حریف کے درمیان مقابلہ ہوتا رہا، پھر ایک ضرب اُن کے زانو پر پڑی اور وہ شدید زخمی ہوگئے۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ اور حضرت علی علیہ السلام اُن کی نصرت کے لیے پہنچے اور دشمن کو قتل کرنے میں اُن کی مدد کی۔ حضرت عبیدہ رضی اللہ عنہ شدید زخمی تھے اُن کی پنڈلیوں سے خون اور گودہ بہہ رہا تھا، اُنھیں اُٹھا کر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا گیا تو اُنھوں نے عرض کی کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! کیا میں شہید نہیں ہوں؟ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ہاں! تم شہید ہو۔ حضرت عبیدہ رضی اللہ عنہ کا یہ سوال اس بنا پر تھا کہ وہ زخمی حالت میں میدانِ جنگ سے زندہ لوٹے تھے اور محسوس کررہے تھے کہ شہادت میں ابھی کچھ دیر ہے، اس لیے پریشان تھے کہ میدانِ جنگ سے باہر موت آجانے پر کہیں شہادت کے درجہ پر فائز ہونے

---

[1] ابوجعفر محمد بن جریر طبری، (متوفی ۳۱۰ھ)، تاریخ طبری، ج ۲ ص ۲۷۰

سے رہ نہ جائیں۔ مذکور ہے کہ اُن کا انتقال بدر سے واپسی پر وادیٔ صفراء یا وادیٔ روحا میں ہُوا اور اُنھیں وہیں دفن کیا گیا۔ دست بدست لڑائی کے بعد قریش کی طرف سے عام حملہ شروع ہُوا، مسلمان بھی سر پر کفن باندھ کر میدانِ جنگ میں اُترے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے قلیل لشکرِ اسلام اور کثیر لشکرِ کفّار کے باہم ٹکرانے کا مشاہدہ فرمایا تو بارگاہِ الٰہی میں عرض کیا، ''یا ربّ! جو وعدہ تُو نے مجھ سے کیا تھا اُسے پورا فرما۔''[۱] ایک روایت کے مطابق آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے یوں دُعا فرمائی، ''یا اللہ! یہ قریش اپنے فخر و غرور کے ساتھ آئے ہیں، یہ تیری مخالفت کرتے ہیں اور تیرے رسول کو جھٹلاتے ہیں۔ یا اللہ! میں تیری مدد کا طلبگار ہوں جس کا تُو نے مجھ سے وعدہ فرمایا ہے۔ یا اللہ! انھیں ہلاک کر دے۔''[۲] بقولے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے یہ دُعا بھی مانگی ''اَللّٰھم ان تھلك ھذہ العصابۃ فلا تعبد فی الارض''[۳] (الٰہی! اگر تیرے بندوں کی یہ چھوٹی سی جماعت آج ہلاک ہوگئی تو روئے زمین پر تیرا سچا عبادت گذار کوئی نہیں رہے گا)۔

حضرت علی علیہ السّلام فرماتے ہیں کہ روزِ بدر میں نے دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم بارگاہِ الٰہی میں سجدہ ریز تھے اور یہ دُعا مانگ رہے تھے، ''یَا حَیُّ یَا قَیُّوْمُ بِرَحْمَتِكَ اَسْتَغِیْثُ'' (اے زندہ وجاوید! اے ساری کائنات کا نظام چلانے والے! اپنی رحمت سے مدد فرما)، پھر حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا، ''لوگو! سنو! قسم ہے اُس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے، جو حق تعالیٰ کی رضا اور ثواب کی طلب میں اِن کافروں سے جنگ کرے گا اور خدا کی راہ میں شہید ہو جائے گا اُس کے لیے بہشتِ جاوداں ہے۔'' روایت ہے کہ اُس وقت حضرت عمیر بن حمام رضی اللہ عنہ کھجوریں کھا رہے تھے، اُنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا یہ کلام سُنا تو بولے، ''میرے لیے نوید ہے کہ میرے اور بہشتِ جاوداں کے درمیان اب کوئی فاصلہ نہیں تاوقتیکہ میں (لڑتا ہُوا)

---

[۱] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۱۲۴ تا ۱۲۶

[۲] ابن ہشام (متوفی ۸۳۳ء)، سیرت ابن ہشام، ص ۲۷۵

[۳] ڈاکٹر نصیر احمد ناصر، کتاب: پیغمبرِ اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ص ۴۶۸ بحوالہ ابوالکلام احمد، ترجمان القرآن ۲:۵۲، ۵۷

اِن کافروں کے ہاتھوں شہید ہوجاؤں۔ یہ کہہ کر ہاتھ سے کھجوریں پھینک دیں، تلوار سونت کر میدانِ جنگ میں کود پڑے اور دشمنانِ اسلام کے خلاف لڑتے ہوئے بالآخر شہید ہوکر بہشتِ جاوداں کے سفر پر روانہ ہوگئے۔[۱]

ایک مجاہد حضرت عوف بن حارث بن الحضراء رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے پوچھا کہ بندے کا کون سا عمل ہے جو پروردگار کو ہنسا دے (یعنی بہت خوش کردے)؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ اگر وہ جہاد کے وقت دشمن کے سامنے اپنی زِرّہ کو جسم سے اُتار پھینکے (یعنی اپنی حفاظت کا خوف دِل سے نکال دے)۔ یہ سنتا تھا کہ اُنھوں نے اپنی زِرّہ اُتار کر پھینک دی اور تلوار سونت کر جنگ کرنے لگے یہاں تک کہ شہید ہوگئے۔[۲]

قریش کا لشکر سیلابی ریلے کی طرح اُمنڈ اُمنڈ کر آرہا تھا، وہ مسلمان تیر اندازوں کے نشانے پر آیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ہدایت پر تیر اندازوں نے اُسے اس طرح تیروں پر لیا کہ وہ اسلامی لشکر کے بازؤں پر یا عقب میں وارد نہ ہوسکا۔

مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے مٹھی بھر ریت فوجِ کفّار کی طرف پھینکی اور فرمایا، ''شاھت الوجوہ''، یعنی اِن کے چہرے مسخ ہوں۔ اُسی وقت تیز ہوا چلی جس کا رُخ کافروں کی طرف تھا۔ وہ ریت تمام کافروں کے چہروں پر پڑی اور اُس کے ذرّے اُن کی آنکھوں اور نتھنوں میں گھس گئے۔ بعض مؤرّخین اس واقعے کو ایک اور زاویے سے دیکھتے ہیں، اُن کے نزدیک ہوا کا رُخ فوجِ کفّار کی طرف بدلا پھر ریگ بدوش ہوائیں چلنے لگیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اُسی موقع کے منتظر تھے چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے مٹھی بھر ریت اُٹھائی اور دشمن کی طرف پھینکی جو کہ اشارہ تھا اپنی عقب کی محفوظ فوج کو آگے بڑھ کر دشمن پر حملہ آور ہونے کا۔[۳]

---

[۱] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۱۲۷

[۲] ابوجعفر محمد بن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ھ)، تاریخ طبری، ج ۲ ص ۱۴۳

[۳] ڈاکٹر نصیر احمد ناصر، کتاب: پیغمبرِ اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم، ص ۴۷۲

جنگ میں ملائکہ کی مدد

اُسی وقت لشکرِ اسلام کی نصرت کے لیے اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرشتے نازل فرمائے جو کافروں پر بلائے ناگہانی کی طرح وارد ہوئے۔ اُن کے پاؤں اُکھڑ گئے اور وہ میدانِ جنگ سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ اللہ جل جلالہ نے کسی کافر کو ہلاک کرایا اور کسی کو اپنے بندوں کا اسیر بنایا، جو ہلاک ہوئے اور قیدی بنے اُن میں اکثر مشرکوں کے سردار اور اشراف تھے۔

پس ارشادِ پروردگار ہے:[۱]

''اِذۡ تَسۡتَغِیۡثُوۡنَ رَبَّکُمۡ فَاسۡتَجَابَ لَکُمۡ اَنِّیۡ مُمِدُّکُمۡ بِاَلۡفٍ مِّنَ الۡمَلٰٓئِکَۃِ مُرۡدِفِیۡنَ ﴿۹﴾''

(اے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم! اُس وقت کو یاد کرو) جب تم اپنے پروردگار سے فریاد کر رہے تھے اور اُس نے تمھاری فریاد سُن لی (اور فرمایا) کہ تمھاری مدد کے لیے یکے بعد دیگرے ایک ہزار فرشتے بھیج رہا ہوں۔)

اور دوسری جگہ ارشادِ الٰہی ہوتا ہے:[۲]

''اَلَنۡ یَّکۡفِیَکُمۡ اَنۡ یُّمِدَّکُمۡ رَبُّکُمۡ بِثَلٰثَۃِ اٰلٰفٍ مِّنَ الۡمَلٰٓئِکَۃِ مُنۡزَلِیۡنَ ﴿۱۲۴﴾ بَلٰۤی ۙ اِنۡ تَصۡبِرُوۡا وَ تَتَّقُوۡا وَ یَاۡتُوۡکُمۡ مِّنۡ فَوۡرِہِمۡ ہٰذَا یُمۡدِدۡکُمۡ رَبُّکُمۡ بِخَمۡسَۃِ اٰلٰفٍ مِّنَ الۡمَلٰٓئِکَۃِ مُسَوِّمِیۡنَ ﴿۱۲۵﴾''

(کیا یہ بات تمھارے (اطمینان کے) لیے کافی نہیں کہ تمھارا پروردگار تین ہزار فرشتوں سے تمھاری مدد کرے جو (آسمان سے) اُتارے گئے ہوں۔ ہاں کیوں نہیں! اگر تم صبر کرو اور تقویٰ اختیار کرو، اور وہ (دشمن) اُس وقت فوری طور پر تم پر چڑھ آئے تو تمھارا پروردگار پانچ ہزار نشان زدہ فرشتوں سے تمھاری مدد کرے گا۔)

---

[۱] سورۃ الانفال، آیت ۹

[۲] سورۃ آل عمران، آیت ۱۲۴ تا ۱۲۵

علمائے کرام اِن آیاتِ کریمہ کے درمیان موافقت اس طرح بیان کرتے ہیں کہ پہلی آیت میں جن ایک ہزار فرشتوں کا ذِکر ہے وہ پہلے آئے تھے اور دوسری آیت والے تین ہزار فرشتے بعد میں نازل ہوئے تھے اور پانچ ہزار آخر میں آئے۔ ایسی ہی ایک روایت ربیع بن انس سے بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کی مدد پہلے ایک ہزار فرشتوں سے فرمائی پھر تین ہزار سے اور اس کے بعد پانچ ہزار سے۔[۱]

حضرت ابوقتادہ روایت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے روز بدر پانچ ہزار ملائکہ سے مدد فرمائی۔ امیر المومنین سیّدنا علی مرتضیٰ علیہ السلام فرماتے ہیں کہ روز بدر ایسی تند و تیز ہوا چلی جو پہلے کبھی نہیں دیکھی گئی تھی، وہ ہوا تین بار چلی۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ پہلی مرتبہ جبرائیل علیہ السلام ہزار فرشتوں کے ساتھ آئے دوسری مرتبہ میکائیل علیہ السلام ہزار فرشتوں کے ساتھ آئے اور تیسری مرتبہ اسرافیل علیہ السلام ہزار فرشتوں کے ساتھ آئے۔[۲]

جناب امیر المومنین علیہ السلام کی یہ روایت اس آیت مبارکہ سے متعلق معلوم ہوتی ہے:[۳]

''اَلَنْ يَّكْفِيَكُمْ اَنْ يُّمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُنْزَلِيْنَ ؀۱۲۴''

(اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! یاد کرو جب تم مؤمنوں سے کہہ رہے تھے کہ کیا یہ بات تمھارے (اطمینان) کے لیے کافی نہیں کہ تمھارا پروردگار تین ہزار فرشتوں سے تمھاری مدد کرے جو (آسمان سے) اتارے گئے ہوں؟)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ بنی غفار کے ایک شخص نے مجھے بتایا، ''میں اور میرا چچازاد بھائی بدر کی جنگ میں مشرکوں کے ساتھ تھے، ہم دونوں ایک بلند پہاڑی پر چڑھ گئے اور انتظار کرنے لگے کہ جو لشکر بھی شکست کھا کر بھاگے گا ہم اُسے لُوٹیں گے۔ اچانک

---

[۱] محمد الزرقانی (متوفی ۱۱۲۲ھ)، شرح المواہبُ اللدنیۃ

[۲] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۱۳۲

[۳] سورۃ آل عمران، آیت ۱۲۴

ہم نے اپنے قریب سے ایک بادل کو گذرتے دیکھا جس میں سے گھوڑوں کے ہنہنانے کی آوازیں آرہی تھیں اور ہم نے سُنا کہ کوئی کہہ رہا تھا ''اقدم حیزوم'' (اے حیزوم! آگے بڑھو)، میرا چچازاد بھائی خوفزدہ ہوکر مجھ پر آگرا، اُس کا دل پھٹ گیا اور وہیں مرگیا۔ اُس وقت مارے خوف کے میں بھی قریبُ المرگ تھا لیکن میں نے ہمت سے کام لیا اور بچ گیا۔''[۱]

محققین کہتے ہیں کہ ''حیزوم'' حضرت جبریل صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے گھوڑے کا نام ہے۔[۲]

روایت ہے کہ دورانِ جنگ میں جب کوئی مسلمان کسی کافر کے پیچھے لپکتا تو اِس سے پہلے کہ وہ اُس تک پہنچتا اُس کافر کا سرکٹ کر زمین پر جا گرتا۔ ایک مجاہد ابوداوٗد مازنی کا بیان ہے کہ میں ایک مشرک کو قتل کرنے کے لیے اُس کا پیچھا کررہا تھا، میری تلوار ابھی اُس سے دُور تھی کہ اُس کا سرکٹ کر زمین پر آرہا اور میں سمجھا کہ اُسے کسی اور نے قتل کردیا ہے جو نظروں سے اوجھل تھا۔[۳]

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ ایک انصاری مجاہد کسی کافر کے تعاقب میں تھا کہ اُسے کوڑے کی آواز آئی اور اُس نے ایک سوار کو یہ کہتے سُنا ''اقدم حیزوم'' اچانک اُس انصاری نے دیکھا کہ اُس کے سامنے وہ کافر، جس کا وہ تعاقب کررہا تھا، گرا پڑا ہے۔ اُس کا منہ پھٹا ہُوا اور گردن ٹوٹی ہوئی تھی۔ وہ انصاری حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت میں حاضر ہُوا اور تمام واقعہ عرض کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ وہ آسمانی مدد تھی۔[۴]

روایت ہے کہ جنگ ختم ہونے کے بعد ایک انصاری حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ کو لیے حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت میں حاضر ہُوا اور دعویٰ کیا کہ میں نے عباس کو اسیر کیا ہے۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے کہا کہ اِس نے مجھے اسیر نہیں کیا، مجھے گرفتار کرنے والا تو ایک نہایت

---

[۱] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۱۳۲

[۲] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۱۳۲

[۳] ابوجعفر محمد بن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ھ)، تاریخ طبری، ج ۲ ص ۲۸۳

[۴] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۱۳۲

خوبصورت شخص تھا جو ابلق (دورنگا/ چتکبرا/ سیاہ وسفید) گھوڑے پر سوار تھا مگر اب وہ کہیں نظر نہیں آرہا۔ انصاری کہنے لگا کہ عباس غلط کہہ رہے ہیں انھیں کسی اور نے نہیں بلکہ میں نے ہی گرفتار کیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انصاری سے فرمایا کہ تم دونوں اپنی جگہ صحیح ہو، دراصل ایک بزرگ فرشتے نے اس کام میں تمھاری اعانت کی ہے۔[1]

اس جنگ میں ستر کافر مارے گئے تھے جن میں قریش کے مختلف قبائل کے سردار اور اسلام دشمنی میں مشہور ومعروف کئی اہم لوگ شامل تھے۔ اُن کی موت نے قریش کی کمر توڑ دی اور تحریکِ اسلام کی جڑیں اور مضبوط ہوگئیں۔ دُور ونزدیک کے علاقوں پر مسلمانوں کی دھاک بیٹھ گئی اور مدینہ میں موجود یہود اور منافقین کی سرگرمیاں بھی ڈھیلی پڑ گئیں۔[2]

حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کی شجاعت

مؤرّخین لکھتے ہیں کہ بدر میں مشرکین کے ستر (۷۰) مقتولین میں سے پینتیس (۳۵) شیرِ خدا حضرت علی علیہ السلام کے ہاتھوں لقمۂ اجل بنے تھے جب کہ باقی نصف دوسرے مجاہدین کے ہاتھوں قتل ہوئے۔[3] اسی بنا پر مولانا شبلی نے لکھا ہے، ''غزوۂ بدر کے ہیرو اسد اللہ الغالب علی ابن ابی طالب علیہ السلام ہیں۔''[4]

امیر المومنین جناب علی علیہ السلام کے ہاتھوں قتل ہونے والے زیادہ تر افراد بنو اُمیّہ کے تھے اور یہ وہ لوگ تھے جن سے آلِ ابوسفیان کا گہرا تعلق تھا۔ چنانچہ مؤرّخین لکھتے ہیں کہ جنگِ جمل، جنگِ صفین (جو حضرت علی علیہ السلام کے ساتھ لڑی گئیں) اور سانحۂ کربلا (جس میں

---

[1] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۱۳۲

[2] دعوت دہلی، سیرت طیبہ، ۱۶ ستمبر ۱۹۵۹ء، ص ۱۹۸۔ علامہ علی نقی نقوی، تاریخ اسلام، ص ۲۱۰

[3] خواجہ محمد لطیف، اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ ج ۱ ص ۸۷۔ علامہ علی نقی نقوی، تاریخ اسلام، ص ۲۰۷

[4] شبلی نعمانی (متوفی ۱۹۱۴ء)، سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ج اوّل ص ۲۵۷۔ علامہ علی نقی نقوی، تاریخ اسلام، ص ۲۰۸

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نواسے حسین ابنِ علی علیہ السلام، آلِ رسول علیہم السلام اور اُن کے ساتھیوں کو شہید کیا گیا اور بچ رہنے والے بچّوں اور مستورات کو اسیر کر کے دربارِ یزید بن معاویہ بن ابوسفیان میں پیش کیا گیا)، اُن ہی مقتولینِ بدر کا انتقام لینے کے لیے کی جانے والی کاروائیاں تھیں۔

علی علیہ السلام کے ہاتھوں تہِ تیغ ہونے والے چند مشہور کافروں کے نام

۱) ولید بن عتبہ بن ربیعہ

۲) عاص بن سعید بن عاص بن اُمیّہ

۳) طعیمہ بن عدی بن نوفل

۴) نوفل بن خویلد: یہ جنگ جمل کے مشہور سردار زبیر کا چچا تھا اور مسلمانوں پر تشدد کرنے میں بہت مشہور تھا چنانچہ جنگ ختم ہونے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خاص طور پر اُس سے متعلق دریافت فرمایا تو جناب علی علیہ السلام نے عرض کیا کہ میں نے اُسے قتل کر دیا ہے۔ یہ سُن کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صدائے تکبیر بلند فرمائی۔

۵) حنظلہ بن ابوسفیان: شیرِ خدا حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ ولید بن عتبہ کے مارے جانے کے بعد اُس کا بھانجا (حنظلہ بن ابوسفیان) میدان میں آیا، میں نے اُس کے سر پر وار کیا، میری تلوار اُس کا سر چیرتی ہوئی آنکھوں تک اُتر گئی تھی اور وہ قتل ہو کر زمین پر گر پڑا۔

۶) زمعہ بن اسود

۷) حارث بن زمعہ

۸) عمیر بن عثمان بن کعب بن تیم: یہ جنگ جمل کے دوسرے سردار طلحہ کا چچا تھا۔

۹) نضر بن حارث کلدہ: اسے حضرت علی علیہ السلام نے بدر سے واپسی پر صفراء میں قتل کیا۔

دیگر مجاہدین کے ہاتھوں قتل ہونے والے چند مشہور کافروں کے نام

دیگر مجاہدین کے ہاتھوں واصلِ جہنم ہونے والے چند معروف کافروں کے نام مندرجہ ذیل ہیں:

۱) عتبہ بن ربیعہ: قریش میں سب سے پہلے یہ شخص اپنے بیٹے ولید اور بھائی شیبہ کے ساتھ میدان میں آیا تھا۔ اِس کے قتل کی تفصیل اُوپر گزر چکی ہے۔

۲) اسود بن عبدالاسد مخزومی: یہ حضرت حمزہ بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں قتل ہُوا۔

۳) شیبہ بن ربیعہ بن عبدشمس: یہ بھی حضرت حمزہ بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں مرا۔

۴) عقبہ بن ابی معیط: اس کے قتل کی تفصیل آگے آئے گی۔

۵) ابوجہل بن ہشام: حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اس کا سر قلم کیا، اس کی تفصیل بھی آگے آئے گی۔

۶) ابوالبختری عاص بن ہشام: اس کے قتل کی تفصیل اگلے صفحات پر ملاحظہ فرمائیں۔

۷) اُمیّہ بن خلف: اسے حضرت عمار یاسر رضی اللہ عنہ نے قتل کیا، تفصیل اگلے صفحات پر ملاحظہ فرمائیں۔

۸) نبیہ بن حجاج

۹) منبہ بن حجاج

۱۰) عقیل بن اسود بن عبدیغوث

۱۱) زمعۃ بن اسود بن عبدیغوث

۱۲) حارث بن اسود بن عبدیغوث

اُس زمانے میں عموماً اور عرب میں خصوصاً یہ رواج تھا کہ جنگ میں قتل ہونے والوں کی نعشوں کا مُثلہ (نعشوں کی بے حرمتی کرنا، حُلیہ بگاڑنا اور اعضا وجوارح مثلاً ناک اور کان وغیرہ کاٹنا) کیا جاتا تھا لیکن جناب رحمۃً للعالمین صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اس کی ممانعت فرمائی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم مجسم خلقِ عظیم تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے یہ گوارا نہ کیا کہ کسی انسان، چاہے وہ مشرک اور دشمن ہی کیوں نہ ہو، کے میدان میں پڑے بے گوروکفن لاشے کو چیل کوّے وغیرہ کھاتے رہیں چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے حکم پر مقتولین کی نعشوں کو بدر کے ایک متروک کنویں میں ڈال کر دفن کر دیا گیا۔

ابوجہل بن ہشام کاانجام

ابوجہل بہت بڑا دشمنِ اسلام تھا۔ اُس کے سینۂ پُر کینہ میں رسول اللہ ﷺ کے خلاف بغض وعناد کُوٹ کُوٹ کر بھرا ہُوا تھا اور وہ اسلام اور اہلِ اسلام کی مخالفت اور مخاصمت کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تھا۔ قریش کو مسلمانوں کے خلاف اُکسانے اور اس جنگ کے لیے تیار کرنے میں اُس کا بہت اہم کردار تھا۔

دورانِ جنگ میں دو بھائی معوذ بن عفراء رضی اللہ عنہ اور معاذ بن عفراء رضی اللہ عنہ بڑی بیتابی سے اُسے تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ وہ اپنے بیٹے عکرمہ کے ساتھ ایک جگہ کھڑا تھا کہ اُنھیں نظر آ گیا۔ دونوں بھائی عقاب کی طرح اُس پر جھپٹے۔ معاذ رضی اللہ عنہ کی تلوار بلند ہوئی، ابوجہل نے بچنا چاہا، معاذ کا ہاتھ اوچھا پڑا اور تلوار سر یا گردن کی بجائے اُس کی ٹانگ پر لگی اور اُسے جسم سے الگ کر ڈالا۔ عکرمہ باپ کی مدد کو آگے بڑھا اور معاذ رضی اللہ عنہ پر حملہ آور ہُوا، اُس کے ایک کاری وار نے باپ کا حساب چکتا کیا اور معاذ رضی اللہ عنہ کا ایک بازو کاندھے سے کٹ کر ایک جانب لٹک گیا۔ شیر زخمی ہو کر بپھر گیا، کٹ کر جسم کے ساتھ لٹکتا ہُوا ہاتھ لڑائی میں رکاوٹ بننے لگا تو معاذ رضی اللہ عنہ نے اُس پر پاؤں رکھ کر اُسے کھینچا اور جسم سے الگ کر دیا اور اپنے شکار پر پھر حملہ آور ہوئے۔ [1]

اس کے برعکس قاضی عیاض ابن وہب یوں روایت کرتے ہیں کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ جب حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو اُن کا ہاتھ اُن کی کھال سے لٹکا ہُوا تھا۔ حضور ﷺ نے اپنا لعابِ دہنِ مبارک اُس پر لگا کر اُس کی جگہ چسپاں کر دیا اور وہ ٹھیک ہو گیا۔ [2]

بروایتے، معاذ رضی اللہ عنہ اور معوذ رضی اللہ عنہ دونوں بھائی ابوجہل پر جھپٹ رہے تھے، حضرت معوذ رضی اللہ عنہ نے ایک کاری وار کر کے اُسے زمیں بوس کر دیا، وہ سمجھے کہ یہ ملعون ہلاک ہو گیا ہے لیکن اُس شیطان میں ابھی کچھ جان باقی تھی۔ دونوں بھائی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اُس کے قتل کی خبر دی۔ حضور ﷺ نے دریافت فرمایا کہ تم میں سے اُس کا قتل کس

---

[1] ابوجعفر محمد بن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ھ)، تاریخ طبری، ج ۲ حصہ اول ص ۱۴۶

[2] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۱۲۶

نے کیا ہے؟ دونوں میں سے ہر ایک کا دعویٰ تھا کہ ابو جہل کو اُس نے مارا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے پوچھا کہ کیا تم نے اپنی تلواریں صاف کر لی ہیں؟ اُنھوں نے عرض کیا کہ ابھی نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ اپنی تلواریں دکھاؤ۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے تلواروں کو ملاحظہ کر کے فرمایا کہ تم دونوں ہی نے اُسے مارا ہے۔ بروایتے حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ ابو جہل پر پہنچے تو دیکھا کہ وہ ابھی مرا نہیں اور اس میں رَمق باقی ہے تو اُنھوں نے سر قلم کر کے اُس کا قِصّہ تمام کر دیا۔

احادیثِ صحیحہ میں اس کا ذِکر یوں بیان کیا گیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ کون ہے جو جا کر ابو جہل کی خبر لائے؟ اس پر حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ گئے اور اُنھوں نے اُسے میدان میں (قریب المرگ) پڑا ہُوا پایا تو وہ اُس کے سینۂ پُر کینہ پر سوار ہوئے اور اُس کی ناپاک داڑھی کو پکڑ کر کہا کہ تُو ہی ابو جہل ہے، اللہ نے تجھے رسوا کیا اے دُشمنِ خدا! اُس نے کہا کہ اِس سے زیادہ کچھ نہیں کہ ایک شخص کو اُس کی قوم نے مار ڈالا، کاش مجھے کسی غیر دہقانی نے مارا ہوتا (چونکہ انصار اہل زراعت تھے اس لیے وہ اُن کو دہقانی کہہ رہا تھا)۔ پھر حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے اُس بد بخت کا سر قلم کیا اور اُسے لے کر حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اُس کا کٹا ہُوا سر دیکھ کر فرمایا، ''اَللّٰہُ الَّذِیْ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ'' (اللہ ہی ہے جس کے سوا کوئی معبود و مطلوب و مقصود نہیں)، پھر فرمایا، ''اللہ ہی عظیم ہے اللہ ہی کے لیے حمد و ثنا ہے جس نے اپنا وعدۂ نصرت پورا کیا، اپنے بندے کی مدد فرمائی اور اُس یگانہ و یکتا خدا نے تمام باطل گروہوں کو شکست دی۔'' بروایتے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے یہ بھی فرمایا کہ اس اُمت کا فرعون مر گیا۔ ایک روایت میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے سجدۂ شکر ادا کیا چنانچہ اسی لیے بعض فقہا نعمت کے ظہور اور آفات و بلیات کے دفع ہونے کے وقت سجدۂ شکر کے مستحب ہونے کے قائل ہیں۔[1]

حضرت معوذ رضی اللہ عنہ اُسی روز بدر کے معرکہ ہی میں شہید ہو گئے لیکن حضرت معاذ رضی اللہ عنہ، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دَور تک زندہ رہے۔

---

[1] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۱۲۶

اُمیہ بن خلف کا انجام

اُمیہ بن خلف کا شمار قریش کے اکابرین میں ہوتا تھا۔ یہی وہ ظالم تھا جو حضرت بلال حبشی رضی اللہ عنہ پر ظلم کے پہاڑ توڑا کرتا تھا۔ وہ جناب بلال رضی اللہ عنہ کو مکّہ کے ریگستانوں میں لے جاتا اور دوپہر کی چلچلاتی دھوپ میں جلتی ہوئی ریت پر بے لباس کر کے لٹا دیتا پھر اُن کے ایمان سے منور سینے پر بھاری پتھر رکھ دیتا، کوڑوں سے مارتا اور کہتا کہ دینِ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو چھوڑ دو میں تمھیں چھوڑ دوں گا۔ جواب میں سراپا ایمان حضرت بلال رضی اللہ عنہ کہتے ''اَحداَحد'' یعنی اللہ ایک، اللہ ایک۔

اُس سفاک کو حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے میدانِ بدر میں دیکھا، وہ اپنے بیٹے کے ساتھ ایک مسلمان عبدالرحمٰن بن عوف کے پاس موجود تھا۔ بلال رضی اللہ عنہ پکار اُٹھے، ''ارے یہ تو راس الکفر اُمیہ بن خلف ہے، بچ کے جانے نہ پائے۔'' عبدالرحمٰن بن عوف نے کہا کہ یہ میرا قیدی ہے۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کہنے لگے کہ ہُوا کرے لیکن اب یہ زندہ نہیں بچے گا۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے ساتھیوں کو پکارا، ''اے انصارِ خدا! یہ راس الکفر اُمیہ بن خلف ہے، زندہ نہ جانے پائے۔'' چنانچہ مجاہدین کے ایک گروہ نے اُس کو گھیرے میں لے لیا، عبدالرحمٰن بن عوف نے اُسے بچانے کی بہت کوشش کی لیکن دونوں باپ بیٹا مارے گئے۔[۱] بروایتے اُمیہ بن خلف، حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں قتل ہُوا۔[۲]

عقبہ بن ابی معیط کا انجام

عقبہ بن ابی معیط وہی ملعون تھا جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خانہ کعبہ میں نماز پڑھتے ہوئے سخت اذیت پہنچائی تھی۔ رسولِ گرامی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سجدے میں تھے کہ اس ملعون نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گلوئے اقدس میں اپنی چادر ڈال کر بل دینے شروع کر دیے تھے۔ جنگ میں یہ

---

[۱] ابوجعفر محمد بن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ھ)، تاریخ طبری، ج ۲ ص ۱۴۲

[۲] علامہ علی نقی نقوی، تاریخ اسلام، ص ۲۰۸

گرفتار ہوگیا تھا جسے بعد میں بدر سے واپسی پر عرق الطبیہ کے مقام پر حضرت عاصم بن ثابت بن الالح فلح انصاری ؓ نے قتل کر کے فی النار کر دیا۔

ابوالبختر ی بن ہشام کا قتل

اس کا پورا نام ابوالبختر ی عاص بن ہشام بن حارث بن اسد تھا۔ کہا جاتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے لیے اس کے دل میں نرم گوشہ تھا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے قیامِ مکّہ کے دوران میں اس نے کبھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے بدسلوکی نہیں کی، ایذا نہیں پہنچائی اور کوئی ایسی بات نہیں کی جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو ناگوار گذرے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر جب قریش ظلم و ستم کرتے تھے تو یہ اُنھیں منع کیا کرتا تھا۔ شعبِ ابی طالب میں محاصرے کے وقت بنو ہاشم سے قطع تعلق کا جو معاہدہ کیا گیا تھا اُسے منسوخ کرانے میں بھی اس کا بہت عمل دخل تھا۔ اور بھلا یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ محسنِ انسانیت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کسی انسان کی، خواہ وہ مشرک یا دشمن ہی کیوں نہ ہو، نیکی کو فراموش کر دیں؟ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے بدر میں اُسے دیکھا تو مسلمانوں کو اُس کے قتل سے منع فرما دیا۔

میدانِ جنگ میں جب اُس کا سامنا ایک انصاری مجاہد مجذر بن زیاد بلوی سے ہُوا تو اُس کا بھانجا جنادہ بن ملیحہ بنت زہیر بن حارث بن اسد بھی اُس کے ہمراہ تھا۔ مجذر نے ابوالبختر ی سے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ہمیں تمھارے قتل سے منع فرمایا ہے اس لیے میں تمھیں موقع دیتا ہوں کہ تم یہاں سے نکل جاؤ۔ ابوالبختر ی کہنے لگا کہ میرے ساتھی کے بارے میں کیا حکم ہے؟ مجذر نے کہا کہ ہمیں صرف تمھارے قتل سے منع کیا گیا ہے، اُس کے بارے میں ایسا کوئی حکم نہیں۔ ابوالبختر ی بولا یہ نہیں ہوسکتا کہ میں اُسے چھوڑ کر نکل جاؤں، قریش کی عورتیں مکّہ میں کہتی پھریں گی کہ میں نے اپنی جان بچانے کے لیے اپنے ساتھی کو مروا دیا۔ اُسے مقابلے پر آمادہ دیکھ کر مجذر نے اُسے ہتھیار ڈالنے کو کہا لیکن اُس نے بغیر لڑے گرفتاری دینے سے انکار کر دیا اور ایک رجز پڑھا جس کا مطلب تھا کہ شریف آدمی جان دے دیتا ہے لیکن اپنے ساتھی

کو دشمن کے مقابلے میں تنہا نہیں چھوڑتا۔ چنانچہ دونوں لڑ پڑے اور انجام کار وہ مجذر بن زیاد کے ہاتھوں مارا گیا۔ مجذر، رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ قسم ہے اُس ذات کی جس نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو حق پر مبعوث کیا، میں نے اپنی طرف سے پوری کوشش کی کہ اُسے زندہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت میں پیش کروں لیکن اُس نے مجھے لڑائی پر مجبور کر دیا اور نہ چاہتے ہوئے بھی میرے ہاتھ سے مارا گیا۔[1]

یہ مجذر کی جلد بازی یا ابوالبختری کی بدقسمتی تھی کہ وہ قتل ہوگیا۔ اگر مجذر خود سے فیصلہ کرنے کی بجائے اُسے کہتے کہ چلو نبی اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہو کر اپنے عزیز کے لیے بھی امان طلب کرو تو عین ممکن تھا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم دونوں کو پناہ دے دیتے۔

ابولہب کا انجام

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:[2]

تَبَّتْ يَدَآ اَبِيْ لَهَبٍ وَّتَبَّ ۝١ مَآ اَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ ۝٢ سَيَصْلٰى نَارًا ذَاتَ لَهَبٍ ۝٣ وَّامْرَاَتُهٗ ۭ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ ۝٤ فِيْ جِيْدِهَا حَبْلٌ مِّنْ مَّسَدٍ ۝٥

(ابولہب کے ہاتھ ٹوٹ جائیں اور وہ ہلاک و برباد ہو جائے۔ اُس کا مال اور جو کچھ اُس نے کمایا وہ اُس کے کچھ کام نہ آیا۔ وہ عنقریب بھڑکتی ہوئی آگ میں ڈالا جائے گا۔ اور (اُس کے ساتھ) اُس کی بیوی بھی جو ایندھن اُٹھانے والی ہے۔ اُس کی گردن میں بٹی ہوئی رسی بندھی ہوئی ہے۔)

چنانچہ ابولہب ہلاک ہو گیا اور واصلِ جہنم ہُوا۔

اگرچہ ابولہب کی موت جنگِ بدر میں واقع نہیں ہوئی تھی لیکن اُس کے انجام کا تعلق بالواسطہ بدر سے یوں ہے کہ جنگِ بدر کے حالات سنتے ہوئے وہ طیش میں آگیا تھا اور ایک ضعیف

---

[1] ابوجعفر محمد بن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ھ)، تاریخ طبری، ج ۲ ص ۱۴۴

[2] سُورَةُ الْمَسَدِ (سُورَةُ اللَّهَبِ)

مسلمان کو پیٹنے لگا۔ حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ کی زوجہ اُمّ فضل نے ضعیف کو بچانے کے لیے اُس کے سر پر ایک چوب دے ماری جس کے لگنے کے سات دن بعد وہ مر گیا۔ اس واقعے کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے:

منقول ہے کہ جب حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی فتح اور کافروں کی شکستِ فاش کی خبر مکّہ پہنچی تو ابولہب وغیرہ نے سخت حیرت وتعجب کا اظہار کیا۔ ابوسفیان بن حارث مکّہ پہنچا تو ابولہب نے بیتابی سے پوچھا، ''بھتیجے! آؤ، تمھاری خبر مستند ہوگی۔'' ابوسفیان نے کہا، ''چچا! جب ہم نے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کے اصحاب سے مقابلہ کیا تو ہم سب اپنی جگہ ساکت وجامد ہو کر رہ گئے، ہم دیکھتے رہ جاتے اور وہ ہمارے ہتھیار ہمارے جسموں سے اُتار لیتے اور ہمارے ہاتھوں کو باندھ دیتے۔ ہم نے زمین وآسمان کے درمیان سفید لباس لوگوں کو دیکھا جو ابلق گھوڑوں پر سوار تھے اور کوئی اُن کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا تھا۔'' حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے غلام ابورافع رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ (ابوسفیان کی بات سُن کر) میں نے کہا کہ بخدا وہ تو فرشتے تھے۔ اس پر ابولہب سخت غصے میں آ گیا، اُس نے میرے منہ پر زوردار طمانچہ مارا، مجھے اُٹھا کر زمین پر پٹخ دیا اور پھر میرے سینے پر چڑھ کر لاتیں مارنے لگا حال آنکہ میں بوڑھا اور ناتواں شخص تھا اور اُس کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ عباس رضی اللہ عنہ کی زوجہ اُمّ الفضل رضی اللہ عنہا نے جو میرا یہ حال دیکھا تو ایک موٹی چوب اُٹھا کر ابولہب کے سر پر دے ماری اور وہ ذلیل وخوار ہو کر اپنے گھر چلا گیا۔ سات دن کے بعد ''عدسہ'' کی بیماری نے اُس پر حملہ کیا اور وہ مر گیا۔ عرب اس بیماری کو متعدی سمجھتے تھے اس لیے اُس کے مرنے کے بعد خوف کی وجہ سے کوئی بھی اُس کے قریب نہ گیا اور وہ تین دن تک مُردہ حالت میں یونہی پڑا رہا۔ پھر اُجرت پر مزدور بلائے گئے جو اُسے اُٹھا کر مکّہ سے باہر لے گئے، ایک گڑھا کھود کر اُس میں ڈالا اور گڑھے کو بند کر کے اُس پر پتھر رکھ دیے۔[1]

---

[1] ابوجعفر محمد بن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ھ)، تاریخ طبری، ج ۲ ص ۱۸۸
شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۱۳۳

شہدائے بدر کے اسمائے گرامی

جنگِ بدر میں چودہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے جامِ شہادت نوش کیا جن میں چھ مہاجرین اور آٹھ انصار تھے۔ انصارین میں چھ قبیلہ خزرج کے لوگ تھے اور دو قبیلہ اوس کے۔[1]

''ویکی پیڈیا آزاد دائرۃ المعارف'' کے مطابق شہدائے بدر کے نام اور مختصر تعارف مندرجہ ذیل ہے۔ یہی نام دیگر کتب میں بھی ملتے ہیں اور بدر کے مقام پر نصب ایک کتبے پر بھی درج ہیں:

۱) جناب عبیدہ بن حارث بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ: یہ بنی ہاشم میں سے تھے اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے رشتہ دار تھے۔ بروایتے سب سے پہلے اسلامی سریہ (سریہ عبیدہ بن حارثؓ، اس کا ذِکر اُوپر گذر چکا ہے) کے سردار یہی تھے۔ شہادت کے وقت اِن کی عمر ۶۳ سال تھی۔

۲) جناب مہجع بن صالح رضی اللہ عنہ: مروی ہے کہ یہ پہلے شہید تھے۔ جب آغازِ جنگ تیروں سے ہُوا تو ایک تیر ان کو آ لگا اور یہ شہید ہو گئے۔[2]

۳) جناب حارث یا (حارثہ) بن سراقہ بن حارث رضی اللہ عنہ: یہ بنی عدی بن نجار میں سے تھے، اِن کی والدہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی پھوپھی تھیں۔ یہ حوض پر پانی پی رہے تھے کہ ایک تیر ان کے حلق میں لگا۔ بقولے جناب مہجع بن صالح رضی اللہ عنہ کے بعد ان کو تیر لگا تھا۔[3]

۴) جناب عمیر بن حمام بن جموح بن زید بن حرام رضی اللہ عنہ: یہ بنی سلمہ میں سے تھے۔ انھوں نے حضرت عبیدہ بن حارث رضی اللہ عنہ کے ساتھ مواخات کی تھی۔ دونوں ایک ہی میدان میں سرخرو ہو کر رونق افروزِ جنّت ہُوئے۔

۵) جناب ذو الشمالین عمیر بن عبد عمیر بن نضلہ رضی اللہ عنہ: ان کا نام عمیر اور لقب ذو الشمالین تھا۔ اِن کی کنیت ابو محمد تھی۔ یہ قبیلہ بنو زہرہ کے حلیف تھے۔

---

[1] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۱۳۴

[2] ابوجعفر محمد بن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ھ)، تاریخ طبری، ج ۲ ص ۲۱۸

[3] ابوجعفر محمد بن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ھ)، تاریخ طبری، ج ۲ ص ۲۱۸

۶) جناب عمیر بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ: یہ سعد بن ابی وقاص کے بھائی تھے۔ شہادت کے وقت ان کی عمر صرف ۱۶ سال تھی۔ بروایتے نبی اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اِن کو کم عمری کی بنا پر جنگ سے واپس کرنا چاہا تو یہ رونے لگے اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اجازت مرحمت فرمادی۔

۷) جناب عوف (عوذ) بن عفرا رضی اللہ عنہ یا عوف (عوذ) بن الحارث رضی اللہ عنہ: یہ انصاری صحابی تھے۔ اِن کی والدہ کا نام عفرا اور والد کا نام حارث تھا۔ کچھ روایات میں اِن کے نام کے ساتھ اِن کی والدہ کا نام آیا اور بعض میں والد کا نام آیا ہے۔

۸) جناب معوذ بن عفرا رضی اللہ عنہ یا معوذ بن الحارث رضی اللہ عنہ: یہ عوف بن عفرا رضی اللہ عنہ کے بھائی تھے۔ اُن کے نام کی طرح اِن کا نام بھی روایات میں دونوں طرح آیا ہے۔

۹) جناب عاقل بن البکیر بن عبد یالیل رضی اللہ عنہ

۱۰) جناب ابنِ حارث بن قیس رضی اللہ عنہ: ان کا پورا نام یزید بن حارث تھا۔ یہ انصاری صحابی تھے۔

۱۱) جناب رافع بن معلیٰ بن لوذان: یہ بھی انصاری صحابی تھے۔

۱۲) جناب مبشر بن عبد المنذر بن زبیر بن زید رضی اللہ عنہ: یہ بھی انصاری صحابی تھے۔

۱۳) جناب سعد بن خیثمہ انصاری رضی اللہ عنہ: اِن کی کنیت ابو عبد اللہ اور لقب سعد الخیر تھا۔ اِن کے والد نے انھیں جنگ پر جانے سے روکا تھا، بروایتے اِن کی جگہ وہ خود جانا چاہتے تھے لیکن انھوں نے کہا کہ مجھے جنّت میں جانے سے نہ روکو۔ اِن کے والد حضرت خیثمہ رضی اللہ عنہ غزوۂ اُحد میں شہید ہوئے۔

۱۴) جناب عمار بن زیادہ بن رافع انصاری رضی اللہ عنہ یا جناب صفوان بن وہب رضی اللہ عنہ: بعض کتابوں میں جناب صفوان رضی اللہ عنہ کا ذِکر آیا ہے اور بعض میں جناب عمار رضی اللہ عنہ کا۔

ان شہدائے بدر میں سے تیرہ تو میدانِ بدر ہی میں مدفون ہوئے مگر حضرت عبیدہ بن حارث رضی اللہ عنہ نے چونکہ بدر سے واپسی پر منزل "صفراء" میں وفات پائی اس لیے اُن کی قبر بھی اُسی مقام پر ہے۔ تاریخِ عالم کی اس عظیم اور فیصلہ کن جنگ میں طرفین کا جانی نقصان اس قدر کم ہونے کی وجہ جناب رحمۃٌ للعالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صلۂ رحمی اور بہترین جنگی حکمت عملی تھی۔

بدر سے واپسی

روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ جہاں دشمنوں پر غلبہ اور فتح پاتے تو تین روز اُسی میدان میں قیام فرماتے تھے چنانچہ بدر میں بھی حضور ﷺ نے تین روز قیام فرمایا، تیسرے دن آپ ﷺ نے اپنی سواری طلب فرمائی، سواری پیش کی گئی اور آپ ﷺ سوار ہوئے، صحابہؓ کی ایک جماعت بھی آپ ﷺ کے ہمراہ چلی یہاں تک کہ آپ ﷺ اُس کنویں پر تشریف لائے جس میں کفّار کی لاشوں کو ڈالا گیا تھا۔ آپ ﷺ نے لاشوں میں سے ہر ایک کا نام لے کر فرمایا، ''تم بدخویش وناعاقبت اندیش ہو کہ تم نے مجھے جھٹلایا.... الخ''اس پر حضرت عمرؓ نے کہا کہ یارسول اللہ (ﷺ)! آپ اُن جسموں کو مخاطب فرمارہے ہیں جن میں رُوحیں نہیں ہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ قسم ہے اُس خدا کی جس کے قبضے میں میری جان ہے، تم ان سے زیادہ اس بات کے سننے والے نہیں ہو، جو کچھ میں خطاب کر رہا ہوں وہ خوب سُن رہے ہیں لیکن وہ جواب نہیں دے سکتے۔ [1]

رسول اللہ ﷺ بدر سے عازمِ مدینہ ہوئے تو جنگ میں حاصل ہونے والا مالِ غنیمت بھی آپ ﷺ کے ہمراہ تھا۔ مالِ غنیمت کی نگرانی آپ ﷺ نے حضرت عبداللہ بن کعب بن زید کو تفویض کی۔ آپ ﷺ نے صفراء کی گھاٹی کو عبور کر کے صفراء اور ناریہ کے بیچ واقع سیر نامی سرخ ریت کے ٹیلے پر قیام فرمایا اور مالِ غنیمت سب مسلمانوں میں تقسیم کیا۔ یہاں آپ ﷺ کے لیے چشمہ آب ارواق سے پانی لایا گیا۔ جب آپ ﷺ مقامِ روحا پر پہنچے تو مدینہ کے مسلمان آپ ﷺ کے استقبال کے لیے حاضر ہوئے اور آپ ﷺ کو فتح کی مبارکباد پیش کی۔ [2]

---

[1] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۱۳۴

[2] ابوجعفر محمد بن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ھ)، تاریخ طبری، ج ۲ حصّہ اوّل ص ۱۴۹

نبی اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے حجام حضرت ابو ہند انصاری رضی اللہ عنہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم بدر سے واپسی پر صفراء اور روحا کے بعد غرق انطبیہ تشریف لائے تو حضرت ابو ہند انصاری رضی اللہ عنہ دُودھ، مسکہ کی کھیر اور کھجور لے کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ یہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے حجام تھے اور کسی سبب سے جنگِ بدر میں شریک نہیں ہو سکے تھے جب کہ اُنھوں نے باقی تمام غزوات میں شرکت کی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اُن کو دیکھ کر مسرت کا اظہار کیا اور مسلمانوں سے فرمایا کہ ابو ہند انصار میں سے ہیں تم ان کو اپنی بیٹیاں دو اور ان کی لو (یعنی ان سے رشتہ داری قائم کرو) چنانچہ صحابہؓ نے اس حکم پر عمل کیا۔ یہاں سے رخصت ہو کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم مدینہ تشریف لائے۔[1]

اسیرانِ بدر

اس غزوے میں کفّار کے مقتولین کی تعداد ستر (۷۰) تھی اور تقریباً اتنے ہی اسیر تھے۔[2] مدینہ طیبہ پہنچ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اُن اسیران کو خوشحال صحابہؓ میں تقسیم کر دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے صحابہؓ کو اُن کے قیام وطعام کی ذمہ داری سونپتے ہوئے فرمایا کہ ان کے ساتھ اچھا سلوک کرنا۔ اُس وقت اسلامی حکومت اگرچہ قائم ہو چکی تھی، جس کا ایک دستور اور آئین (میثاقِ مدینہ) بھی تھا لیکن اُس مملکت میں کوئی قید خانہ نہیں تھا۔ رُوئے زمین پر شاید یہ پہلی اور آخری سلطنت ہو گی جس میں قید خانہ نہیں تھا اور یہ بھی جناب رحمۃً للعالمین صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی انسانیت پر کی گئی رحمتوں میں سے ایک ایسی رحمت ہے جس کی نظیر نہیں ملتی۔

کفّار کے قیدیوں میں سے ایک قیدی، ابوعزیز بن عمیر بن ہاشم سے مروی ہے کہ جب قیدیوں کو بدر سے مدینہ لایا گیا تو مجھے انصاریوں میں رکھا گیا۔ وہ میرے ساتھ ایسا برتاؤ کرتے کہ جب صبح وشام کھانا کھانے بیٹھتے تو روٹی مجھے کھلاتے اور خود کھجور پر اکتفا کرتے، جس کے پاس

---

[1] ابوجعفر محمد بن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ھ)، تاریخ طبری، ج ۲ حصہ اوّل ص ۱۴۹

[2] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۱۳۴

روٹی ہوتی وہ مجھے دے دیتا اور مجھے شرم آتی کہ میں اکیلا روٹی کھاؤں لہٰذا میں انکار کردیتا مگر وہ اُسے پھر مجھے دے دیتے۔ [1] (واضح رہے کہ عرب میں کثرتِ پیداوار کی بنا پر کھجور کو ایک عام خوراک سمجھا جاتا تھا جب کہ گندم کم یاب ہونے کی وجہ سے روٹی کو خاص اہمیت حاصل تھی۔)

اسیرانِ قریش میں سے بعض ایمان لے آئے تھے۔ بقولے، حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے چچا حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ بھی اُن میں شامل تھے جب کہ اربابِ سیر بیان کرتے ہیں کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ پہلے سے ہی مسلمان تھے لیکن اُنھوں نے اپنے اسلام کو پوشیدہ رکھا ہُوا تھا۔ روایات میں ملتا ہے کہ کفّار کے درمیان رہتے ہوئے وہ مشرکوں کی خبریں لکھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو بھیجا کرتے تھے۔ مروی ہے کہ وہ تو رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی بارگاہ میں حاضر رہنا چاہتے تھے لیکن آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اُن کو پیغام بھیجا کہ تمھارا وہیں ٹھہرے رہنا بہتر ہے۔ [2]

منقول ہے کہ مسلمانوں نے اسیرانِ بدر کی مشکیں کس رکھی تھیں۔ رات آئی تو حضرت عباس رضی اللہ عنہ مشکوں کی بندش سے کراہنے لگے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اُن کے کراہنے کی آواز سُنی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم بے چین ہوگئے اور آرام میں خلل آنے لگا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم! آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم استراحت کیوں نہیں فرمارہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ اپنے چچا عباس کے کراہنے کی وجہ سے۔ اصحابؓ نے جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی بے چینی دیکھی تو فوراً حضرت عباس کے بند ڈھیلے کر دیے، پس کچھ سکون ملا تو عباس رضی اللہ عنہ سو گئے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے دریافت فرمایا کہ کیا بات ہے؟ عباس کی آواز کیوں نہیں آرہی؟ صحابہؓ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اُن کے بند ڈھیلے کردیے گئے ہیں۔ اس پر جناب رحمتِ دوعالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ تمام اسیروں کی بندشیں ڈھیلی کردی جائیں۔ [3]

---

[1] ابوجعفر محمد بن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ھ)، تاریخ طبری، ج ۲ حصّہ اوّل ص ۱۵۰

[2] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۱۳۸

[3] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۱۳۸

اُس دَور میں جنگی قیدیوں کے ساتھ انتہائی بہیمانہ سلوک کیا جاتا تھا۔ اُن پر تشدد کیا جاتا اور جسم کے بعض اعضا و جوارح کاٹ دیے جاتے تھے یا قتل کر دیا جاتا تھا مگر عالمین کے لیے رحمت بن کر مبعوث ہونے والے رسولِ اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عفو و درگزر اور رحم و کرم سے کام لیا اور قیدیوں کے ساتھ حسنِ سلوک اور نرمی سے پیش آنے کا حکم دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قیدیوں کے ساتھ حُسنِ سلوک انسانی اقدار کے حوالے سے اس قدر شاندار عمل تھا کہ تیرہ سو سال بعد اقوامِ متحدہ کے دستور کی ایک اہم شق بن گیا۔

مروی ہے کہ حضرت عمر بن خطابؓ نے ایک قیدی سہیل بن عمرو (جو اپنی قوم میں بہت بڑا خطیب سمجھا جاتا تھا) سے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا کہ مجھے اجازت دیجیے کہ میں اس کے نیچے والے دو دانت اُکھاڑ دوں تاکہ یہ آئندہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی مخالفت میں تقریر نہ کر سکے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ مُثلہ کرنا جائز نہیں، اگر میں اس کا کوئی عضو قطع کروں گا تو میرے نبی ہونے کے باوجود (روزِ محشر) اللہ عزوجل میرے اعضا کو قطع کرے گا۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ بھی فرمایا کہ ممکن ہے اس کا زورِ خطابت کبھی حق کی حمایت میں ہو۔ پس سہیل بن عمرو کو بغیر کوئی جسمانی ضرر پہنچائے رہا کر دیا گیا۔ [۱]

اسیرانِ بدر کی رہائی

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مالدار قیدیوں کو فدیہ کے عوض رہا کر دیا، جو قیدی زرِ فدیہ ادا نہیں کر سکتے تھے مگر پڑھے لکھے تھے اُن کا فدیہ یہ مقرر فرمایا کہ وہ ناخواندہ مسلمانوں کو ایک مقررہ مدت تک تعلیم دیں اور جو لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے اور نادار بھی تھے اُنھیں بغیر فدیہ کے ویسے ہی چھوڑ دیا گیا۔ [۲]

---

[۱] علامہ علی نقی نقوی، تاریخ اسلام ص ۲۰۷ بحوالہ ابو جعفر محمد بن جریر طبری، تاریخ طبری، ج ۲ ص ۲۸۹

[۲] علامہ علی نقی نقوی، تاریخ اسلام ص ۲۱۰۔ خواجہ محمد لطیف، اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ، ج ۱ ص ۸۸

بعض مؤرّخین لکھتے ہیں (جن کے بیان سے ہمیں اتفاق نہیں۔مؤلف) کہ قیدیوں کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے کچھ اصحاب سے مشورہ کیا اور اُس پر عمل کرتے ہوئے زرِفدیہ لےکر قیدیوں کو رہا کیا اور بعد میں اس پر پشیمان ہوئے اور گریہ بھی کیا کہ فدیہ قبول کر لینے پر عنقریب عذابِ الٰہی نازل ہوگا۔

ہمیں اس روایت سے اس لیے اتفاق نہیں کہ ایسا ہو ہی نہیں سکتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کوئی ایسا کام کریں جو حکمِ الٰہی کے خلاف ہو بلکہ کام تو دُور کی بات ہے ہمارے نزدیک تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ہر قول بھی قولِ خدا ہوتا تھا جیسا کہ سورۃ النجم میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:[۱]

وَالنَّجْمِ إِذَا هَوَىٰ ○ مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوَىٰ ○ وَمَا يَنطِقُ عَنِ الْهَوَىٰ ○ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُوحَىٰ ○ (قسم ہے ستارے کی جب وہ ٹوٹا۔ تمھارا ساتھی نہ گمراہ ہُوا ہے اور نہ بہکا اور وہ اپنی خواہش سے کلام بھی نہیں کرتا ہے۔اُس کا کلام وہی وحی ہے جو مسلسل نازل ہوتی رہتی ہے)

اور مدارج النبوّت میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی لکھتے ہیں، ''حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ہر قول و فعل حکمِ الٰہی کا تابع ہوتا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم فعل و ترک، لطف و قہر اور عفو و اخذ میں سے کوئی بھی چیز اللہ کے حکم کے بغیر نہ کرتے تھے اور کوئی بات اپنی مرضی و خواہش کے مطابق نہ کرتے تھے اور جو کچھ بھی ہوتا اُسے تقدیرِ الٰہی اور حکمِ خدا قرار دیتے تھے۔[۲] پس یہ نہیں ہوسکتا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہمارے جیسے عام انسانوں کی طرح خلافِ شریعت کوئی کام کریں اور پھر عذابِ الٰہی کے خوف سے پچھتانے بیٹھ جائیں۔

ایک اہم نکتہ: شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے مندرجہ بالا بیان کے دوسرے حصے، ''آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کوئی بات اپنی مرضی و خواہش کے مطابق نہ کرتے تھے'' سے ہم یہ مراد نہیں لیتے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی اپنی کوئی مرضی و خواہش تھی ہی نہیں بلکہ ہم اس سے یہ مطلب اخذ کرتے

---

[۱] سورۃ النجم آیت نمبر ۱ تا ۴

[۲] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۱۳۷

ہیں کہ آپ ﷺ کی ہر مرضی و خواہش حکمِ الٰہی کے مطابق ہوتی تھی اور جو آپ ﷺ کی خواہش ہوتی تھی وہی رضائے الٰہی ہوتی تھی یعنی اللہ کی رضا میں آپ ﷺ کی رضا اور آپ ﷺ کی رضا میں اللہ کی رضا ہوتی تھی، جیسا کہ ارشادِ الٰہی ہوتا ہے:[۱]

''تُرْجِیْ مَنْ تَشَآءُ مِنْهُنَّ وَتُـْٔوِیْٓ اِلَیْكَ مَنْ تَشَآءُ ؕ وَمَنِ ابْتَغَیْتَ مِمَّنْ عَزَلْتَ فَلَا جُنَاحَ عَلَیْكَ ؕ ذٰلِكَ اَدْنٰٓی اَنْ تَقَرَّ اَعْیُنُهُنَّ وَلَا یَحْزَنَّ وَیَرْضَیْنَ بِمَآ اٰتَیْتَهُنَّ كُلُّهُنَّ ؕ وَاللّٰهُ یَعْلَمُ مَا فِیْ قُلُوْبِكُمْ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِیْمًا حَلِیْمًا ﴿۵۱﴾''

(اے حبیب ﷺ! تم) پیچھے ہٹاؤ ان میں سے جسے چاہو اور اپنے پاس جگہ دو جسے چاہو اور جسے تم نے کنارے کر دیا تھا اُسے تمھارا جی چاہے تو اس میں بھی تم پر کچھ گناہ نہیں یہ امر اس سے نزدیک تر ہے کہ ان کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں اور غم نہ کریں اور تم انھیں جو کچھ عطا فرماؤ اُس پر وہ سب کی سب راضی رہیں اور اللہ جانتا ہے جو تم سب کے دِلوں میں ہے، اور اللہ علم و حلم والا ہے۔)

سریۂ عمیر بن عدی

(رمضان المبارک سنہ ۲ ہجری)

مدینہ کے نواح میں ایک یہودی ہجو گو شاعرہ عصماء بنت مروان خطمیہ رہتی تھی۔ وہ یزید بن خطمی کی بیوی تھی، نہایت بد کردار اور زبان دراز تھی اور اپنی ہرزہ سرائی سے جناب رسول اللہ ﷺ کو سخت اذیّت پہنچایا کرتی تھی۔ وہ اپنے شعروں کے ذریعے اسلام اور اہلِ اسلام کی بُرائیاں کرتی اور اپنی قوم کو مسلمانوں کے خلاف جنگ پر اُکسایا کرتی تھی۔ اُس کی یاوہ گوئی اور اشتعال انگیز شاعری کسی وقت بھی مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان بہت بڑے تصادم کا سبب بن سکتی تھی جس کی وجہ سے کئی قیمتی جانوں کا ضیاع ہو سکتا تھا۔ اس لیے ضروری تھا کہ اُس فتنے کو فوراً فرو کیا جاتا اور کئی لوگوں کی جان بچانے کے لیے اُس ایک شر پسند کو ہی خاموش

---

[۱] سورۃ الاحزاب، آیت ۵۱

کرادیا جاتا۔ پس سنہ دو ہجری میں رمضان المبارک کے مہینے میں حضرت عمیر بن عدی بن خرشہؓ نے اُسے قتل کر کے اُس کی زبان ہمیشہ کے لیے بند کر دی۔[۱]

غزوۂ قرقرۃ الکدریٰ یا غزوۃ الکُدر

(۲۵ رمضان ۲ ہجری/ ۲۰، ۲۱ مارچ ۶۲۴ء)

غزوۂ قرقرۃ الکدریٰ، ۲۵ رمضان ۲ ہجری/ ۲۰، ۲۱ مارچ ۶۲۴ء میں پیش آیا۔[۲] بعض موٴرخین نے اسے ۱۹ محرم سنہ ۳ ہجری میں بھی لکھا ہے۔[۳]

''قرقرۃ'' ہموار زمین کو کہتے ہیں اور ''کدریٰ یا کُدر'' گہرے سرمئی رنگ کے ایک پرندے کا نام ہے۔ یہ غزوہ جس علاقے میں پیش آیا اُس کی زمین ہموار تھی اور وہاں کدریٰ یا کُدر نامی پرندے کی بہتات تھی اس لیے اسے قرقرۃ الکدریٰ یعنی سرمئی پرندوں والی ہموار زمین کہا جاتا تھا اور اس نسبت سے اس غزوہ کو غزوۂ قرقرۃ الکدریٰ یا غزوۃ الکدر کہا جاتا ہے۔

اس علاقے میں قبیلہ بنو سلیم رہتا تھا۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خبر ملی کہ قبیلہ بنو سلیم اور غطفان کے لوگ مدینہ طیبہ پر حملہ آور ہونے کے لیے اکٹھے ہو رہے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اُن کی سرکوبی کے لیے مہاجرین و انصار کی ایک جماعت کے ساتھ روانہ ہوئے۔ لشکر کا علم آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شیرِ خدا حضرت علی مرتضیٰ علیہ السلام کو دیا۔[۴]

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ میں حضرت سباع بن عرفطہ انصاری کو اور بقولے حضرت ابنِ اُمّ کلثوم کو عامل مقرر کیا اور الکدر کی طرف کوچ فرمایا۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم الکدر پہنچے تو وہاں کوئی دشمن نہ ملا چنانچہ چند صحابہ کو اُن کی تلاش میں روانہ کیا اور خود باقی اصحاب کے ساتھ وادیٔ بطن میں

---

[۱] قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری، کتاب: رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ج ۳ ص ۱۸۷

[۲] ڈاکٹر نصیر احمد ناصر، کتاب: پیغمبرِ اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ص ۴۷۱

[۳] علامہ علی نقی نقوی، تاریخ اسلام، ص ۲۱۹

[۴] شیخ عبد الحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۱۴۳

تشریف لے گئے۔ وہاں کچھ چرواہے ملے جو اُونٹوں کو چرا رہے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُن میں سے ایک غلام جس کا نام ''یسار'' تھا، سے پوچھا کہ بنی سلیم اور غطفان کہاں ٹھہرے ہوئے ہیں؟ اُس نے بتایا کہ پہلے تو پانی کے کنارے ٹھہرے ہوئے تھے اب معلوم نہیں کہاں ہیں۔ دراصل بنوسلیم کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیش قدمی کی خبر ہوگئی تھی اور وہ اتنے سراسیمہ ہوئے کہ راتوں رات پہاڑوں میں جا چھپے۔[۱]

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وہاں دو یا تین دن تک قیام فرمایا۔ اس سفر کی مجموعی مدت پندرہ دن تھی۔ بعض مؤرّخ اس غزوہ کو غزوۂ سویق کے بعد بیان کرتے ہیں۔

عید الفطر اور صدقہ فطر

(۲۸ رمضان المبارک ۲ ہجری/ ۲۴ مارچ ۶۲۴ء)

شعبان میں روزے فرض ہوئے تو مہربان رب کی طرف سے روزہ داروں کی خوشی کا سامان بھی ساتھ ہی کر دیا گیا۔ رمضان کا مہینہ ابھی تمام نہیں ہُوا تھا کہ ۲۸ تاریخ (۲۸ رمضان المبارک ۲ ہجری/ ۲۴ مارچ ۶۲۴ء) کو ہی عید الفطر کی نوید سنا دی گئی۔ عید الفطر کی خوشیوں میں غریب و نادار لوگوں کی بھرپور شمولیت کو یقینی بنانے کے لیے دِین نے ہر صاحبِ حیثیت پر صدقہ فطر کو واجب قرار دیا۔ (کن لوگوں پر صدقہ فطر یا زکوٰۃ فطرہ واجب ہے اور کن پر نہیں؟ اور کس طرح ادا کیا جائے؟ تفصیلات کے لیے فقہ کی مستند کتب سے استفادہ کریں۔ مؤلف)

مومنین نے پہلی نمازِ عید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اقتدا میں پڑھی اور عید کا خطبہ سنا۔[۲] یہ پہلی عید مومنین کے لیے عید الفطر بھی تھی، عید آزادی بھی اور عید فتح بھی۔ عید آزادی اس طرح کہ ہجرت کرنے کے بعد قریش کے تسلط سے آزاد ہوئے اور میثاقِ مدینہ کے ذریعے اپنی خود مختار ریاست کو قائم کیا اور عید فتح اس حوالے سے کہ غزوۂ بدر اور غزوۃ الکدر میں فتحیاب ہوئے۔

---

[۱] ابن ہشام (متوفی ۸۳۳ء)، سیرت النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم (اردو)

[۲] مشکوٰۃ، باب صلوٰۃ العیدین۔ محمد ابن سعد (متوفی ۲۳۰ ہجری)، طبقات ابن سعد، ۱:۲۴۸

سریۂ سالم بن عمیر

(۲ ہجری/ ۶۲۴ء)

''المواھبُ اللدنیۃ'' میں غزوۂ قرقرۃ الکدیٰ کے بعد سریۂ سالم بن عمیر بیان کیا گیا ہے۔ یہ سریہ، سریۂ عمیر بن عدی (جس کا ذِکر اُوپر آچکا ہے) سے بہت مماثلت رکھتا ہے۔ اِس میں حضرت سالم بن عمیرؓ ایک یہودی ابی عفکہ کی طرف گئے تھے۔ ابی عفکہ بھی ہجو گو شاعرہ عصماء بنت مروان خطمیہ کی طرح ہرزہ سرائی کر کے لوگوں کو حضور اکرم ﷺ اور اسلام کے خلاف ورغلاتا اور اُبھارتا تھا اور ایسے اشعار کہتا تھا جن میں لوگوں کو حضور ﷺ اور دینِ اسلام سے منحرف کرنے کی ترغیب ہوتی تھی۔ اُس کی اشتعال انگیز شاعری اور تعصب سے بھرپور باتیں مسلمانوں اور یہودیوں کے درمیان تصادم کا باعث بن سکتی تھی اور کئی قیمتی جانوں کا ضیاع ہوسکتا تھا اس لیے ضروری تھا کہ عصماء بنت مروان خطمیہ کی طرح اِس فتنے کو بھی فوراً فرو کیا جاتا اور کئی لوگوں کی جان بچانے کے لیے اِس ایک شیطان کو خاموش کر دیا جاتا۔ چنانچہ حضرت سالمؓ اُس کی طرف گئے اور اس کے جگر میں تلوار گھونپ کر اُسے واصلِ جہنم کر دیا۔[۱]

غزوۂ قینقاع

(۱۵ شوال ۲ ہجری/ ۱۰ اپریل ۶۲۴ء)

یہ غزوہ ۱۵ شوال ۲ ہجری/ ۱۰ اپریل ۶۲۴ء میں ہجرت کے بیسویں مہینہ کے شروع میں، غزوۂ بدر کے ایک ماہ بعد ہُوا۔ قینقاع، مدینہ طیبہ میں واقع یہودیوں کی ایک بستی کا نام تھا جس میں قبیلہ بنو قینقاع رہتا تھا۔

یہودیوں نے حضور اکرم ﷺ سے صُلح کے ایک معاہدے کے تحت مصالحت کر لی تھی

---

[۱] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۱۴۴ بحوالہ المواھبُ اللدنیہ

اور عہد کیا تھا کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ جنگ کریں گے نہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دشمنوں کی مدد کریں گے بلکہ دشمن کے حملے کی صورت میں وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حمایت کریں گے۔ صُلح کے اس معاہدے میں یہودیوں کے تین قبیلے شامل تھے، بنوقریظ، بنونضیر اور بنوقینقاع۔ بنوقینقاع وہ قبیلہ تھا جس نے سب سے پہلے معاہدے کی خلاف ورزی کی۔

روایت ہے کہ ایک نقاب پوش مسلمان عورت بنوقینقاع میں دُودھ بیچنے گئی تھی۔ چند اوباش یہودیوں نے شرارت سے اُس کی نقاب اُلٹ دی اور اُس سے چھیڑ خانی کرنے لگے۔ عورت نے صدائے احتجاج بلند کی تو ایک مسلمان اُس کی مدد کے لیے پہنچا، یہودی اُس پر ٹوٹ پڑے۔ مسلمان شہید ہو گیا اور ایک یہودی بھی مارا گیا۔ مسلمان کے شہید ہوجانے کے باوجود یہودی مزید مشتعل ہو گئے، مسلمانوں کو للکارنے لگے اور خون خرابے پر تُل گئے لیکن مسلمانوں نے نہایت صبر وتحمل اور نظم وضبط کا مظاہرہ کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو واقعے کی خبر کی۔ [1]

''مدارج النبوّت'' میں یہ روایت اس طرح بیان کی گئی ہے کہ ایک مسلمان عورت (قینقاع کے) بازار میں ایک سُنار کے سامنے بیٹھی تھی کہ ایک یہودی نے عقب سے آ کر اُس کا لباس اُٹھایا اور اُس کی پشت کی جانب سے یوں باندھ دیا کہ جب وہ عورت کھڑی ہوئی تو اُس کا ستر کھل گیا اور لوگ اُس پر ہنسنے لگے چنانچہ وہ عورت فریاد کرنے لگی۔ ''المواھبُ اللدنیة'' میں اس فعل کو اُسی سُنار سے منسوب کیا گیا ہے جس کی دُکان پر وہ بیٹھی تھی۔ ایک مسلمان وہاں موجود تھا اُس نے عورت کی فریاد سُن کر تلوار کھینچ لی اور اُس یہودی زرگر کو قتل کر دیا۔ اُس وقت قومِ یہود اکٹھی ہو گئی اور اُس مسلمان پر حملہ آور ہو کر اُسے شہید کر دیا۔ [2]

جب حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اُس واقعے کی خبر ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قومِ یہود کو

---

[1] ڈاکٹر نصیر احمد ناصر، کتاب: پیغمبر اعظم وآخر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ص ۴۸۸

[2] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۱۴۵۔ احمد بن محمد قسطلانی (متوفی ۹۲۳ ہجری)، المواھبُ اللدنیة، ج ۱ ص ۲۵۶۔ السیرۃ النبویہ لابن ھشام، ج ۲ ص ۱۲۱

نصیحت فرمائی کہ اس قسم کی حرکتوں سے باز آجاؤ، امن وسلامتی کی راہ اختیار کرو اور خدا کے غضب سے ڈرو کہ کہیں تم پر بھی وہ عذاب نازل نہ ہو جائے جو قریش پر ہُوا تھا۔[1]

اس پر وہ تمام یہودی، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے رُوبرو بیہودہ گوئی کرنے لگے اور نامعقول باتیں بکنے لگے۔ اُنھوں نے سخت بغض اور حسد وعناد کا اظہار کیا اور کہنے لگے کہ یا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم)! کیا آپ (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) ہمیں بھی اپنی قوم کی طرح سمجھ بیٹھے ہیں؟ اس غلط فہمی میں نہ رہیے گا، آپ (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) نے اُن لوگوں کے ساتھ جنگ کی ہے جو فنونِ حرب سے واقف ہی نہیں تھے، اس لیے اُن پر غلبہ پالیا، اگر ہمارے ساتھ جنگ کرتے تو آپ کو لگ پتا جاتا کہ جنگ کیا ہوتی ہے؟ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے جان لیا کہ یہ قوم نقضِ عہد پر آمادہ ہے۔ جبرائیل علیہ السلام کے ذریعے تائید الٰہی بھی ہوگئی اور یہ آیتِ کریمہ نازل ہوئی:

وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْۢبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَآءٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَآئِنِيْنَ ﴿۵۸﴾

(اور اگر آپ (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کو کسی جماعت کی طرف سے خیانت (عہد شکنی) کا اندیشہ ہو تو پھر
اُن کا معاہدہ اِس طرح اُن کی طرف پھینک دیں کہ معاملہ برابر ہو جائے،
بے شک اللہ خیانت کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔)[2]

چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے جنگ کی تیاری شروع کردی۔ حضرت ابولبابہ رضی اللہ عنہ کا مدینہ میں بطور عامل تقرر کیا، ایک سفید علم حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے سپرد فرمایا اور بنوقینقاع کی جانب متوجہ ہوئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اُن کا محاصرہ کرلیا۔ رئیس المنافقین عبداللہ بن اُبی بن سلول نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو روکنے کی بہت کوشش کی لیکن آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے محاصرہ جاری رکھا۔ یہودی اپنے حلیف قبیلے بنونُضیر اور اپنے ساتھی عبداللہ بن اُبی کی طرف سے کسی کمک کے منتظر تھے لیکن اُنھیں اُن کی مدد کرنے کا حوصلہ نہ ہُوا چنانچہ پندرہ دن بعد وہ اپنی محصوری سے تنگ آگئے اور یکم

---

[1] سیرۃ ابن ہشام۔ ڈاکٹر نصیر احمد ناصر، کتاب: پیغمبر اعظم وآخر صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم، ص ۴۸۸

[2] سورۃ الانفال، آیت ۵۸

ذیقعدہ ۲ ہجری بمطابق ۲۵ یا ۲۶ اپریل ۶۲۴ ء کو غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈال دیے۔ [۱]

"مدارج النبوّت" اور "المواہب اللدنیہ" میں ہے کہ اُنھوں نے یہ پیشکش کی کہ محاصرہ ختم کر دیا جائے اُن کے تمام اموال حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہوں گے مگر اُن کی عورتیں اور بچّے اُنھیں کے پاس رہیں گے۔ [۲]

حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے محاصرہ ختم کر دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُن کے قتل اور غارت گری سے درگزر فرمایا اور حکم دیا کہ وہ مدینہ سے نکل جائیں۔ چنانچہ بنوقینقاع جو تعداد میں سات سو تھے، شام کے علاقے ازرعات میں جا بسے۔ [۳] بروایتے حضرت عبادہ بن صامت کو مامور کیا گیا کہ وہ اُنھیں مدینہ کی سرحد تک چھوڑ کے آئیں۔ [۴]

اُن کا جو مال اور اسلحہ، مالِ غنیمت بنا اُس سے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اس مال میں سے پانچواں حصّہ خمس نکالو۔ "روضۃ الاحباب" میں ہے کہ یہ پہلا خمس تھا جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم سے نکالا گیا۔ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُس مال میں سے اپنے لیے تین کمانیں، تین تلواریں اور تین نیزے منتخب کیے۔ [۵]

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّاٰلِ مُحَمَّدٍ

---

[۱] ڈاکٹر نصیر احمد ناصر، کتاب: پیغمبرِ اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ص ۴۸۸

[۲] عبدالحق محدث دہلوی، مدارج النبوت۔ احمد بن محمد قسطلانی (متوفی ۹۲۳ ہجری)، المواہبُ اللدنیۃ، ج ۱ ص ۲۵۶

[۳] ڈاکٹر نصیر احمد ناصر، کتاب: پیغمبرِ اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ محمد ابن سعد (متوفی ۲۳۰ ہجری)، طبقات ابن سعد سنن ابی داؤد۔ مولانا شبلی نعمانی (متوفی ۱۹۱۴ء)، سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ ابن ہشام (متوفی ۸۳۳ء)، سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

[۴] علامہ علی نقی نقوی، تاریخ اسلام ص ۲۱۳۔ ابوجعفر محمد بن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ھ)، تاریخ طبری ج ۲ ص ۲۹۷

[۵] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت ج ۲ ص ۱۴۵۔ جمال الدین محدث، روضۃ الاحباب

سیّدۃُ نساء العالمین حضرت فاطمۃ الزہراء علیہا السلام کا نکاح
(یکم ذی الحجہ سنہ ۲ ہجری/ ۲۵ مئی ۶۲۴ء)

ایک روایت کے مطابق یکم ذی الحجہ سنہ ۲ ہجری کو، دوسری روایت کے مطابق ۶ ذی الحجہ سنہ ۲ ہجری کو اور تیسری روایت کے مطابق ۱۵ رجب سنہ ۲ ہجری کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی صاحبزادی سیّدہ فاطمۃ الزہراء علیہا السلام کا عقد جناب علی علیہ السلام سے فرمایا اور ۲۴ ذی الحجہ ۲ ہجری کو اور بروایتے ۱۹ ذی الحجہ ۲ ہجری کو آپ علیہا السلام کی رخصتی فرمائی۔ امام محمد باقر اور امام جعفر صادق علیہم السلام سے مروی ہے کہ نکاح رمضان ۲ ہجری میں اور رخصتی اُسی سال ذی الحجہ میں ہوئی۔ کتاب اقبال الاعمال میں شیخ مفید کی کتاب حدائق الریاض کے حوالے سے بیان کیا گیا ہے کہ حضرت فاطمۃ الزہراء علیہا السلام ۲۱ محرم ۳ ہجری بروز پنجشنبہ اپنے پدرِ بزرگوار کے گھر سے رخصت ہو کر حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے گھر تشریف لائیں۔[1]

روایت ہے کہ سب سے پہلے حضرت ابوبکرؓ نے پھر حضرت عمرؓ نے شادی کا پیغام بھیجا جس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُن سے اِعراض فرمایا۔[2] اُن کے بعد عبدالرحمٰن نے بھی پیغام بھیجا اور کثیر حق مہر دینے کی بات کی۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عبدالرحمٰن سے فرمایا کہ فاطمہ (علیہا السلام) کی شادی خدا کے حکم سے ہوگی اور تم نے جو مہر کی زیادتی کا حوالہ دیا ہے وہ افسوس ناک ہے اور تمھاری درخواست قبول نہیں کی جاسکتی۔[3]

"کنز العمال" میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ سے اِعراض فرمایا تو دونوں اصحاب حضرت علی علیہ السلام کے پاس گئے۔ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں، اُس وقت میں کھجوروں کو پانی دے رہا تھا۔ اُنھوں نے کہا کہ تمھارے چچا کی بیٹی کے لیے نکاح

---

[1] علامہ محمد باقر مجلسی (متوفی ۱۶۹۸ء)، بحار الانوار، ج ۳ ص ۷ ۱۳ بحوالہ اقبال الاعمال و دیگر اسناد

[2] علامہ علاء الدین علی متقی (متوفی ۹۷۵ء)، کنز العمال ج ۷ حصّہ سیز دہم ص ۳۱۲

[3] علامہ محمد باقر مجلسی (متوفی ۱۶۹۸ء)، بحار الانوار، ج ۳ ص ۱۲۶، ۱۲۷

کا پیغام دیا جارہا ہے۔ علی علیہ السلام کے الفاظ ہیں، ''اُنھوں نے گویا کہ مجھے جگا دیا اور میں اپنی چادر لیے اُٹھ کھڑا ہُوا اور (فوراً) رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں حاضر ہُوا۔'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، ''علی! کیا چاہتے ہو؟'' میں نے عرض کیا، ''آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) فاطمہ (علیہا السلام) سے میری شادی کرادیں۔'' فرمایا، ''تمھارے پاس (حق مہر کے لیے) کوئی چیز ہے؟'' میں نے کہا، ''میرے پاس گھوڑا اور میری زِرّہ ہے۔'' آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا، ''گھوڑا تو (تمھارے لیے) ضروری ہے ہاں البتہ زِرّہ بیچ دو۔'' پس میں نے ۴۸۰ درہم میں زِرّہ بیچ دی اور رقم لے کر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں دوبارہ حاضر ہُوا۔ (وہ رقم جناب سیّدہ علیہا السلام کا مہر قرار پائی) آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ایک چارپائی اور ایک تکیہ جو چھال سے بھرا ہُوا تھا جہیز میں دیا اور فرمایا کہ (رخصتی کے بعد) جب فاطمہ (علیہا السلام) تمھارے گھر پہنچ جائیں تو میرا انتظار کرنا۔[1] روایت ہے کہ حضرت علی علیہ السلام نے اپنی زِرّہ ۵۰۰ درہم میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ہاتھ فروخت کی اور اُس رقم سے مہر ادا کیا۔[2]

بروایتے، حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حضرت علی علیہ السلام نے شادی کی درخواست پیش کی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت سیّدہ فاطمہ علیہا السلام سے اُن کی مرضی دریافت فرمائی۔ سیّدۃُ نساء العالمین علیہا السلام چُپ ہو رہیں۔ یہ ایک طرح کا اظہارِ رضامندی تھا۔[3] بعض علما نے لکھا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام سے خود فرمایا تھا کہ اے علی! مجھے خدا نے کہہ دیا ہے کہ فاطمہ (علیہا السلام) کی شادی تمھارے ساتھ کردوں، کیا تمھیں منظور ہے؟ حضرت علی علیہ السلام نے عرض کیا، ''بیشک۔''[4] یہی روایت صحاح میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ اور

---

[1] علامہ علاء الدین علی متقی بن حسام الدین، کنز العمال ج ۷ حصّہ سیزدہم ص ۳۱۲

[2] مناقب ابن شہر آشوب ج ۴ ص ۱۴۔ علامہ نجم الحسن کراروی (متوفی ۱۹۸۲ء)، چودہ ستارے، ص ۹۵

[3] علامہ نجم الحسن کراروی (متوفی ۱۹۸۲ء)، چودہ ستارے ص ۹۵ بحوالہ سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ج ۱ ص ۲۶۱

[4] محب الدین طبری، ریاض النضرہ، ج ۲ ص ۱۸۴ طبع مصر

اُمّ المومنین حضرت اُمّ سلمہؓ نے کی ہے۔ ایک روایت میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا، ''اللہ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں فاطمہ (علیہا السلام) کا نکاح علی (علیہ السلام) سے کردوں۔''[1] علامہ مجلسی لکھتے ہیں کہ شادی کا پیغام محمود نامی ایک فرشتہ لے کر آیا تھا۔[2] کچھ علما نے جبرائیل علیہ السلام کا حوالہ دیا ہے کہ وہ پیغام لے کر آئے تھے۔[3]

''مدارج النبوّت'' میں ہے کہ جناب سیّدہ فاطمہ زہراء علیہا السلام اور حضرت علی علیہ السلام کا عقد ۲ ہجری ماہِ رمضان میں ہُوا جب کہ اس کی بنا ماہِ ذوالحجہ میں ہے۔ ماہِ صفر میں اور غزوۂ اُحد کے بعد کی روایات بھی ملتی ہیں۔ نکاح کے وقت سیّدہ فاطمہ علیہا السلام کی عمر سولہ سال اور بعض کے نزدیک اٹھارہ سال تھی اور حضرت علی المرتضیٰ علیہ السلام کی عمر مبارک اُس وقت اکیس سال پانچ ماہ تھی۔[4]

''روضۃ الاحباب'' کے مطابق صحابہؓ نے حضرت علی علیہ السلام سے کہا کہ آپ رسول اللہ ﷺ کے اہل و خواص میں سے ہیں اس لیے حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر جناب سیّدہ علیہا السلام کے لیے خواستگاری کریں۔ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا کہ میں اس میں شرم محسوس کرتا ہوں۔ صحابہؓ نے کہا کہ آپ حضور ﷺ کی بارگاہ میں بہت زیادہ مقرب ہیں اور آنحضرت ﷺ کے پیارے چچا حضرت ابوطالبؑ کے فرزند بھی ہیں اس لیے جائیں اور شرم محسوس نہ کریں۔ چنانچہ حضرت علی مرتضیٰ علیہ السلام، رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سلام عرض کیا۔ حضور ﷺ نے سلام کا جواب دیتے ہوئے فرمایا کہ اے ابنِ ابی طالب کیا بات ہے؟ کیسے آنا ہُوا؟ عرض کیا کہ میں فاطمہ (علیہا السلام) کی خواستگاری کے لیے حاضر ہُوا ہوں۔ رسول اللہ ﷺ نے

---

[1] حافظ ابی القاسم سلیمان بن احمد الطبرانی (متوفی ۳۶۰ ہجری)، المعجم الکبیر، ۱۵۶:۱۰
ابن جوزی، تذکرۃ الخواص

[2] علامہ محمد باقر مجلسی (متوفی ۱۶۹۸ء)، بحار الانوار ج ۳ ص ۱۳۴

[3] مناقب ابن شہر آشوب ج ۴ ص ۱۴۔ علامہ نجم الحسن کراروی (متوفی ۱۹۸۲ء)، چودہ ستارے، ص ۹۵

[4] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۱۰۹

فرمایا، ''مَرْحَبًا وَ اَھْلاً'' (خوش آمدید)۔

حضرت انسؓ روایت کرتے ہیں کہ اُس وقت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس موجود تھا، آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر وہ کیفیت طاری ہوگئی جو نزولِ وحی کے وقت ہوتی ہے اور جب وہ کیفیت ختم ہوئی تو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا، ''اے انس! ربُ العرش کی طرف سے جبرائیل (علیہ السلام) میرے پاس آئے اور کہا کہ حق تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے کہ فاطمہ (علیہا السلام) کا نکاح علی مرتضیٰ (علیہ السلام) کے ساتھ کردو۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بلوایا اور جب سب حاضر ہو گئے تو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے بلیغ خطبہ پڑھا اور اللہ ربُ العزت کی حمد وثنا کے بعد حضرت فاطمہ علیہا السلام کا نکاح جناب علی علیہ السلام کے ساتھ بحق مہر چار سو مثقال چاندی کیا اور فرمایا، ''اے علی! تم قبول کرتے ہو اور راضی ہو؟'' حضرت علی (علیہ السلام) نے عرض کیا کہ میں نے قبول کیا اور راضی ہُوا۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک طباق کھجور کا لیا اور صحابہؓ میں تقسیم کیا۔[1] اسی بنا پر فقہا کی ایک جماعت کہتی ہے نکاح کے وقت کھجور وغیرہ کی ضیافت مستحب ہے۔ پس جناب علی علیہ السلام اور سیّدہ فاطمہ علیہا السلام کے نکاح پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دستِ مبارک سے کھجور کی تقسیم کی سُنت پر مومنین آج تک عمل پیرا ہیں اور شاید ہی کوئی نکاح ایسا ہو جس میں اس سُنت پر عمل نہ کیا جاتا ہو۔ ''المواھبُ اللدنیة'' میں خطبہ نکاح کو یوں نقل کیا گیا ہے:

''اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الْمَحْمُوْدُ بِنِعْمَتِہٖ الْمَعْبُوْدُ بِقُدْرَتِہِ الْمُطَاعُ بِسُلْطَانِہٖ الْمَرْھُوْبُ مِنْ عَذَابِہٖ وَسَطْوَتِہٖ النَّافِذُ اَمْرُہٗ فِیْ سَمَاءِ ہٖ وَاَرْضِہِ الَّذِیْ خَلَقَ الْخَلْقَ بِقُدْرَتِہٖ وَ مَیَّزَھُمْ بِاَحْکَامِہٖ وَ اَعَزَّ ھُمْ بِدِیْنِہٖ وَ اَکْرَمَھُمْ بِنَبِیِّہٖ مُحَمَّدٌ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِنَّ اللّٰہَ تَبَارَکَ اسْمُہٗ وَ تَعَالٰی عَظْمَتٌ جَعَلَ الْمُصَاھَرَۃَ سَبَبًا لَّاحِقًا وَ اَمْرًا مُّفْتَرَضًا وَ شَبَّحَ بِہٖ الْاَرْحَامَ وَ اَکْرَمَ الْاَنَامَ فَقَالَ عَزَّ مَنْ قَالَ وَ ھُوَ الَّذِیْ خَلَقَ مِنَ الْمَاءِ بَشَرًا

---

[1] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۱۰۹۔ جمال الدین محدث، روضۃ الاحباب

فَجَعَلَهٗ نَسَبًا وَّ صِهْرًا وَّ كَانَ رَبُّكَ قَدِيْرًا فَاَمْرُ اللهِ تَعَالٰى يَجْرِىْ اِلٰى قَضَائِهٖ وَقَضَاءٌ يَّجْرِىْ اِلٰى قُدْرَةٍ وَلِكُلِّ قَضَاءٍ قَدْرٌ وَّلِكُلِّ قَدْرٍ اَجَلٌ وَلِكُلِّ اَجَلٍ كِتَابٌ يَّمْحُوا اللهُ مَا يَشَآءُ وَ يُثْبِتُ عِنْدَهٗ اُمُّ الْكِتَابِ ثُمَّ اِنَّ اللهَ اَمَرَنِىْ اَنْ اُزَوِّجَ فَاطِمَةَ مِنْ عَلِيِّ بْنِ اَبِىْ طَالِبٍ.......الخ''[1]

خطیب بغدادی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نکاح کے وقت سیّدہ فاطمہ علیہا السلام سے فرمایا کہ حق تعالیٰ نے زمین پر دو اشخاص کو برگزیدہ فرمایا ہے جن میں سے ایک تمھارے والد ہیں اور دوسرے تمھارے شوہر۔[2]

حضرت علی علیہ السلام کی زبانی شادی کی روایت

شیخ صدوق فرماتے ہیں کہ ابوالحسن محمد بن علی بن شاہ نے ہمیں یہ حدیث سنائی، اُنھوں نے ابوالعباس احمد بن مظفر بن حسین سے سُنی، اُنھوں نے ابوعبداللہ محمد بن زکریا بصری سے سُنی، اُنھوں نے محمد بن سابق سے، اُنھوں نے امام علی رضا علیہ السلام سے، اُنھوں نے اپنے والد امام جعفر صادق علیہ السلام سے، اُنھوں نے اپنے والد امام محمد باقر علیہ السلام سے، اُنھوں نے امام زین العابدین علیہ السلام سے اور اُنھوں نے امام حسین علیہ السلام سے روایت کی۔ اُنھوں نے فرمایا کہ میرے والد علی ابن ابی طالب علیہ السلام نے فرمایا، ''میں نے فاطمہ زہراء (علیہا السلام) سے شادی کا ارادہ کر لیا مگر مجھے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے سوال کرنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ ایک دن آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہُوا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، ''یا علی!'' میں نے عرض کیا، ''لبیک یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم!'' آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پوچھا، ''کیا تم شادی کرنے کی خواہش رکھتے ہو؟'' میرے ذہن میں خیال آیا کہ کہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قریش کی کسی اور عورت سے میرا نکاح نہ کر دیں اور اگر ایسا ہُوا تو میں فاطمہ (علیہا السلام) سے محروم ہو جاؤں گا چنانچہ میں نے عرض کیا،

---

[1] احمد بن محمد قسطلانی (متوفی ۹۲۳ ہجری)، المواہب اللدنیۃ

[2] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۱۰۹۔ جمال الدین محدث، روضۃ الاحباب

''اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم زیادہ بہتر جانتے ہیں۔'' پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے حضرت اُمّ سلمہؓ کے گھر بلایا۔ میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہُوا تو مجھے دیکھتے ہی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا چہرۂ مبارک کھل اُٹھا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسکرائے یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دندانِ مبارک کی چمک مجھے نظر آئی پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا،''علی! تمھیں مبارک ہو کہ تمھاری شادی کے لیے اللہ نے میری کفالت فرمائی۔'' میں نے عرض کیا،''یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! وہ کیسے؟'' فرمایا،''میرے پاس جبرائیل (علیہ السلام) جنّت کا ایک خوشہ اور لونگ لے کر آئے ۔ میں نے اُنھیں سونگھا اور پوچھا،''جبرائیل! یہ خوشہ اور لونگ کیسا ہے؟'' اُنھوں نے کہا،''اللہ تعالیٰ نے بہشت کے ملائکہ اور وہاں رہنے والوں کو حکم دیا ہے کہ وہ جنّت کی نہروں، پھلوں، اشجار اور محلات کو مزّین کریں اور ہوا کو حکم دیا کہ عطر و خوشبو کے جھونکے نثار کرے اور حورالعین کو حکم دیا کہ سورۃ طٰہٰ، طس (سورۃ نمل) اور حمعسق (سورۃ شوریٰ) کی تلاوت کریں۔'' پھر اللہ تعالیٰ نے ایک منادی کو حکم دیا جس نے اذنِ خدا سے یہ منادی کی،''اے میرے ملائکہ اور میری جنّت میں رہائش پذیر مخلوق! گواہ رہو کہ میں نے فاطمہ (علیہا السلام) بنت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تزویج علی ابن ابی طالب (علیہ السلام) سے کر دی اور یہ تزویج اُن دونوں کی اور میری رضامندی سے ہوئی ہے۔'' تب اللہ تعالیٰ نے جنّت کے ایک فرشتے کو جس کا نام''راحیل'' ہے اور جو تمام ملائکہ میں سب سے زیادہ فصیح و بلیغ ہے، خطبۂ نکاح پڑھنے کا حکم صادر فرمایا۔ اُس نے حکمِ الٰہی سے ایسا فصیح و بلیغ خطبہ پڑھا جیسا آج تک زمین و آسمان میں نہیں پڑھا گیا۔ اس کے بعد منادی نے حق کی طرف سے ندا دی،''میرے ملائکہ اور میری جنّت کے باسیو! تم علی بن ابی طالب (علیہ السلام) اور میرے حبیب محمد مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور فاطمہ بنت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم (علیہا السلام) پر برکت بھیجو، اور میں بھی اُن پر برکت بھیجتا ہوں۔'' راحیل فرشتے نے عرض کی،''پروردگار! ہم نے علی (علیہ السلام) اور فاطمہ (علیہا السلام) کے لیے تیری جنّت اور تیری دارِ کرامت میں بھی برکت دیکھی ہے، دُنیا میں اُن پر تُو کیسی برکت نازل کرے گا؟'' خداوندِ عالم نے فرمایا،''راحیل! اُن دونوں پر میری برکت یہ ہے کہ میں اُن کو اپنی محبت پر جمع کروں گا اور

اُنھیں اپنی مخلوق پر حُجّت بناؤں گا اور اُن سے اُن کی ذرّیت جاری کروں گا، اُنھیں اپنی زمین میں اپنا خازِن بناؤں گا اور اُنھیں اپنی حکمت کا معدِن بناؤں گا اور انبیا و مرسلین (علیہم السلام) کے بعد اُن ہی کے ذریعے اپنی مخلوق پر حُجّت قائم کروں گا۔" لٰہذا اے علی (علیہ السلام)! تمھیں مبارک اور خوشخبری ہو کہ میں نے تمھارا نکاح اُسی مہر پر اپنی بیٹی فاطمہ (علیہا السلام) سے کیا ہے جو اللہ نے اُس کے لیے مقرر کیا ہے اور جس مہر پر اللہ راضی ہے میں بھی اُسی پر راضی ہوں۔ تم اپنی زوجہ کو لے جا سکتے ہو، کیونکہ اب مجھ سے زیادہ تم اس کے حقدار ہو، مجھے جبرائیل امین (علیہ السلام) نے خبر دی ہے کہ جنّت اور اہلِ جنّت تم دونوں کے مشتاق ہیں اور اگر اللہ نے تم دونوں سے اپنی حجتوں کا ظہور نہ کرانا ہوتا تو جنّت اور اہلِ جنّت کی خواہش کے تحت تم دونوں کو فوراً وہاں بھیج دیتا۔ تم میرے بہترین بھائی، بہترین داماد اور بہترین ساتھی ہو اور رضائے الٰہی تمھاری رضامندی کے لیے کافی ہے۔ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ میں نے کہا، "پروردگار! مجھے توفیق دے کہ میں تیری اس نعمت کا شکر ادا کروں جو تُو نے مجھے عطا کی ہے۔" رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، "آمین۔"[1]

یہی حدیث علی بن احمد بن محمد بن عمران نے بھی بیان کی ہے، اُنھوں نے یہ حدیث احمد بن یحییٰ بن زکریا قطان سے، اُنھوں نے ابو محمد بکر بن عبداللہ بن جندب (حبیب) سے، اُنھوں نے احمد بن حرث (حارث) سے، اُنھوں نے امام حسین علیہ السلام سے اور اُنھوں نے حضرت علی علیہ السلام سے روایت کی ہے۔ علاوہ ازیں یہ حدیث اور بھی کئی طریقوں سے مروی ہے جن کا تذکرہ جناب شیخ الصدوق نے اپنی کتاب مدینۃُ العلم میں کیا ہے۔

(بحذفِ اسناد) حسین بن خالد بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت امام علی رضا علیہ السلام سے اُن کے آبائے طاہرین علیہم السلام کی سند سے سُنا کہ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھ سے فرمایا، "یا علی (علیہ السلام)! قریش کے کئی افراد فاطمہ (علیہا السلام) کے معاملے کی وجہ سے مجھ سے ناراض ہوئے اور کہا کہ ہم نے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی صاحبزادی کا

[1] شیخ ابی جعفر الصدوق (متوفی ۳۸۱ ہجری)، عیون اخبار الرضا علیہ السلام، ج ا ص ۳۹۲

رشتہ طلب کیا تھا لیکن آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے ہمیں رشتہ دینا گوارہ نہ کیا اور علی (علیہ السلام) سے اُن کا نکاح کر دیا۔ میں نے اُنھیں کہا کہ خدا کی قسم تمھیں میں نے اِس رشتہ سے محروم نہیں کیا اور میں نے اپنی مرضی سے علی (علیہ السلام) کو رشتہ نہیں دیا بلکہ تمھیں اللہ نے محروم رکھا اور اللہ ہی نے علی (علیہ السلام) کا نکاح کیا۔ مجھ پر جبرائیل (علیہ السلام) نازل ہوئے اور کہا کہ یا محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اگر میں علی (علیہ السلام) کو پیدا نہ کرتا تو رُوئے زمین پر فاطمہ (علیہا السلام) کا کوئی ہمسر نہ ہوتا..... الخ۔''[1]

خاتونِ جنّت علیہا السلام کا حق مہر

جناب سیّدہ فاطمۃ الزہراء علیہا السلام کے حق مہر سے متعلق مختلف روایات ہیں۔ ''مدارج النبوّت'' میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جناب فاطمہ علیہا السلام کا نکاح حضرت علی علیہ السلام کے ساتھ بحق مہر چار سو مثقال چاندی باندھا۔[2] ''عیون اخبار الرضا'' میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام سے فرمایا کہ میں نے تمھارا نکاح اُسی مہر پر اپنی بیٹی فاطمہ (علیہا السلام) سے کیا ہے جو اللہ نے اُس کے لیے مقرر کیا ہے اور جس مہر پر اللہ راضی ہے میں بھی اُسی پر راضی ہوں۔[3]

''مدارجُ النبوت'' کی روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ روایت اُس حق مہر سے متعلق ہیں جو ''زمین'' پر مقرر ہُوا جب کہ ''عیون اخبار الرضا'' کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب سیّدہ علیہا السلام کا ایک حق مہر اللہ تعالیٰ نے بھی مقرر فرمایا تھا۔ اس کی تائید حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کی روایت سے بھی ہوتی ہے، وہ کہتے ہیں کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ فرشتوں نے خداوند تعالیٰ سے درخواست کرتے ہوئے کہا کہ اے خدا اور ہمارے مالک! ہمیں آگاہ فرما کہ حضرت فاطمہ علیہا السلام کا حق مہر کتنا تھا تاکہ ہم جان سکیں اور ہم پر واضح ہو جائے کہ وہ تمھارے نزدیک

---

[1] شیخ ابی جعفر الصدوق رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۳۸۱ ہجری)، عیون اخبار الرضا علیہ السلام، ج ا ص ۳۹۵

[2] شیخ عبد الحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۱۰۹

[3] شیخ ابی جعفر الصدوق رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۳۸۱ ہجری)، عیون اخبار الرضا علیہ السلام، ج ا ص ۳۹۴

بہترین مخلوق ہیں۔ خداوند تعالیٰ نے فرمایا، ''اے میرے فرشتو اور میرے آسمان پر رہنے والو! میں تمھیں گواہ بناتا ہوں کہ فاطمہ (علیہا السلام) دخترِ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا حق مہر آدھی دُنیا ہے۔''[1]

سیّدہ کونین علیہا السلام کی رُخصتی

مروی ہے کہ حضرت فاطمۃ الزہراء علیہا السلام کی بارات طعام کے بعد جناب امیر المومنین علی علیہ السلام کے گھر روانہ ہوئی تو سیّدۂ نساء العالمین علیہا السلام اشہب نامی ناقے پر سوار تھیں، حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ ساربان تھے، ازواجِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ناقے کے آگے تھیں اور بنی ہاشم ننگی تلواریں لیے بارات کے جلوس کے ساتھ ساتھ تھے۔ سب سے پہلے بارات کو مسجد کا طواف کرایا گیا اور پھر جناب سیّدہ علیہا السلام کو حضرت علی علیہ السلام کے گھر اُتارا گیا۔

ایک روایت کے مطابق آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنا خچر منگوایا جس کا نام شہبا تھا، اُس پر چادر ڈالی اور حضرت فاطمہ زہراء علیہا السلام سے فرمایا کہ بیٹی اس پر سوار ہو جاؤ۔ پھر حضرت سلمان رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ خچر کی لگام تھام کر چلو۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود خچر کے پیچھے پیچھے تھے اور ابھی راستے ہی میں تھے کہ جبرائیل علیہ السلام اور میکائیل علیہ السلام ستر ہزار فرشتوں کے ہمراہ پہنچے اور کہا کہ ہم فاطمہ زہراء علیہا السلام کی رخصتی میں شرکت کے لیے آئیں ہیں اور اُنھیں علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے گھر تک پہنچائیں گے۔ پھر ایک طرف جبرائیل علیہ السلام نے تکبیر کہی اور دوسری طرف میکائیل علیہ السلام نے اور اُن کے ساتھ ملائکہ نے بھی نعرۂ تکبیر بلند کیا اور پھر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی ''اللہ اکبر'' کہا۔

یہ بھی منقول ہے کہ جناب سیّدہ علیہا السلام کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دُل دُل نامی خچر پر بٹھایا گیا اور رخصتی کے وقت جبرائیل علیہ السلام، میکائیل علیہ السلام اور اسرافیل علیہ السلام ستر ہزار فرشتوں کے ساتھ نازل ہوئے۔ جبرائیل علیہ السلام نے دُل دُل کی لگام پکڑی، اسرافیل علیہ السلام نے رکاب تھامی

---

[1] دلائل الامۃ ص ۹۱۔ ابو جعفر محمد بن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ھ)، نوادر المعجزات ص ۹۰

آیت اللہ سید احمد مستنبط، مناقبِ اہل بیت، ترجمہ: اَلقطرۃُ من بِحارِ مَناقبِ النبّی وَالعترۃِ، حصّہ چہارم ص ۱۳

اور میکائیل علیہ السلام پیچھے پیچھے ہو لیے۔ پھر تمام ملائکہ نے تکبیر کہی۔ [1]

روایت ہے کہ سیّدۃُ نساء العالمین علیہا السلام کی رخصتی کے وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے خواتین سے فرمایا کہ رَجز پڑھو، اللہ کی حمد و تکبیر کہو اور کوئی ایسی بات منہ سے نہ نکالو جس سے اللہ ناراض ہوتا ہو۔ چنانچہ حضرت سیّدۃُ نساء العالمین علیہا السلام کی رخصتی کے جلوس کے آگے آگے ازواجِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے رَجز پڑھے۔ حضرت اُمّ سلمہؓ، حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ نے مندرجہ ذیل رَجز پڑھے: [2]

اُمّ المومنین حضرت اُمّ سلمہؓ کا رَجز:

''اے پڑوسنو! چلو اللہ کی مدد تمھارے ساتھ ہے اور ہر حال میں اُس کا شکر ادا کرو۔ پریشانیوں اور مصیبتوں کو دُور کرکے اللہ نے احسان فرمایا ہے، پس اُسے یاد کرو۔ آسمانوں کے پروردگار نے ہمیں کفر کی تاریکیوں سے نکالا اور ہر طرح کا عیش و آرام دیا۔ اے پڑوسنو! چلو سیّدۂ زنانِ عالم (علیہا السلام) کے ساتھ جن پر اُن کی پھوپھیاں اور خالائیں نثار ہوں۔ اے عالی مرتبت پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کی بیٹی! جسے اللہ نے وحی اور رسالت کے ذریعے تمام لوگوں پر فضیلت دی، (سلام ہو آپ پر)۔''

اُمّ المومنین حضرت عائشہؓ کا رَجز:

''اے عورتو! چادر اوڑھ لو اور یاد رکھو کہ یہ چیز ہجوم میں اچھی سمجھی جاتی ہے۔ یاد رکھو اُس پروردگار کو جس نے اپنے دوسرے شکر گذار بندوں کے ساتھ ہمیں بھی اپنے دینِ حق کے لیے مخصوص فرمایا۔ اللہ کی حمد اُس کے فضل و کرم پر اور شُکر ہے اُس کا جو عزت و قدرت والا ہے۔ فاطمۃ الزہراء (علیہا السلام) کو ساتھ لے کر چلو کہ اللہ نے اِن کے ذِکر کو بلند کیا ہے اور اِن کے لیے ایک ایسے پاک و پاکیزہ مرد (حضرت علی علیہ السلام) کو مخصوص کیا ہے جو اِن ہی کے خاندان سے ہے۔''

---

[1] علامہ محمد باقر مجلسی (متوفی ۱۶۹۸ء)، بحار الانوار، ج ۴۳ ص ۱۴۰

[2] سلطان مرزا دہلوی، سیرت فاطمۃ الزہراء علیہا السلام۔ علامہ محمد باقر مجلسی (متوفی ۱۶۹۸ء)، بحار الانوار، ج ۴۳ ص ۱۴۳
سید محسن امین عاملی (متوفی ۱۹۵۳ء)، اعیان الشیعہ، جز الثانی

اُمّ المومنین حضرت حفصہؓ کا رَجز:

''اے فاطمہ (علیہا السلام)! آپ (علیہا السلام) عالم انسانیت کی تمام عورتوں سے بہتر ہیں۔ آپ (علیہا السلام) کا چہرہ چاند کی مثل ہے۔ آپ (علیہا السلام) کو اللہ نے تمام دُنیا پر فضیلت دی ہے اُس شخص کی فضیلت کے ساتھ جس کا فضل و شرف سورۃ زمر کی آیات میں مذکور ہے۔ اللہ نے آپ (علیہا السلام) کی تزویج ایک صاحبِ فضائل و مناقب نوجوان سے کی ہے یعنی علی (علیہ السلام) سے جو تمام لوگوں سے بہتر ہے۔ اے پڑوسنو! فاطمہ (علیہا السلام) کو لے کر چلو کیونکہ یہ بڑی شان والے باپ کی عزت مآب دختر ہیں۔''

جب بارات علی علیہ السلام کے گھر پہنچی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت فاطمہ علیہا السلام سے پانی منگوایا اور اُس پر دَم کر کے سیّدہ علیہا السلام اور علی علیہ السلام کے سر، سینے اور بازو پر چھڑکا اور بارگاہِ احدیت میں عرض کی کہ بارِالٰہا! میں انھیں اور اِن کی اولاد کو تیری پناہ میں دیتا ہوں شیطان رجیم (کے شر) سے۔[۱] پھر فاطمہ علیہا السلام سے فرمایا کہ علی (علیہ السلام) سے بے جا سوال نہ کرنا، یہ دولت مند نہیں لیکن دُنیا میں سب سے اعلیٰ اور افضل ہیں۔ اس کے بعد علی علیہ السلام سے فرمایا کہ یہ میرے جگر کا ٹکڑا ہے، کوئی ایسی بات نہ کرنا کہ اِسے ملال ہو۔[۲]

امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں، ''حضرت فاطمہ علیہا السلام اُم ایمنؓ کے ہمراہ میرے گھر تشریف لائیں اور ایک طرف بیٹھ گئیں جب کہ میں دوسری طرف بیٹھا ہُوا تھا پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی تشریف لائے اور آتے ہی فرمایا، ''علی میرا بھائی ہے۔'' اُمّ ایمنؓ نے کہا، ''وہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا بھائی ہے جب کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنی بیٹی کی اُس سے شادی کرائی ہے۔'' فرمایا، ''ہاں۔'' پھر آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اندر تشریف لائے اور فاطمہ (علیہا السلام) سے فرمایا، ''پانی لائیں۔'' فاطمہ (علیہا السلام) ایک پیالے میں پانی لے کر آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس آئیں تو آپ

---

[۱] ابن حجر مکی (متوفی ۹۷۴ھ)، الصواعق المحرقۃ، ص ۸۴

[۲] علامہ نجم الحسن کراروی (متوفی ۱۹۸۲ء)، چودہ ستارے، ص ۹۶

(صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے پانی میں کُلی کی اور فاطمہ (علیہا السلام) سے فرمایا، ''کھڑی ہوجائیں۔'' جب وہ کھڑی ہوگئیں تو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے وہ پانی اُن کے جسمِ اطہر پر بہایا اور فرمایا، ''یا اللہ میں اِسے اور اِسکی اولاد کو تیری پناہ میں دیتا ہوں شیطان مردُود (کے شر) سے۔'' پھر آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے مجھے بھی پانی لانے کو کہا۔ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں، ''میں آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ارادے کو جانتا تھا، اس لیے اُٹھا اور پانی سے بھرا پیالہ لے آیا۔'' آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے پانی میں کُلی کی اور اُسے میرے سینے اور سر پر بہا دیا اور فرمایا، ''یا اللہ میں اِسے اور اِسکی اولاد کو تیری پناہ میں دیتا ہوں شیطان مردُود (کے شر) سے۔'' پھر فرمایا پیٹھ پھیرو۔ میں نے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی طرف پیٹھ پھیر دی۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے میرے کاندھے پر پانی بہایا اور فرمایا، ''یا اللہ میں اِسے اور اِسکی اولاد کو تیری پناہ میں دیتا ہوں شیطان مردُود (کے شر) سے۔'' پھر فرمایا، ''اللہ تعالیٰ کے نام اور اُس کی برکت کے ساتھ اپنے اہلِ خانہ کے ہمراہ گھر میں (حجرہ میں) داخل ہوجاؤ۔[1]

یہ روایت جزری نے ''حصن حصین'' میں ابن حبان سے اپنی صحیح میں یوں بیان کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، حضرت علی علیہ السلام اور سیّدہ فاطمہ علیہا السلام کا نکاح کرنے کے بعد اپنے کاشانۂ اقدس میں تشریف لے گئے اور سیّدہ فاطمہ علیہا السلام سے فرمایا کہ تھوڑا سا پانی لائیں۔ جناب سیّدہ علیہا السلام لکڑی کے پیالے میں پانی لائیں تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُس میں اپنا مبارک لعابِ دہن ملایا اور وہ پانی سیّدہ فاطمہ علیہا السلام کے بدنِ اطہر پر چھڑکا اور فرمایا، ''اَللّٰھُمَّ اِنِّیٓ اُعِیْذُبِکَ وَ ذُرِّیَّتَہٗ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ'' اے اللہ! میں اِس کو اور اِس کی اولاد کو تیری پناہ میں دیتا ہوں شیطان رجیم سے۔ پھر فرمایا کہ اور پانی لائیں۔ حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ میں سمجھ گیا تھا کہ اب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیا کریں گے چنانچہ میں پانی لے آیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُس میں اپنا لعابِ دہن مبارک ملایا اور مجھ سے فرمایا کہ میرے سامنے آؤ۔ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے کھڑا ہوگیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے میرے سر اور چہرے پر پانی چھڑکا اور فرمایا، ''اَللّٰھُمَّ اِنِّیٓ اُعِیْذُبِکَ وَ ذُرِّیَّتَہٗ

---

[1] علامہ علاء الدین علی متقی بن حسام الدین، کنز العمال ج ۷ حصّہ سیزدھم ص ۳۱۲

مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ''اے اللہ! میں اِس کو اور اِس کی اولاد کو تیری پناہ میں دیتا ہوں شیطان رجیم سے۔ پھر مجھ سے فرمایا، ''بِسْمِ اللّٰہِ وَالْبَرَکَتَۃ'' کہہ کر اپنی زوجہ کے پاس جاؤ۔ (۱)

بعض روایتوں میں آیا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم، سیّدہ فاطمہ علیہا السلام کو نمازِ عشاء کے بعد حضرت علی علیہ السلام کے گھر لائے۔ پھر پانی کا پیالہ لے کر اُس میں اپنا لعابِ دہن ملایا، معوذتین اور دُعا پڑھی اور حضرت علی علیہ السلام اور سیّدہ فاطمہ علیہا السلام سے فرمایا کہ اس پانی کو پی جاؤ اور فرمایا، ''یا خدا! یہ دونوں جانیں مجھ سے ہیں اور میں اِن سے ہوں۔ اے رب! جس طرح تُو نے مجھ سے ناپاکی کو دُور رکھا اور پاک بنایا ہے اسی طرح ان دونوں کو پاکیزہ رکھ۔'' اس کے بعد دونوں سے فرمایا کہ جاؤ اور دُعا کی، ''اے خدا! اِن کے درمیان محبت واُلفت شامل فرما اور اِن میں اور اِن کی اولاد میں برکت دے اور اِن سے ہر پریشانی کو دُور فرما۔ اِن کے نصیب کو نیک گردان، اِن پر برکت نازل فرما اور اِن سے بکثرت اولاد پیدا فرما۔'' (۲)

روایت ہے کہ جس وقت علی علیہ السلام کی شادی ہوئی اُن کے گھر میں ایک چمڑا تھا جسے رات کو بچھاتے تھے اور دن میں اُس پر اُونٹ کو چارہ کھلاتے تھے۔ (۳)

بروایتے جناب سیّدہ علیہا السلام کی رخصتی شوال ۲ ہجری/ اپریل ۶۲۴ ء میں ہوئی۔ (۴)

ملکہ کونین سیّدہ فاطمۃ الزہراء علیہا السلام کا جہیز

سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم دو جہاں کے تاجدار ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اپنی اکلوتی اور پیاری صاحبزادی کی شادی بڑے تُزک واحتشام سے کر سکتے تھے اور شاہانہ طرز کا جہیز بھی دے سکتے تھے مگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اُن کی شادی بالکل سادگی کے ساتھ کی اور جہیز میں ضروریاتِ زندگی کی چند

(۱) محمد بن محمد جزری شافعی (متوفی ۱۴۲۹ء) حصن حصین، ص ۱۵۷

(۲) شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۱۱۰

(۳) علامہ نجم الحسن کراروی (متوفی ۱۹۸۲ء)، چودہ ستارے، ص ۹۶ بحوالہ سبط ابن جوزی، تذکرۃ الخواص

(۴) ڈاکٹر نصیر احمد ناصر، کتاب: پیغمبر اعظم وآخر صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم، ص ۴۸۲

معمولی اشیا دیں۔ حضرت سیّدۂ نساء العالمین علیہا السلام کی رُخصتی کا یہ انداز اُن لوگوں کو دعوتِ فکر دیتا ہے جو شادی کو نمود و نمائش کا ایک قیمتی موقع یا بیوپار کا ایک ذریعہ سمجھتے ہیں۔ آج کل شادیوں پر ایک طرف تو بے پناہ خرچ کیا جاتا ہے جن میں انواع و اقسام کے کھانے، ریشمی ملبوسات، قیمتی زیورات اور بے شمار جہیز کا اہتمام ہوتا ہے تو دوسری طرف لاکھوں نادار بچیاں محض جہیز نہ ہونے کے سبب ماں باپ کی چوکھٹ پر بیٹھی جوانی کی دہلیز پار کر جاتی ہیں اور ہمیشہ غیر شادی شدہ رہتی ہیں۔ اس طرح نہ صرف وہ اپنے بنیادی حقوق سے محروم رہتی ہیں بلکہ کئی طرح کے معاشرتی مسائل سے بھی دوچار ہو جاتی ہیں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ کچھ لڑکیوں کی شادی تو کسی نہ کسی طرح ہو جاتی ہے لیکن قیمتی جہیز نہ لے جانے کے سبب وہ اپنے سسرال کی نگاہوں میں کھٹکنے لگتی ہیں اور آئے دن طعنوں کا سامنے کرتے کرتے ایک روز زندہ جلادی جاتی ہیں۔ اگر ہم اس معاملے میں بھی سنتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیروی کریں تو معاشرے میں کئی خرابیاں خود بخود دُور ہو سکتی ہیں۔ بے شک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہستی میں ہمارے لیے بہترین نمونہ ہے۔

منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جناب سیّدۂ نساء العالمین علیہا السلام کو جہیز میں ایک بان کی چارپائی، ایک چمڑے کا گدّا، ایک مَشک، دو چکیاں اور مٹی کے دو گھڑے دے کر رخصت فرمایا۔ ایک روایت کے مطابق جہیز میں سات درہم مالیت کی ایک قمیض، ایک سفید چادر، چمڑے کا فرش، دو موٹے ٹاٹ، کھجور کے پتوں سے بنا ہُوا ایک بستر، چمڑے کے چار تکیے، ایک سیاہ کمبل، آٹا پیسنے کی چکی، کپڑے دھونے کا ٹب، ایک مَشک، ایک لوٹا، کھجور کے پتوں سے بنا ہُوا ایک برتن، مٹی کی ایک صراحی، ایک پیالہ لکڑی کا اور دو پیالے مٹی کے تھے۔ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جناب فاطمہ علیہا السلام کو قیمتی جہیز دے سکتے تھے مگر سادگی اور قناعت کے پیشِ نظر اِسی پر اکتفا فرمایا۔[1]

مروی ہے کہ حضرت علی المرتضیٰ علیہ السلام نے اپنی زِرّہ فروخت کر کے جو رقم حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں بطور حق مہر پیش کی تھی اُس میں سے کچھ رقم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو دی اور

---

[1] علامہ نجم الحسن کراروی (متوفی ۱۹۸۲ء)، چودہ ستارے، ص ۹۵

فرمایا کہ عطر وخوشبو خرید لائیں اور باقی رقم حضرت اُمّ سلیمؓ کو دی کہ اس سے جناب سیّدہ فاطمہ علیہا السلام کے لیے جہیز اور اُمورِ خانہ داری کا سامان مہیا کریں۔ اُنھوں نے چاندی کے دو باز و بند، دو چادریں، دو بستر، گدّا، تکیہ، چار بالشت کپڑا، ایک پیالہ، ایک چکی، ایک مشکیزہ اور کچھ مشروبات وغیرہ خریدے۔[۱] بروایتے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے حضرت مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ کو رقم دے کر اشیا خریدنے کے لیے بھیجا اور حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو مدد کے لیے ساتھ بھیجا۔[۲] اُنھوں نے چیزیں لا کر حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے سامنے رکھیں۔ اُس وقت حضرت اسماء بنت عمیس بھی موجود تھیں۔

مختلف روایات میں جہیز کی فہرست میں ایک قمیض، ایک مقنع (سر ڈھانکنے کے لیے کپڑا)، ایک سیاہ کمبل، کھجور کے پتوں سے بنا ہُوا ایک بستر، موٹے ٹاٹ کے دو فرش، چار چھوٹے تکیے، ہاتھ کی چکی، کپڑے دھونے کے لیے تانبے کا ایک برتن، چمڑے کی مشک، ایک بادیہ (پانی پینے کا لکڑی کا برتن)، کھجور کے پتوں کا ایک برتن جس پر مٹی پھیر دیتے ہیں، دو مٹی کے آبخورے، مٹی کی صراحی، زمین پر بچھانے کا ایک چمڑا، ایک سفید چادر اور ایک لوٹا شامل تھے۔[۳] یہ جہیز اُسی رقم سے خریدا گیا تھا جو حضرت علی علیہ السلام نے اپنی زِرّہ بیچ کر حاصل کی تھی۔[۴]

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّاٰلِ مُحَمَّدٍ ○

---

[۱] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۱۱۱

[۲] علامہ محمد باقر مجلسی (متوفی ۱۶۹۸ء)، بحار الانوار، ج ۴۳ ص ۱۲۸

[۳] علامہ نجم الحسن کراروی (متوفی ۱۹۸۲ء)، چودہ ستارے، ص ۹۵

[۴] المستدرک الحاکم۔ مناقب ابن شہر آشوب۔ سعید بن منصور (متوفی ۲۲۷ھ)، کتاب السنن علی بن عیسیٰ اربیلی (متوفی ۶۹۴ ہجری)، کشف الغمۃ

غزوۂ سویق

(۵ ذوالحجہ ۲ ہجری/ ۲۹ مئی ۶۲۴ء)

غزوۂ بنو قینقاع کے بعد یہ غزوہ بروز یک شنبہ (اتوار) ۲۳ ذوالحجہ کو یا بروایتے ۵ ذوالحجہ ۲ ہجری/ ۲۹ مئی ۶۲۴ء کو واقع ہُوا۔ [1] ابنِ اسحٰق سے مروی ہے کہ غزوۃ الکدر سے مدینہ واپس آکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے بقیہ شوال اور ذوالقعدہ مدینہ میں بسر فرمایا اور ذوالحجہ میں غزوۃ السویق کے لیے مدینہ سے روانہ ہوئے۔ [2] ابوسفیان نے بدر میں شکست کے بعد منت مانی تھی کہ جب تک وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے بدلہ نہ لے لے غسل نہیں کرے گا چاہے وہ غسلِ جنابت ہی کیوں نہ ہو۔ تاریخ طبری میں یوں بیان کیا گیا ہے، ''عبداللہ بن کعب بن مالک سے جو انصار کے سب سے بڑے عالم تھے مروی ہے کہ جب ابوسفیان مکّہ واپس آیا اور قریش کی شکست خوردہ جماعت بدر سے مکّہ پہنچی تو اُس نے نذر مانی کہ جب تک میں محمد (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) سے نہ لڑوں گا غسلِ جنابت بھی نہیں کروں گا۔'' [3]

مگر حقیقت یہ تھی کہ بدر میں قریش کا جو عبرت ناک انجام ہُوا تھا اُس کے پیشِ نظر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا مقابلہ کرنے کی اُسے جرأت ہی نہیں ہوتی تھی۔ ماہِ رمضان سے ماہِ ذی الحج تک تین ماہ ہو گئے تھے اور موصوف نے ابھی تک غسل نہیں کیا تھا۔ عرب میں چیلنج کر کے پیٹھ دکھانا یا قسم کو توڑ ڈالنا بہت معیوب سمجھا جاتا تھا اور ابوسفیان تو اموی خاندان کا سربراہ اور مشرکینِ مکّہ کا قائد و سردار تھا جسے جنگِ بدر کے بعد قبیلے نے باقاعدہ طور پر منتخب کیا تھا اس لیے

---

[1] ڈاکٹر نصیر احمد ناصر، کتاب: پیغمبرِ اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم، ص ۴۸۹

[2] ابوجعفر محمد بن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ھ)، تاریخ طبری، ج ۲ ص ۱۶۳

[3] ابوجعفر محمد بن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ھ)، تاریخ طبری، ج ۲ ص ۱۶۳

اس نذر کی وجہ سے اُس کے لیے بہت بڑی مشکل کھڑی ہوگئی تھی۔ نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن۔ چنانچہ بغیر غسل رہتے رہتے جسم کی آلودگی جب جان کو آنے لگی تو ابوسفیان اپنی قسم کو پورا کرنے کے لیے قریش کے دوسوسواروں کے ساتھ اور بروایتے چالیس سواروں کے ساتھ مدینہ کی طرف نکلا۔[1]

یہ لوگ رات میں سفر کرتے اور دن میں کہیں چھپ جاتے تا کہ مسلمانوں کو اُن کی آمد کی خبر نہ ہوسکے۔ ابوسفیان کو اُمید تھی کہ یہودی اِس مہم میں اُس کا ساتھ دیں گے۔ وہ سمجھتا تھا کہ واقعۂ قینقاع کے بعد یہودیوں کے ایک قبیلے کی جلاوطنی سے باقی یہود قبائل اسلام کے سخت مخالف ہوچکے ہوں گے اور بنوقینقاع کا انتقام لینے کے لیے اُس کی مدد کریں گے۔ چنانچہ مدینہ سے ایک منزل پہلے اُس نے اپنے ساتھیوں کو اِدھر اُدھر چھپا دیا اور خود رات کے اندھیرے میں چھپتا چھپاتا قبیلہ بنونضیر کے سردار حیی بن اخطب کے دروازے پر پہنچا۔ ابوسفیان دروازہ کھٹکھٹاتا رہا لیکن حیی بن اخطب نے ڈر کے مارے دروازہ نہیں کھولا کہ نہ جانے کون ہے۔ اِدھر سے مایوس ہوکر وہ یہودیوں کے ایک اور سردار سلام بن مشکم کے ہاں پہنچا۔ سلام بن مشکم یہودیوں کے خزانے کا نگران بھی تھا۔ اُس نے ابوسفیان کی خوب خاطر داری کی، کھانا وانا کھلایا اور شراب پلائی لیکن اصل معاملے پر کوئی حوصلہ افزا بات نہ کی۔ ابوسفیان نصف شب تک یہودی سردار کا تعاون حاصل کرنے کے لیے کوشش کرتا رہا لیکن ناکام و نامراد ہوکر لوٹ آیا اور اپنی خفت مٹانے اور قسم پوری کرنے کے لیے ساتھیوں سمیت مدینہ کے بیرونی حصّے میں کھجوروں کے ایک باغ میں گھُس گیا۔ دو انصاری کسان باغ میں کام رہے تھے، اُنھیں قتل کیا، چند درختوں کو آگ لگائی اور پو پھٹنے سے پہلے پہلے وہاں سے فرار ہوگیا۔

ابوسفیان جلد از جلد مکّہ پہنچنا چاہتا تھا اس لیے سواریوں کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے اُن کا

---

[1] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۱۴۶

بار راستے میں گرانا شروع کردیا۔ یہ بار ''سویق'' کی بوریوں کی صورت میں تھا۔ صبح ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس واقعے کی خبر ملی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کرامؓ کے ساتھ قرقرۃ الکدر تک اُس کا تعاقب کیا لیکن وہ نکل چکا تھا۔ اس سفر میں مسلمانوں کو اُس کا گرایا ہُوا ''سویق'' ملا تھا، اسی نسبت سے اس غزوہ کو غزوۂ سویق کہا جاتا ہے۔[۱] عربی زبان میں ستّو یعنی بھُنے ہوئے جَو کے آٹے کو سویق کہتے ہیں۔

شاعر اُمیّہ بن صلت کی موت

اسی سال سنہ ۲ ہجری میں، اُمیّہ بن صلت کی موت واقع ہوئی۔ وہ ایک شاعر تھا اور زمانۂ جاہلیت میں مذہبی رُجحان رکھتا تھا اس لیے بت پرستی ترک کرکے خدا پرستی کی طرف مائل ہوگیا۔ اُس نے گزشتہ ادیان کی کتب پڑھیں اور متاثر ہوکر دینِ نصاریٰ اختیار کرلیا۔ پھر وہ نُورِ نبوّت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ظہور کا منتظر رہنے لگا۔ اُس کے اشعار علم و حکمت سے بھرپور ہوا کرتے تھے مگر اپنی ذات میں پائی جانے والی چند صلاحیتیں محسوس کرکے اُس کے دماغ میں اپنی نبوّت و رسالت کا خیال سما گیا اور وہ خبطی ہوگیا۔ پس اُس نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اعلانِ نبوّت سُنا تو حسد و شقاوت میں مبتلا ہوکر کفر و انکار کی ضلالت میں پڑ گیا اور بالآخر اُسی عالم میں جہنم واصل ہوگیا۔[۲]

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّاٰلِ مُحَمَّدٍ ۝

۞

---

[۱] محمد ابن سعد (متوفی ۲۳۰ ہجری)، طبقات ابن سعد
ابن خلدون (متوفی ۱۴۰۶ء)، تاریخ ابن خلدون ص ۹۲۔ ابن ہشام (متوفی ۸۳۳ء)، سیرت النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

[۲] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۱۴۶

سنہ ۳ ہجری

نمازعید قربان اور قربانی

(۱۰ ذی الحج ۲ ہجری/ ۳ جون ۶۲۴ء)

موٴرخین لکھتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے غزوۂ سویق سے مراجعت فرمائی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دو تحفے عنایت ہوئے، ایک عیدالاضحیٰ اور دوسرا قربانی اور وہ ۱۰ ذی الحج ۲ ہجری/ ۳ جون ۶۲۴ء کا دن تھا۔ [۱] ''مدارج النبوّت'' میں ہے کہ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غزوۂ قینقاع سے واپس تشریف لائے تو عید قربان کی نماز ادا فرمائی اور مالدار صحابہ کے ساتھ قربانی کی۔ [۲]

غزوۂ ذی امر/غزوۂ بنی ام/غزوہ انمار/غزوۂ غطفان

(محرم الحرام یا ربیع الاوّل ۳ ہجری)

یہ غزوہ ہجرت کے تیسرے سال محرم میں [۳] اور بروایتے بارہ ربیع الاوّل کو واقع ہُوا۔ [۴] اس مہم کو غزوۂ ذی امر، غزوۂ بنی ام، غزوہ انمار اور غزوۂ غطفان بھی کہا جاتا ہے۔ [۵] ذی امر، قبیلہ غطفان کے ایک چشمے کا نام تھا اور اسی نسبت سے ابن سعد نے طبقات میں اس کا نام غزوۂ

---

[۱] ڈاکٹر نصیر احمد ناصر، کتاب: پیغمبر اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

[۲] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۱۴۶

[۳] ڈاکٹر نصیر احمد ناصر، کتاب: پیغمبر اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ص ۴۹۲

[۴] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۱۴۶

[۵] ابن ہشام (متوفی ۸۳۳ء)، سیرت النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اردو

شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۱۴۶

غطفان لکھا ہے۔ [1]

نجد کے قبیلہ غطفان کے دو گروہوں بنی ثعلبہ اور بنی محارب نے اپنے سردار ''دعشور غطفان'' اور بقولے خطیب بغدادی، ''غواث'' کی سرکردگی میں مدینہ پر حملے کا منصوبہ بنایا۔ وہ لوگ نجد کے علاقے مقام ذی امر میں جمع ہو کر ابھی غارت گری کی تیاریوں میں مصروف تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اُن کے ناپاک عزائم کی خبر ہوگئی۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم محرم ۳ ہجری/ جون ۶۲۴ء میں چارسو اور بقولے چار سو پچاس مجاہدین کے ساتھ اُن کی سرکوبی کے لیے نجد روانہ ہوئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی غیر متوقع پیش قدمی سے وہ لوگ گھبرا گئے اور بھاگ کر پہاڑوں میں رُوپوش ہو گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تقریباً ڈیڑھ ماہ تک وہاں قیام فرمایا مگر کسی کو سامنے آنے کی ہمت نہ ہوئی۔ [2] نجدیوں کی بغاوت فرو ہو چکی تھی چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے واپسی کا ارادہ فرمایا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اللہ پر یقین اور جلالِ حقانیت کا ایک مشہور واقعہ جو اِس غزوے کے دوران میں پیش آیا، حیاتِ رسولِ معظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر لکھے گئے مضامین اور کتب میں تواتر کے ساتھ پایا جاتا ہے۔ قارئین کے استفادہ کے لیے ہم یہاں اس کا ذِکر ضروری سمجھتے ہیں۔ روایت ہے کہ جناب سرورِ انبیا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک درخت کے نیچے اکیلے آرام فرما رہے تھے کہ پہاڑوں میں چھپے ہوئے نجدیوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھ لیا۔ اُنھوں نے اپنے سردار دعشور سے کہا کہ اس وقت محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) تنہا ہیں اور یہ موقع خوب ہے لہٰذا تم آگے بڑھو، ہمیں اُمید ہے کہ تم اُن پر قابو پالو گے۔ دعشور نے دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہؓ کافی دُور تھے چنانچہ موقع سے فائدہ اُٹھانے کے لیے وہ تلوار لیے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سر پر پہنچ گیا اور للکار کر کہنے لگا، ''کون ہے جو آج آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو میرے ہاتھ سے بچائے گا؟''

---

[1] سید محسن امین عاملی (متوفی ۱۹۵۳ء)، اعیان الشیعہ، ج ۲ ص ۱۷۸، علامہ علی نقی نقوی، تاریخ اسلام، ص ۲۱۹

[2] علامہ علی نقی نقوی، تاریخ اسلام ص ۲۲۰ بحوالہ طبری، ج ۳ ص ۲

نبی اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نہایت سکون سے فرمایا، ''اللہ۔ وہی میرا محافظ ہے۔'' اُس وقت جبرائیل علیہ السلام آئے اور دعشور کے سینے پر ہاتھ مارا۔ وہ زمین پر گر کر دھول چاٹنے لگا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُس کے ہاتھ سے تلوار لے لی اور فرمایا، ''کون ہے جو تجھے میرے ہاتھ سے بچائے گا؟'' وہ کہنے لگا، ''کوئی نہیں۔'' اور پھر کہا، ''اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللهُ وَ اَنَّكَ رَسُوْلُ الله'' (میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور آپ اللہ کے رسول ہیں)۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُس کی تلوار اُسے واپس کر دی اور وہ بوجھل قدموں سے اپنی قوم کی طرف لوٹ گیا۔ اُس کے ساتھی کہنے لگے کہ تُو تو تلوار سونت کے اُن کے سر پر پہنچ گیا تھا پھر وار کیوں نہیں کیا؟ کیا ہو گیا تھا تجھے؟ اُس نے کہا کہ ایک بُلند قامت نورانی آدمی نے میرے سینے پر ہاتھ مار کر مجھے پیٹھ کے بل گرا دیا تھا۔ بروایتے دعشور خود بھی ایمان لایا اور اُسنے اپنی قوم کو بھی اسلام کی دعوت دی۔

''المواهبُ اللدنية'' میں اس واقعے کو غزوۂ ذات الرقاع سے منسوب کیا گیا ہے لیکن شیخ عبدالحق محدث دہلوی لکھتے ہیں، ''میں بتوفیقِ الٰہی کہتا ہوں کہ جو واقعہ غزوۂ ذات الرقاع میں صلوٰۃ خوف کی حدیث کے ضمن میں صحیح بخاری میں ہے وہ یہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک درخت کے نیچے محوِ خواب تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تلوار درخت کی شاخ سے آویزاں تھی۔ اُس وقت ایک اعرابی آیا اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تلوار کھینچ کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سرہانے کھڑا ہو گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بیدار ہو گئے۔ اعرابی نے کہا، ''من يمنعك منی''، یعنی مجھ سے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو کون بچائے گا؟ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، ''اللہ۔'' اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُس کے ہاتھ سے تلوار چھین کر اُسے دھکا دے دیا۔ ''بخاری'' میں اُس کے ایمان لانے کا ذِکر نہیں ہے مگر قسطلانی نے واقدی سے نقل کیا ہے کہ وہ اسلام لے آیا اور اپنی قوم کی طرف لوٹ گیا۔ [1]

---

[1] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۱۴۶

سریہ محمد بن مسلمہؓ

(۱۴ ربیع الاوّل ۳ ہجری/ ۴ ستمبر ۶۲۴ء)

سریہ محمد بن مسلمہؓ، ۱۴ ربیع الاوّل ۳ ہجری/ ۴ ستمبر ۶۲۴ء کو پیش آیا۔ یہ سریہ بھی سریہ عمیر بن عدیؓ اور سریہ سالم بن عمیرؓ سے مطابقت رکھتا ہے۔ سریہ عمیر بن عدی میں حضرت عمیرؓ نے ایک یہودی ہجوگو شاعرہ عصماء بنت مروان کو قتل کیا تھا اور سریہ سالم بن عمیر میں ایک یہودی شاعر ابی عفکہ کو جہنم واصل کیا گیا تھا۔ اِس سریے میں حضرت محمد بن مسلمہؓ نے کعب بن اشرف کو قتل کیا۔ کعب بن اشرف ماں کی طرف سے یہودی تھا لیکن خود کو بُت پرست ظاہر کرتا تھا۔ بروایتے وہ ایک یہودی سردار اور شعلہ بیان شاعر تھا۔ وہ مسلمانوں کے خلاف باغیانہ سرگرمیوں میں حصّہ لینے والے شرپسند عناصر کا سرغنہ تھا اور انتہائی گھٹیا اور بیہودہ خیالات کا مالک تھا۔ وہ اپنی لچر شاعری میں مسلمان خواتین کے نام استعمال کرتا اور اُن سے متعلق فرضی اور بیہودہ قصے نظم کرتا۔ وہ بدبخت اسی پر اکتفا نہ کرتا بلکہ اپنی لغو شاعری کے ذریعے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی شان میں گستاخی کا ارتکاب بھی کیا کرتا۔ بدر میں کفّار کی شکست کی خبر سُن کر وہ مکّہ گیا اور شکست خوردہ قبائل سے ہمدردی کا اظہار کیا۔ اُس نے اُن کے مقتولین پر نوحہ خوانی کی اور اُنھیں مسلمانوں کے خلاف خوب بھڑکایا اور شکست کا بدلہ لینے پر اُکسایا۔ بعض مورّخین کے نزدیک اُحد کی جنگ کے اسباب پیدا کرنے میں اُس کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ وہ اپنی شاعری میں مسلمان عورتوں کی خوبصورتی کے قصیدے اور فرضی عشقیہ قصّے اس لیے بیان کرتا تھا کہ قریش کو اُن کی طرف مائل کر کے اُن کے اندر ایسا جنون پیدا کر سکے کہ وہ مسلمان عورتوں کو حاصل کرنے کے لیے دیوانے ہو جائیں اور مدینہ پر حملہ آور ہونے کے لیے اُٹھ کھڑے ہوں۔ اسلام دشمنی پر مبنی یہ اُس کی انتہائی گھٹیا اور گھناؤنی چال تھی۔ جب اُس کی حرکتیں ناقابلِ برداشت ہو گئیں تو محمد بن مسلمہؓ ایک مختصر سی جماعت کے ساتھ اُس کی سرکوبی کو بھیجے گئے۔ اُنھوں نے ایسے ڈرامائی انداز

میں اُسے قتل کیا کہ یہودیوں میں سراسیمگی پھیل گئی اور اُنھیں اپنے سابقہ عہد کی تجدید کرنا پڑی۔

اِن تینوں سریات میں قتل کیے جانے والے تمام لوگ یہودی تھے جو اسلام اور اسلام کے ماننے والوں کے خلاف زہر اُگلتے تھے، اپنی قوم کو ان کے خلاف جنگ پر اُکساتے تھے اور پیغمبرِ اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شانِ اعلیٰ میں گستاخیاں کرتے تھے۔ اس کی وجہ سمجھنے کے لیے آپ اپنے راہوارِ خیال کو کچھ دیر کے لیے پیچھے لے جائیں اور دیکھیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بچپن میں اپنے شفیق و عظیم چچا جناب ابوطالب علیہ السلام کے ساتھ جو سفرِ شام کیا تھا اُس میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی علاماتِ نبوّت دیکھ کر ایک یہودی راہب بحیریٰ، حضرت ابوطالب سے کیا کہہ رہا ہے؟ بحیریٰ کہہ رہا تھا کہ اِن میں جو نشانیاں میں نے ملاحظہ کی ہیں اُن کو دیکھ کر کوئی بھی یہودی انھیں پیغمبرِ اعظم و آخر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی حیثیت سے پہچان کر اِن کا دشمن بن جائے گا اور انھیں نقصان پہنچانے کی کوشش کرے گا۔

یہودیوں کی یہ دشمنی اور بغض و کینہ دراصل اِس وجہ سے تھا کہ اُن کی دیرینہ آرزو تھی کہ نبیِ آخرالزمان صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ظہور اُن کی قوم کے اندر ہو چنانچہ جب اُن کی اُمیدوں کے چراغ گُل ہوئے تو سینوں میں بغض و عناد اور حسد و کینہ کی آگ بھڑک اُٹھی۔ بدر میں کفّار کا انجام دیکھ کر اُنھیں کھل کر سامنے آنے کی جرأت تو ہوتی نہیں تھی اس لیے اِدھر اُدھر بیہودہ بکواس کرتے، دینِ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف شعلہ بیانی کرتے اور شعروں کے ذریعے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی توہین کر کے اپنی انتقام کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اُن کی ایسی سرگرمیاں اور ریشہ دوانیاں دو قوموں کے درمیان خونی تصادم کا باعث بن سکتی تھیں اس لیے حالات کا تقاضا تھا کہ کئی لوگوں کی جانیں بچانے کے لیے صرف اُن کو ختم کر دیا جائے جو کئی جانوں کے ضیاع کا سبب بن سکتے تھے۔

یہاں ایک اہم نکتے کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ ایک ''عام انسان'' کی اہانت

کرنے پر کسی کو قتل کر دینا مذہبی اور معاشرتی حوالے سے ایک ناپسندیدہ فعل ہوسکتا ہے لیکن رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی توہین کرنا ایک ناقابلِ معافی جرم ہے جس کی سزا دُنیا میں موت اور آخرت میں عذابِ عظیم ہے۔

اہلِ سنت علمائے کرام کا موقف ہے کہ جو شخص (چاہے وہ کافر ہو یا مسلم) سیّد الاوّلین والآخرین، شفیع المذنبین، رحمۃ للعالمین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ گرامی کی ہنسی اُڑائے یا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت و زندگی کے کسی گوشے کے بارے میں استہزائیہ انداز اختیار کرے یا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی توہین و تنقیص کرے یا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان میں گستاخی کرے یا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو گالی دے یا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف بُری باتوں کو منسوب کرے تو وہ شخص سراسر کافر، مرتد، زندیق اور مُلحِد ہے۔ اگر ایسا شخص کسی مسلمان ملک میں ہو تو اُس کو قتل کرنا اُس ملک کی حکومت پر واجب ہے۔ مشہور قول کے مطابق ایسے ملعون کی توبہ قبول نہیں کی۔ وہ کافر ہے اور جو اُس کے کفر میں شک کرتا ہے وہ بھی کافر ہے اور یہ ائمہ اربعہ کا مسلک ہے اور اس پر اُمت کا اجماع ہے۔

شیخ الاسلام تقی الدین ابو العباس احمد بن عبد الحلیم بن عبد السلام الحرانی الدمشقی ابن تیمیہ نے اپنی مشہور و معروف کتاب "الصَّارِمُ المَسْلُوْلُ عَلیٰ شَاتِمِ الرَّسُوْل" میں نقل کیا ہے کہ عام اہلِ علم کا مذہب ہے کہ جو آدمی (خواہ وہ مسلمان ہو یا کافر) نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو گالی دیتا ہے تو اُس کو قتل کرنا واجب ہے۔ ابن منذر نے بیان کیا کہ عام اہلِ علم کا اجماع ہے کہ جو آدمی نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو گالی دیتا ہے، اُس کی حد قتل کرنا ہے اور اسی بات کو اہلِ سنت کے ائمہ امام مالک، امام لیث، امام احمد اور امام اسحق نے بھی اختیار کیا ہے اور امام شافعی کا بھی یہی مذہب ہے۔ ابوبکر فارسی نے اصحابِ امام شافعی سے مسلمانوں کا اجماع نقل کیا ہے کہ شاتمِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حد قتل ہے۔[1]

"محمد بن سحنون کہتے ہیں کہ علما کا اجماع ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گستاخ اور

---

[1] تقی الدین ابن تیمیہ، متوفی (۷۲۸ھ)، الصَّارِمُ المَسْلُوْلُ عَلیٰ شَاتِمِ الرَّسُوْل

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی توہین وتنقیص کرنے والا کافر ہے اور حدیث میں اس کے لیے سخت سزا کی وعید آئی ہے اور اُمتِ مسلمہ کے نزدیک اُس کا شرعی حکم قتل ہے۔ اور جو آدمی اُس شخص کے کفر اور عذاب کے بارے میں شک وشبہ کرے گا وہ بھی کافر ہوگا۔[1]

ابن تیمیہ نے "ابن سحنون" سے مزید نقل کیا ہے کہ اگر (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو) گالی دینے والا مسلمان ہے تو وہ کافر ہو جائے گا اور بلا اختلاف اُس کو قتل کر دیا جائے گا۔ اور یہ ائمہ اربعہ وغیرہ کا مذہب ہے۔[2]

احمد بن حنبل نے تصریح کی ہے کہ جو آدمی بھی خواہ مسلمان ہو یا کافر اگر رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو گالی دیتا ہے یا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی توہین وتنقیص کرتا ہے اُس کو قتل کرنا واجب ہے اور میری رائے یہ ہے کہ اُس کو توبہ کرنے کے لیے مہلت نہ دی جائے گی بلکہ فوراً ہی قتل کر دیا جائے گا۔[3]

شیعہ علمائے کرام کے نزدیک بھی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان میں گستاخی کرنے والا واجب القتل ہے۔[4]

ماضی قریب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان میں ایک ملعون سلمان رشدی نے گستاخی کا ارتکاب کیا تھا۔ اُس وقت راہبرِ انقلابِ اسلامی اور اسلامی جمہوریہ ایران کے بانی آیت اللہ سیّد روح اللہ خمینی نے اُس کے خلاف فتویٰ جاری کرتے ہوئے اُسے واجب القتل قرار دیا تھا۔ اُنھوں نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان میں گستاخی کرنے والا ملعون سلمان رشدی،

---

[1] المرجع السابق (۳،۴)

[2] الصارم المسلول (۳،۴)

[3] المرجع السابق (ص:۴)

[4] شیخ محمد بن یعقوب کُلینی (متوفی ۳۲۹ء)، الکافی، ج۷، ص۲۵۹۔ محمد بن حسن طوسی، تہذیب الاحکام، ج۱۰، ص۱۴۱۔ شریف مرتضیٰ، الانتصار، ص۴۸۱۔ آغا خوئی، مبانی تکملۃ المنہاج، ج۱، ص۲۶۴ سیّد خوانساری، جامع المدارك، ج۷، ص۱۰۹۔ شیخ جواہری، جواھر الکلام، ج۴۱، ص۴۳۲

واجب القتل ہے اور جو اُس کو مارتا ہُوا مارا جائے وہ شہید ہے۔ یہ مُرتد اگر توبہ بھی کر لے یا اپنے زمانے کا سب سے بڑا زاہد بھی بن جائے، پھر بھی اس کے خلاف فتوی اپنی جگہ باقی رہے گا۔ آیت اللہ سیّد علی خامنہ ای بھی فرماتے ہیں کہ سلمان رشدی کیخلاف فتویٰ اس کی توبہ کی صورت میں بھی تبدیل نہیں کیا جا سکتا۔ [۱]

آیت اللہ سیّد رُوح اللہ خمینی کے پیغام اور فتویٰ کا مکمل متن [۲]

موضوع: آیاتِ شیطانی کی کفر آمیز کتاب کے مؤلف سلمان رشدی کے قتل کا فتویٰ

تمام مسلمانانِ عالم کے نام

بسمہ تعالی

اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیۡہِ رٰجِعُوۡنَ

پورے عالم کے غیور مسلمانوں کو اعلان کرتا ہوں کہ کتاب (شیطانی آیات، جو اسلام، قرآن اور پیغمبرِ اسلام (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے خلاف تدوین اور شائع ہوئی ہے کا مؤلف اور ناشرین واجبُ القتل ہیں۔ میں تمام غیور مسلمانوں سے چاہتا ہوں کہ ان افراد کو جہاں بھی پائیں، معدوم (قتل) کر دیں تا کہ اس کے بعد کوئی بھی مسلمانوں کے مقدسات کی توہین کی جرأت نہ کر سکے اور جو بھی اس راہ میں مارا جائے وہ شہید ہے ان شاء اللہ۔ اگر کتاب کا مؤلف کسی کی دسترس میں ہے مگر وہ اُس کو قتل کرنے کی طاقت نہیں رکھتا تو اُس کا فرض ہے کہ دوسرے مسلمانوں کو بتا دے تا کہ وہ اپنے عمل کی سزا پائے۔

والسّلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

---

[۱] http://www.islamtimes.org/ur/doc/news/224951/txt/

[۲] ویب سائٹ ابنا ڈاٹ کوم (خبر گزاری اہل بیت علیہم السلام)

غزوۂ نجران یا غزوۂ بنوسلیم

(ربیع الآخر ۳ ہجری/ستمبر، اکتوبر ۶۲۴ء)

نجران، موجودہ سعودی عرب کے شمال مغرب میں یمن کی سرحد کے قریب ایک شہر کا نام ہے۔ یہ غزوہ اُسی شہر میں واقع ہُوا اس لیے اسے غزوۂ نجران اور وہاں رہنے والے قبیلے بنوسلیم کی نسبت سے غزوۂ بنوسلیم کہا جاتا ہے۔ محرم ۳ ہجری/ جون ۶۲۴ء میں بنوغطفان کی بغاوت کے بعد ربیع الآخر ۳ ہجری/ستمبر، اکتوبر ۶۲۴ء میں نجران کے قبیلہ بنوسلیم نے سر اُٹھایا۔ رسولِ گرامی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خبر ملی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن اُمّ کلثومؓ کو مدینہ کا عامل مقرر فرمایا اور تین سو مجاہدین کا ایک دستہ لے کر فوراً نجران روانہ ہوگئے۔ بنوسلیم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھا تو اُن پر جلالِ نبوّت کی ایسی ہیبت طاری ہوئی کہ سامنے آنے کی ہمت نہ ہوئی اور اپنے کنوؤں اور تالابوں پر بکھر کر کام کاج میں مصروف ہوگئے یعنی اُنھوں نے راہِ فرار اختیار کرلی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وہاں پر کچھ دیر چہل قدمی فرمائی لیکن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقابل کوئی نہ آیا چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُن سے درگذر فرمایا اور واپس تشریف لے آئے۔[۱]

تحریکِ اسلام کا سفر انتہائی دشوار گذار اور پُرخطر تھا، اس میں قدم قدم پر سازشوں کے جال بکھرے ہوئے تھے اور کم ظرف و چالباز دشمنوں اور منافقوں سے واسطہ تھا لیکن اس تحریک کے قائد جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی خود اعتمادی، بے مثال تدبُّر اور خُلقِ عظیم کی بدولت ہر مرحلے پر کامیاب و کامران تھے۔ اس غزوے میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نفیس مزاجی، اعلیٰ ظرفی اور عظمت و وقار قابلِ غور ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب دیکھا کہ دشمن نے مقابلے پر آنے کی جرأت نہیں کی تو اُنھیں للکارانہ حملہ آور ہوئے بلکہ کشت وخون سے اجتناب فرمایا اور میدانِ جنگ میں مجاہدانہ وقار کے ساتھ محض چہل قدمی فرما کر دشمن پر اپنی عظمت وجلال کو ظاہر فرمایا۔

---

[۱] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۱۵۰

احمد بن محمد قسطلانی (متوفی ۹۲۳ہجری)، المواہبُ اللدنیہ

حضرت حفصہؓ سے نکاح
(شعبان ۳ ہجری/فروری ۶۲۵ء)

شعبان ۳ ہجری، جنوری یا فروری ۶۲۵ء میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے حضرت عمر بن خطابؓ کی بیٹی حضرت حفصہؓ سے نکاح فرمایا۔

ولادتِ امام حسن علیہ السلام
(۱۵ رمضان ۳ ہجری، یکم مارچ ۶۲۵ء)

۱۵ رمضان ۳ ہجری بمطابق یکم مارچ ۶۲۵ء کی رات پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی پیاری بیٹی حضرت فاطمۃ الزہراء علیہا السلام کے ہاں پہلے فرزند جناب امام حسن علیہ السلام کی ولادت ہوئی۔ مؤرّخین کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے گھر میں یہ اپنی نوعیت کی پہلی خوشی تھی۔ کفّارِ مکّہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو ''ابتر'' کہہ کر طعنہ زنی کیا کرتے تھے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا کوئی فرزند نہیں چنانچہ سورۃ الکوثر نازل ہُوا جس کی عملی تفسیر امام حسن علیہ السلام کی ولادت کی صورت میں سامنے آئی۔

حضرت فاطمہ علیہا السلام کی اولادِ اطہار سے گیارہ امام متوّلِد ہوئے جن کے ذریعے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی نسلِ پاک آگے بڑھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ارشادِ گرامی ہے قیامت میں میرے سلسلے کے سوا سارے سلسلے ٹوٹ جائیں گے اور کسی کا رشتہ کسی کے کام نہ آئے گا۔[۱]

علامہ حسین واعظ کاشفی لکھتے ہیں کہ تمام انبیا کی اولاد ہمیشہ قابلِ تعظیم سمجھی جاتی رہی ہے لیکن ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اس معاملے میں سب سے زیادہ حق دار ہیں۔[۲]

علامہ جلال الدین فرماتے ہیں کہ حضرات حسنین علیہم السلام کی اولاد کے لیے سیادت مخصوص ہے۔ مرد ہو یا عورت، جو بھی اُن کی نسل سے ہے وہ قیامت تک ''سیّد'' رہے گا اور ساری کائنات

---

[۱] ابن حجر مکی (متوفی ۹۷۴ھ)، الصواعق المحرقۃ، ص ۹۳

[۲] حسین بخش واعظ کاشفی کمال الدین (متوفی ۹۱۰ھ)، روضۃ الشہدا، ص ۴۰۴

پر واجب ہے کہ ہمیشہ اُن کی تعظیم کرتی رہے۔[۱]

منقول ہے کہ قبلِ ولادت سبطِ اکبر علیہ السلام، حضرت اُمّ الفضل نے خواب میں دیکھا کہ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جسمِ اطہر کا ایک ٹکڑا اُن کے گھر میں پہنچا۔ اُنھوں نے وہ خواب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بیان کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ عنقریب میری لختِ جگر فاطمہ (علیہا السلام) کے بطن سے ایک بچّہ پیدا ہوگا جس کی پرورش آپ کریں گی۔ بقولے، اُمّ الفضل نے یہ خواب حضرت امام حسین علیہ السلام کی ولادت سے پہلے دیکھا۔[۲]

روایت ہے کہ امام حسن علیہ السلام کی پیدائش کے بعد جبرائیل علیہ السلام نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں ایک سفید ریشمی رومال پیش کیا جس پر ''حسن'' لکھا ہُوا تھا۔[۳] چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نواسے کا نام حسن (علیہ السلام) رکھا۔ ماہرِ علم النسب علامہ ابوالحسین کا کہنا ہے کہ خداوندعالم نے حضرت فاطمہ علیہا السلام کے دونوں شاہزادوں کے نام انظارِ عالم میں پوشیدہ رکھے تھے۔ یعنی اِن سے پہلے حسن و حسین نام سے کوئی موسوم نہیں ہُوا تھا۔ ''اعلام الوریٰ'' کے مطابق یہ نام بھی لوحِ محفوظ میں پہلے سے لکھا ہُوا تھا۔[۴]

بروایتے، ولادت کے بعد جب امام حسن علیہ السلام کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی گود میں دیا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بے حد خوش ہوئے اور اُن کے دہنِ مبارک کو اپنی زبانِ اطہر سے سیراب فرمایا۔[۵] آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نواسے کو آغوش میں لے کر پیار کیا، دائیں کان میں اذان اور بائیں میں اقامت کہی، زبانِ اطہر چوسائی اور دُعا کی کہ خدایا! اِس کو اور اِسکی اولاد کو اپنی پناہ میں رکھنا۔[۶]

---

[۱] علامہ نجم الحسن کراروی (متوفی ۱۹۸۲ء)، چودہ ستارے بحوالہ لوامع النزیل ج ۳ ص ۳
اسعاف الراغبین برحاشیہ نور الابصار شبلنجی ص ۱۱۴ طبع مصر

[۲] شیخ مفید، الرشاد، ص ۴۳۲

[۳] علامہ محمد باقر مجلسی (متوفی ۱۶۹۸ء)، بحار النوار

[۴] علامہ طبرسی (متوفی ۵۳۲ء) اعلام الوریٰ۔ علامہ نجم الحسن کراروی (متوفی ۱۹۸۲ء)، چودہ ستارے، ص ۱۷۸

[۵] علل الشرائع

[۶] علامہ محمد باقر مجلسی (متوفی ۱۶۹۸ء)، بحار النوار

غزوۂ اُحد

(٦ شوال ٣ ہجری/ ٢٢ مارچ ٦٢٥ء)

اُحد کی وجہ تسمیہ

''اُحد'' مدینہ منوّرہ کا ایک مشہور پہاڑ ہے جو شمال کی جانب تقریباً دو میل کی مسافت پر واقع ہے یہ پہاڑ دیگر پہاڑوں سے منقطع اور بالکل الگ ہونے کی وجہ سے ''اُحد'' کہلاتا ہے، یہ غزوہ اسی پہاڑ کے دامن میں واقع ہُوا اس لیے اسے غزوۂ اُحد کہا جاتا ہے۔ غزوۂ اُحد ٧ شوال اور بقولے ١٥ شوال کو ہجرت کے بتّیس ماہ بعد ٣ ہجری میں ہُوا۔[1] مورّخین نے اس کی تاریخ ٣ ہجری ٦ شوال، ٧ شوال، ١١ شوال اور نصف شوال کے بعد بھی بیان کی ہے۔

غزوۂ اُحد کا پس منظر

اس غزوے میں بعض مسلمان اُس مرکزِ استقامت سے جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے متعین فرمایا تھا، متزلزل ہوگئے تھے۔ وہ ثابت قدم نہ رہے اور اسبابِ دُنیا یعنی مالِ غنیمت اکٹھا کرنے کی طرف متوجہ ہوگئے۔[2] جیسا کہ پروردگارِ عالم نے فرمایا:[3]

وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗۤ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ ۚ حَتّٰۤى اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِى الْاَمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَاۤ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ؕ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۚ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ ۚ وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ ؕ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿١٥٢﴾

(خدا نے اپنا وعدہ پورا کردیا جب تم اُس کے حکم سے کفّار کو قتل کر رہے تھے یہاں تک کہ تم نے

---

[1] سید محسن الامین العاملی (متوفی 1952)، اعیان الشیعہ، ج ٢ ص ١٧٧

[2] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ١٦٤٢ء)، مدارج النبوت، ج ٢ ص ١٥٣

[3] سورۃ آلِ عمران، آیت ١٥٢

کمزوری کا مظاہرہ کیا اور آپس میں جھگڑا کرنے لگے اور اُس وقت خدا کی نافرمانی کی جب اُس نے تمھاری محبوب شے کو دکھلا دیا تھا تم میں سے کچھ دُنیا کے طلبگار تھے اور کچھ آخرت کے۔)

وحشت و مصیبت سے بھرپور اس غزوے میں فتح و نصرت اور عزت و رفعت آخر کار اہلِ ایمان کا مقدر بنی۔ ''المواھب اللدنیہ'' میں بعض علما سے منقول ہے'' جو یہ کہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس غزوہ میں شکست و ہزیمت ہوئی تھی، اُس سے توبہ کرائی جائے اور اگر توبہ نہ کرے تو وہ واجبُ القتل ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یقینِ کامل پر گامزن تھے لہٰذا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف ہزیمت کی نسبت کرنا موجبِ کفر ہے۔''[۱]

اسلام کی روز افزوں بڑھتی ہوئی طاقت کفّار کے لیے سخت پریشانی کا باعث تھی اور وہ اس قوّت کا قلع قمع کر دینا چاہتے تھے۔ وہ طلوعِ اسلام کے وقت سے ہی ہر طرح سے اسلام کا نام و نشان مٹانے کی کوششوں میں مصروف تھے لیکن اُن کی کوئی کوشش بارآور ثابت نہیں ہو رہی تھی حتیٰ کہ بدر میں بھی اُن کو سخت ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا جس کی وجہ سے اُن کا جذبۂ انتقام بھڑک اُٹھا تھا۔ انتقام کی اس آگ کو ایک یہودی کعب بن اشرف (بالائی صفحات پر سریہ محمد بن مسلمہؓ میں اس کا انجام بیان کیا جا چکا ہے) نے خوب ہوا دی تھی۔ اُس نے مکّہ جا کر قریش کے مقتولینِ بدر پر نوحہ خوانی کی، جوش دلانے والے اشعار کہے اور اُنھیں انتقام لینے پر اُکسایا تھا چنانچہ اب قریش کا منصوبہ یہ تھا کہ اپنی تمام تر مالی اور عسکری قوّت کو یکجا کر کے مسلمانوں پر ایسی کاری ضرب لگائی جائے کہ اسلام اور اسلام کے پیروکار صفحۂ ہستی سے مٹ جائیں اور اس طرح بدر کی شکست کا جو داغ اُن کے دامن پر لگا تھا، وہ دھل جائے۔[۲]

---

[۱] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۱۵۳
احمد بن محمد قسطلانی (متوفی ۹۲۳ ہجری)، المواھبُ اللدنیہ

[۲] کے اے حمید، تاریخ مسلمانانِ عالم، ج ۱ ص ۵۔ علامہ علی نقی نقوی، تاریخ اسلام، ص ۲۲۳

اس جنگ کے لیے سب سے زیادہ پر جوش ابوسفیان اور اُس کی بیوی ہندہ تھے کیونکہ جنگِ بدر میں اُن کا بیٹا حنظلہ، ہندہ کا باپ عتبہ، چچا شیبہ اور بھائی ولید اپنے ساتھیوں کے ساتھ مارے گئے تھے اور اُن کے انتقام نے اُنھیں دیوانہ کر دیا تھا۔ پس وہ اس منصوبے پر عمل پیرا ہونے کے لیے بہت جوش وخروش کے ساتھ میدان میں آ گئے۔

روایت ہے کہ ابوسفیان نے اپنے اُس تجارتی قافلے کے مال کو جسے وہ بدر کے موقع پر شام سے مکّہ لایا تھا، دارالندوہ میں رکھا اور لوگوں سے کہا کہ اپنے اموال سے ہماری اعانت کرو تاکہ ہم ایک عظیم لشکر تیار کریں اور محمد (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) سے جنگ کر کے بدر کا انتقام لیں۔ مؤرّخین لکھتے ہیں کہ تجارتی قافلے کا وہ مال ایک ہزار اُونٹ کے بوجھ کا تھا جس کی اصل قیمت پچاس ہزار مثقال تھی جب کہ اُس کا نفع بیس ہزار مثقال تھا۔ عبداللہ بن اُبی، ربیعہ، عکرمہ بن ابوجہل، صفوان بن اُمیّہ اور کئی اور روسائے قریش مل کر ابوسفیان کے پاس آئے اور پھر سب مل کر اُن لوگوں کے پاس گئے جن کا سرمایہ اُس تجارتی قافلے میں لگا ہُوا تھا، اُنھوں نے تجویز پیش کی کہ اس مرتبہ تجارت میں جو رقم حاصل ہوئی ہے سب کی سب جنگ کے فنڈ میں جمع کرا دی جائے چنانچہ تمام لوگ اس پر متفق ہو گئے۔ اس کا ذِکر قرآن مجید میں یوں آیا ہے:[١]

اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا یُنۡفِقُوۡنَ اَمۡوَالَہُمۡ لِیَصُدُّوۡا عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ ؕ فَسَیُنۡفِقُوۡنَہَا ثُمَّ تَکُوۡنُ عَلَیۡہِمۡ حَسۡرَۃً ثُمَّ یُغۡلَبُوۡنَ ۬ؕ وَ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡۤا اِلٰی جَہَنَّمَ یُحۡشَرُوۡنَ ﴿۳۶﴾

(بے شک جولوگ کافر ہیں وہ اس لیے اپنے مال خرچ کرتے ہیں کہ (لوگوں کو) خدا کی راہ سے روکیں یہ آئندہ بھی اسی طرح خرچ کریں گے اور پھر انجام کار یہ (مال خرچ کرنا) ان کے لیے حسرت اور پچھتاوے کا باعث بن جائے گا، اور بالآخر وہ مغلوب ہو جائیں گے، اور جو کافر ہیں وہ گھیر گھار کر جہنم کی طرف جمع کیے جائیں گے)

پھر اُنھوں نے عرب کے چرب زبانوں کی ایک جماعت کو جس میں عمرو بن عاص بھی

---

[١] سورۃ الانفال، آیت ۳۶

تھا، عرب کے قبائل کنانہ، تہامہ اور سقیف وغیرہ کی طرف بھیجا تاکہ اُن کو بھی جنگ کے لیے مدد واعانت پر آمادہ کریں۔ چنانچہ وہ اس مہم میں خوب کامیاب رہے اور عرب قبائل سے کثیر مالی معاونت اور بڑی تعداد میں جنگجو حاصل کر لیے۔ غلاموں کی ایک بہت بڑی تعداد کو بھی اس جنگ میں اس وعدے پر شامل کیا گیا کہ فتح کے بعد اُنھیں آزاد کر دیا جائے گا۔ جبیر بن مطعم کا غلام وحشی بن حرب جس نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو شہید کیا، اُن ہی میں سے ایک تھا۔

عربوں میں اپنی عورتوں کو جنگ پر لے جانے کا رواج نہیں تھا مگر اس جنگ کے لیے ابوسفیان کی بیوی ہندہ دختر عتبہ بن ربیعہ مُصر تھی کہ لشکر کے ساتھ عورتیں بھی ہوں جو مقتولینِ بدر پر نوحہ کریں اور ایسے ترانے گائیں جن سے مسلمانوں کے خلاف جوشِ انتقام پیدا ہو اور لوگوں میں جنگ کرنے کا ولولہ اُبھرے نیز اُن کی موجودگی میں لوگ میدان جنگ سے فرار نہ ہوں۔ ہندہ کی تجویز کا خیر مقدم کیا گیا اور چند مَردوں نے اپنی عورتوں کو بھی ساتھ لے لیا جن میں سے خاص خاص مرد و زن کے نام مندرجہ ذیل ہیں:[1]

۱۔ ابوسفیان بن حرب امیرِ جماعت کے ساتھ اُس کی بیوی ہندہ بنت عتبہ بن ربیعہ

۲۔ عکرمہ بن ابوجہل بن ہشام بن مغیرہ کے ساتھ اُمّ حکیم بنت حارث بن ہشام بن مغیرہ

۳۔ عکرمہ بن ابوجہل کے چچا حارث بن ہشام بن مغیرہ کے ساتھ بنتِ ولید بن مغیرہ

۴۔ صفوان بن اُمیّہ بن خلف کے ساتھ برزہ یا برہ بنت مسعود بن عمرو بن عمیر ثقیفہ

۵۔ عمرو بن عاص بن وائل کے ساتھ عبداللہ بن عمرو بن عاص کی ماں ریطہ بنت منبہ بن حجاج

۶۔ طلحہ بن ابی طلحہ کے ساتھ سلافہ بنت سعد بن شہیہ

مندرجہ بالا سبھی جوڑے آپس میں میاں بیوی تھے جب کہ:

۷۔ ابوعزیز بن عمیر کے ساتھ اُس کی ماں خناس بنت مالک بن الفرب تھی۔

---

[1] علامہ علی نقی نقوی، تاریخ اسلام، ص ۲۲۵

ابوجعفر محمد بن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ھ)، تاریخ طبری، ج ۲ ص ۱۷۴

لشکرِ کفّار

اس جنگ کے لیے کافروں نے ایک بہت بڑا لشکر تیار کرلیا تھا جوابوسفیان کی سرداری میں مدینہ طیبہ کی طرف روانہ ہُوا۔ بروایتے، اُس کی تعداد تین ہزار(۳۰۰۰) سے چار ہزار (۴۰۰۰) تھی۔[۱] شیخ عبدالحق محدث دہلوی لکھتے ہیں کہ اس لشکر کی نفری تین ہزار(۳۰۰۰)تھی جن میں سات سو(۷۰۰) زِرّہ پوش تھے، دوسو(۲۰۰) گھوڑے، تین ہزار(۳۰۰۰) اُونٹ اور پندرہ سو(۱۵۰۰) عورتوں کے ہَو دَج (کجاوے) تھے جب کہ ''الرحیق المختوم'' میں ہے کہ لشکر میں پندرہ (۱۵) عورتیں تھیں۔[۲] (اگر عورتوں کی تعداد پندرہ ہو تو ہَو دَج بھی پندرہ ہی ہو سکتے ہیں نہ کہ پندرہ سو پس کتاب مدارج النبوّت میں کتابت کی غلطی کا گمان ہے۔ مؤلف)

لشکرِ کفّار نے مدینہ سے پانچ چھ میل پہلے ذوالحلیفہ کے مقام پر قیام کیا پھر پیش قدمی کی اور اُحد کے کنارے وادی بطن میں مدینہ طیبہ کے مقابل پڑاؤ ڈالا۔[۳] کہتے ہیں کہ قریش کی فوج مکّہ سے روانہ ہوئی تو کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد ابواء کے مقام پر پہنچی جہاں رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی والدہ محترمہ کی آخری آرام گاہ تھی۔ چند بدبختوں نے اصرار کیا کہ رسولِ خدا (صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم) کی والدہ ماجدہ کا جسد پاک قبر سے نکال لیا جائے۔ بروایتے یہ تجویز ابوسفیان کی بیوی ہندہ بنت عتبہ نے پیش کی۔[۴] تاہم اُن میں موجود کچھ لوگوں نے اس تجویز کی مذمت کی اور کہا کہ ایسا کرنے سے ممکن ہے کہ مستقبل میں یہ رواج بن جائے اور ہمارے دشمن ہمارے مُردوں کی قبریں اُکھاڑ کر اُن کی بے حرمتی کیا کریں۔[۵] چنانچہ اللہ نے اُنھیں اس گھناؤنے فعل کی جسارت سے باز رکھا۔

---

[۱] آیت اللہ جعفر سبحانی، دی میسیج (The Message)، ص ۳۴۲

[۲] عبدالحق محدث دہلوی، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۱۵۴۔ مولانا صفی الرحمن مبارکپوری، الرحیق المختوم، ص ۳۳۹

[۳] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۱۵۴

[۴] مولانا صفی الرحمن مبارکپوری، الرحیق المختوم، ص ۳۴۱

[۵] آیت اللہ جعفر سبحانی، دی میسیج (The Message)، ص ۳۴۳

حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ اُس وقت مکّہ میں تھے۔ اُنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ایک خط کے ذریعے قریش کی لشکرکشی سے آگاہ کیا۔ وہ خط بنی غفار کا ایک شخص لے کر آیا تھا جس میں قریش کے جنگی منصوبے کی تفصیل درج تھی۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت حباب رضی اللہ عنہ کو تصدیق کے لیے روانہ کیا تو اُنھوں نے آکر بتایا کہ قریش کی فوج کا ہراول دستہ مدینہ کے قریب پہنچ چکا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت انس رضی اللہ عنہ اور مونس رضی اللہ عنہ کو بھی لشکرِ قریش کی خبر لانے کو روانہ کیا اور اُنھوں نے آکر بتایا کہ قریش مدینہ کے قریب پہنچ چکے ہیں اور اُنھوں نے اپنے مویشی مدینہ کے کھیتوں میں چرنے کے لیے چھوڑ دیے ہیں۔[1]

قریش کا لشکر مسلمانوں سے پہلے ہی میدان جنگ میں پہنچ گیا تھا۔ اُس نے اُحد کی وادی میں چھاؤنی ڈالی اور فوجوں کو مدینہ منوّرہ کے شمال میں بیئر رومہ اور غابہ کے درمیان پھیلا دیا۔ جغرافیائی اور جنگی لحاظ سے وہ بہترین جگہ تھی، وہاں پانی بھی تھا اور جانورں کے لیے چارے کی سہولت بھی تھی۔ عقب اور دائیں بائیں سے اچانک حملے کا امکان بھی بہت کم تھا۔

ابوسفیان کو اپنی مرضی کا محاذ اور مقامِ جنگ منتخب کرنے کا موقع مل گیا تھا چنانچہ اُس نے میدانِ جنگ کے جغرافیائی وعسکری حالات کا جائزہ لیا اور اُن کے مطابق اپنی افواج کی صف آرائی کی۔ جنگ کے واقعات وکوائف کے مطالعہ سے اِس بات کا سراغ ملتا ہے کہ ابوسفیان کی جنگی چال یہ تھی کہ مسلمانوں کو جُل دے کر اُن کے عقب میں کوہِ عینین کے دَرّے پر قبضہ کر لیا جائے اور اس طرح پیچھے سے بھی حملہ کر کے اُنھیں گھیرے میں لے کر اُن کا قلع قمع کر دیا جائے اور پھر مدینہ کو تاخت وتاراج کر دیا جائے۔ چنانچہ اُس نے میمنہ پر خالد بن ولید کو، میسرہ پر عکرمہ بن ابوجہل کو اور قلب پر صفوان بن اُمیّہ کو سالار مقرر کیا اور تیر اندازوں کے دستے عبداللہ کی کمان میں دیے۔ دَرّے پر قبضہ کر کے لشکرِ اسلام پر عقب سے حملہ کرنے کی ذمہ داری

---

[1] آیت اللہ جعفر سبحانی، دی میسیج (The Message)، ص ۳۴۳

بھی خالد بن ولید کی تھی اور اُس کو بروقت کمک پہنچانے کا کام عکرمہ بن ابو جہل کے سپرد کیا گیا تھا۔ علاوہ ازیں لشکرِ کفّار کیونکہ مسلمانوں سے پہلے میدان میں پڑاؤ ڈال چکا تھا اس لیے ابوسفیان نے ایک اور مکّاری یہ کی کہ مسلمانوں کی متوقع صف بندی کے مقام کے آس پاس جابجا گڑھے کھدوا کر اُن کو کھجور کے پتوں اور چھال وغیرہ سے ڈھانپ دیا تاکہ جب مسلمانوں پر عقب سے حملہ کیا جائے اور وہ سراسیمہ ہوکر یا دفاع کے لیے اِدھر اُدھر بھاگیں تو ان گڑھوں میں گر جائیں۔ اُن گڑھوں کا دوسرا مقصد اُن سے کمین گاہوں کا کام لینا تھا اور اس کام کے لیے اُس نے اُن میں اپنے فوجی چھپا دیے تھے چنانچہ ایسے ہی ایک گڑھے سے نکل کر شداد بن اسود لیثی نے حضرت حنظلہؓ پر حملہ کر کے اُنھیں شہید کیا جب وہ ابوسفیان پر حملہ آور ہورہے تھے۔ [۱]

مسلمانوں میں اختلاف رائے

دوسری طرف مسلمانوں کے درمیان اس جنگ کے سلسلے میں اختلافِ رائے پیدا ہوگیا تھا۔ وہ انصار جو غزوۂ بدر میں شامل نہیں ہوسکے تھے، خواہش رکھتے تھے کہ اس معرکے میں شامل ہوکر وہ بھی فریضۂ جہاد کی ادائیگی سے سرخرو ہوں اور کئی لوگوں کی طرح اُن کی بھی تمنا تھی کہ مدینہ سے باہر نکل کر معرکہ آراہُو اجائے۔ کچھ لوگوں کی رائے تھی کہ باہر نکل کر جنگ کرنے کی بجائے مدینہ طیبہ میں محصور ہوکر دفاع کرنا چاہیے۔ جہاد کے لیے بیقرار اہلِ ایمان کی بیتابی اور جوش وخروش کا یہ عالم تھا کہ وہ جنگ کے حق میں بڑھ چڑھ کر دلائل دینے لگے حتیٰ کہ اُن کا اصرار اس قدر بڑھ گیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو بحیثیت رسولِ خدا اور سپہ سالار خود فیصلہ کرنا پڑا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے جنگ کرنے پر رضامندی ظاہر فرمادی۔ وہ روزِ جمعہ تھا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے جمعہ کا خطبہ دیا، جہاد اور شہادت کے فضائل بیان فرمائے، صبر واستقامت کی تلقین و وضاحت فرمائی

---

[۱] ابن خلدون (متوفی ۱۴۰۶ء)، تاریخ ابن خلدون، ج ۱ ص ۱۰۲
ڈاکٹر نصیر احمد ناصر، کتاب: پیغمبر اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم، ص ۵۰۸

اور نماز سے فارغ ہو کر اپنے گھر تشریف لے گئے۔ اس دوران میں چند اصحاب نے خطاب کیا اور جنگ کے لیے مُصر لوگوں کو ہٹ دھرمی چھوڑنے کی نصیحت کی جو کافی حد تک مؤثر ثابت ہوئی۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم جب مسلح ہو کر گھر سے باہر تشریف لائے تو جنگ پر آمادہ کئی لوگوں نے اپنی رائے سے دستبرداری اور ندامت کا اظہار کر دیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا، ''اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے شایانِ شان نہیں کہ ہتھیار پہن کر اُتار دے جب تک کہ اللہ تعالیٰ اُس کے اور دشمن کے درمیان فیصلہ نہ کر دے۔'' [1] آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا یہ فرمان وحیِ الٰہی کے عین مطابق تھا، ارشادِ پروردگار ہے:

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۠ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۚ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ ﴿١٥٩﴾

(اے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم)! یہ اللہ کی بہت بڑی مہربانی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اِن لوگوں کے لیے اتنے نرم مزاج ہیں اور اگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم درشت مزاج اور سنگدل ہوتے تو یہ سب آپ کے گرد و پیش سے منتشر ہو جاتے، انھیں معاف کر دیا کریں، اِن کے لیے دُعائے مغفرت کیا کریں اور معاملات میں اِن سے مشورہ بھی لے لیا کریں۔ مگر جب کسی کام کے کرنے کا حتمی ارادہ ہو جائے تو پھر خدا پر بھروسہ کریں بے شک اللہ بھروسہ کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔)

لشکرِ اسلام

اسلامی لشکر کی تعداد نو سو (۹۰۰) اور بروایتے ایک ہزار (۱۰۰۰) تھی جن میں سو زِرّہ پوش تھے۔ [2] اس لشکر میں سے تین سو (۳۰۰) ساتھیوں کو لے کر عبداللہ بن اُبی الگ ہو گیا تھا اس طرح لشکرِ اسلام کی تعداد صرف سات سو (۷۰۰) رہ گئی تھی۔ لشکر میں صرف دو (۲)

---

[1] سورۃ آلِ عمران: آیت ۱۵۹

[2] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۱۵۷

گھوڑے تھے۔[1] تین پرچم مرتب کیے گئے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے مہاجرین کا علم حضرت علی مرتضیٰ علیہ السلام کو، قبیلہ اوس کا پرچم حضرت سعد بن عبادہؓ کو اور قبیلہ خزرج کا جھنڈا حضرت خباب بن منذرؓ کو دیا۔[2]

روانگی

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے حضرت ابن اُمّ مکتومؓ کو مدینہ کا حاکم مقرر فرمایا اور ۶ شوال ۳ھ بمطابق ۲۲ مارچ ۶۲۵ء کو نمازِ جمعہ کے بعد مجاہدینِ اسلام کے ساتھ اُحد کی طرف کُوچ فرمایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اُس وقت گھوڑے پر سوار تھے، کندھے پر کمان اور ہاتھ میں نیزہ تھا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے آگے پیچھے اور دائیں بائیں تھے۔

منافقین کی غداری

جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم مقامِ شوط پر پہنچے تو عبداللہ بن اُبی اپنے تین سو سواروں کے ساتھ یہ کہہ کر الگ ہوگیا کہ ہماری رائے سے اتفاق نہیں کیا گیا لہٰذا ہم اپنی جانوں کو ہلاکت میں کیوں ڈالیں؟ (اُس نے مشورہ دیا تھا کہ جنگ کرنے کی بجائے مدینہ کے اندر محصور ہو کر دفاع کیا جائے۔) اُس کی منافقت کا اثر اور لوگوں پر بھی ہُوا اور وہ بھی واپسی کی باتیں کرنے لگے۔ جنگی وسائل یعنی نفری، اسلحہ، سواری اور رسد وغیرہ کی قلّت تو پہلے ہی سے تھی اس پر منافقین کی یہ غداری، صورت حال خاصی تشویشناک تھی لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو کوئی خوف اور غم نہیں تھا۔ جیسا کہ اللہ سبحانہٗ تعالیٰ نے فرمایا:[3]

اَلَآ اِنَّ اَوْلِيَآءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿٦٢﴾

(آگاہ رہو کہ جو اللہ کے دوست ہیں اُن کے لیے نہ کوئی خوف ہے اور نہ ہی غم۔)

---

[1] ابوجعفر محمد بن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ھ، تاریخ طبری)، ج ۳ ص ۱۲

[2] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۱۵۷

[3] سورۃ یونس، آیت ۶۲

پس آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا عزم پختہ، ہمت جوان اور حوصلہ بلند تھا۔ اُس وقت شام ہونے والی تھی، آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے رات شیخین میں گزارنے کا فیصلہ کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم دشمن سے غافل نہیں رہتے تھے اور حفاظتی اقدامات کو خاص اہمیت دیا کرتے تھے اس لیے پچاس مجاہدین کے ایک دستے کو پہرے پر مامور فرمایا۔ رات کے پچھلے پہر آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے کُوچ کا حکم دیا، القنطرہ میں نمازِ فجر ادا فرمائی اور دن چڑھے یعنی بروز ہفتہ وادئ اُحد میں وارد ہوئے۔

عینین کا دَرّہ

اگرچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم لشکرِ کفّار کے بعد میدان جنگ میں پہنچے تھے لیکن آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی نگاہ ایک ذہین و مثالی ماہرِ حربیات اور سپہ سالار کی طرح فوراً عینین کے دَرّے پر پڑی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے صف بندی کے وقت جغرافیائی ماحول سے بھرپور استفادہ کرتے ہوئے لشکر کے عقب اور دائیں بائیں اُحد کی پہاڑیوں کو رکھا اور فوج کو تین اطراف سے محفوظ کر لیا۔ عینین کے اُس دَرّے پر جس سے عقبی جانب سے حملہ ہو سکتا تھا، حضرت عبداللہ بن جُبیر رضی اللہ عنہ کی کمان میں پچاس تیز اندازوں کا ایک دستہ مقرر کر دیا اور اُنھیں واضح اور قطعی ہدایات دیں کہ لڑائی کے دوران میں یا بعد میں نیز فتح ہو یا شکست کسی حال میں بھی دَرّے کو خالی چھوڑ کر نہ جانا۔ بروایتے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ اگر لشکرِ کفّار اس طرف سے حملہ آور ہو تو تیر اندازی کے ذریعے اُسے ناکام کر دینا اور کسی صورت میں بھی اس جگہ سے مت ہلنا چاہے مسلمان غالب ہوں یا مغلوب۔[1] آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے مثال دیتے ہوئے فرمایا کہ اگر تم دیکھو کہ ہمیں پرندے اُٹھا کر لے جا رہے ہیں تب بھی اپنی جگہ سے جنبش نہ کرنا جب تک کہ میں کسی کو تمھارے بلانے کے لیے نہ بھیجوں اور اگر دیکھو کہ ہم نے کفّار کو شکست دے دی ہے تب بھی تم اپنی جگہ مت چھوڑنا اور اگر وہ ہم سب کو قتل

کردیں تو بھی یہاں سے جنبش نہ کرنا۔[1]

یہ مقام اس اعتبار سے بھی اہم تھا کہ اگر قریش کے دباؤ کی صورت میں مجاہدین پیچھے ہٹنے پر مجبور ہو جائیں تو تیر انداز اُن کی بھرپور مدد کر سکیں۔ صف بندی میں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یدطولیٰ حاصل تھا۔ مجاہدین اور قریش کی عددی نسبت ایک اور چار کی تھی لیکن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجاہدین کی صف بندی اس طریق سے کی کہ قریش اپنی ساری فوج بیک وقت اُن کے مقابل نہیں لا سکتے تھے اور نہ اُنھیں گھیرے میں لے سکتے تھے۔

آغازِ جنگ اور علی ابن ابی طالب علیہ السلام کی شجاعت

آغازِ جنگ قریش کی طرف سے ہُوا۔ سب سے پہلے اُن کی عورتیں، سپہ سالار ابوسفیان کی بیوی ہندہ کی قیادت میں دَف بجاتی اور رَجَزیہ اشعار الاپتی ہوئی میدان میں آئیں اور گا گا کر اپنے سورماؤں کا حوصلہ بڑھاتی رہیں۔ اُس موقع پر ہندہ کے گائے ہوئے اشعار تاریخ میں بہت مشہور ہیں، وہ کہہ رہی تھی:[2]

نَحْنُ بَنَاتُ طَارِقٍ نَمْشِی عَلَی النَّمَارِقِ

اِنْ تُقْبِلُوا نُعَانِقِ اَوْ تُدْبِرُوا نُفَارِقِ

فِرَاقَ غَیْرِ وَامِقِ

(ہم ستاروں کی بیٹیاں ہیں جو ناز و نعم میں پلی ہیں، آگے قدم بڑھاؤ گے تو ہم تمھارے گلے ملیں گی اور اگر پیٹھ دکھاؤ گے تو تم سے منہ موڑ لیں گی اور ایسے جدا ہو جائیں گی جیسے کبھی محبت تھی ہی نہیں)

پھر قریش کے حلیف قبیلہ ہوازن کے دستے نے طاقت کے نشے میں پیش قدمی کی لیکن

---

[1] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۱۵۹

[2] ابوجعفر محمد بن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ھ)، تاریخ طبری، ج ۲ حصہ اوّل ص ۱۷۹

حافظ ابن عبدالبر قرطبی (متوفی ۴۶۳ ہجری)، الاستیعاب، ج ۲ ص ۲۳۰

قوتِ ایمانی سے سرشار مسلمان تیراندازوں نے اُن کا نشہ ہرن کر دیا۔[۱] ایک روایت کے مطابق کفّار کی طرف سے سب سے پہلے ابو عامر راہب نے، جسے "ابو عامر فاسق" بھی کہا جاتا تھا لشکرِ اسلام کی جانب تیر پھینکا تھا۔ وہ اپنی قوم کے پچاس آدمیوں کو ہمراہ لے کر آیا تھا۔ اُنھوں نے مل کر تیر چلائے لیکن مسلمانوں کی جوابی کاروائی سے ابو عامر بھاگ کھڑا ہُوا۔[۲] پھر کفّار میں سے بنوعبدالدار پرچم لے کر آگے بڑھے۔ اُن کے علمبردار طلحہ بن عثمان ابوطلحہ نے مردِ مقابل کے لیے نعرہ بلند کیا تو حضرت علی علیہ السلام اُس کے مقابلے کو نکلے اور شیر کی طرح اُس پر جھپٹے۔ علی علیہ السلام نے چشم زدن میں تلوار کے ایک ہی وار سے اُس کے سر کے دو ٹکڑے کر دیے۔[۳]

مدارج النبوّت، تاریخِ طبری اور تاریخِ ابن کثیر میں حضرت علی علیہ السلام کی شجاعت کے ساتھ ساتھ بے مثال شرم وحیا اور کمال ظرف کا ذِکر ذرا تفصیل سے ہے۔ طبری کی روایت ہے کہ طلحہ بن عثمان جو کفّارِ قریش کا علمدار تھا میدان میں نکلا اور پکارا، "اے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھیو! تمھارا دعویٰ ہے کہ اللہ ہم کو تمھاری تلواروں سے جہنم واصل کرے گا اور تمھیں ہماری تلواروں کے ذریعے جنّت میں پہنچائے گا تو ہے کوئی تم میں ایسا جو اپنی تلوار سے مجھے جہنم رسید کرے یا میری تلوار سے جنّت میں جانا چاہے؟" اُس کی للکار سُن کر شیرِ خدا سیّدنا علی مرتضیٰ علیہ السلام میدان میں تشریف لائے اور فرمایا، "قسم ہے اُس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے میں تجھے اپنی تلوار سے واصلِ جہنم کروں گا۔" پھر علی علیہ السلام نے تلوار کے ایک ہی وار سے اُس کا پاؤں قطع کر دیا اور وہ اس طرح گرا کہ اُس کی شرمگاہ کھل گئی، وہ منت سماجت کرنے لگا تو علی علیہ السلام نے اُسے چھوڑ دیا۔[۴]

---

[۱] ڈاکٹر نصیر احمد ناصر، کتاب: پیغمبر اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ص ۵۱۰

[۲] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت ج ۲ ص ۱۵۹

[۳] ڈاکٹر نصیر احمد ناصر، کتاب: پیغمبر اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ص ۵۱۰

[۴] ابوجعفر محمد بن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ھ)، تاریخ طبری، ج ۲ حصّہ اوّل ص ۱۷۹

''مدارجُ النبوّت''میں ہے کہ جناب علی علیہ السلام نے طلحہ بن ابی طلحہ کے سر پر ایسی ضرب لگائی جس سے وہ شدید زخمی ہوگیا۔ وہ ابھی ہلاک نہیں ہُوا تھا مگر علی علیہ السلام واپس تشریف لائے اور اپنی صف میں شامل ہوگئے۔ صحابہؓ نے پوچھا کہ آپ نے طلحہ کا کام تمام کیوں نہ کردیا؟ فرمایا کہ جب وہ گرا تو اُس کا ستر کھل گیا تھا(یعنی وہ برہنہ ہوگیا تھا)اور اُس نے مجھے قسم دی کہ میں اُسے چھوڑ دوں، اُس حالت میں اُس پر دوبارہ حملہ آور ہونے میں مجھے حیا آئی...الخ (پس میں نے اُسے اُس کے حال پر چھوڑ دیا)۔[1] تاریخ ابن کثیر(البدایہ والنہایہ) میں اُس کا نام ابوسعد بن ابی طلحہ ہے اور لکھا ہے کہ علی علیہ السلام نے اُس کے شانے پر ایک کاری ضرب لگائی لیکن پھر پلٹ کر واپس چلے آئے۔ جب صحابہؓ نے پوچھا کہ وہ اُس کو قتل کیے بغیر کیوں پلٹ آئے تو فرمایا کہ وہ کم بخت زخم کھا کر میرے سامنے ننگا ہوگیا تھا لہٰذا اُس بے شرم پر دوبارہ تلوار اُٹھاتے ہوئے مجھے حیا آ گئی تھی۔ مندرجہ بالا واقعے کے ساتھ ہی لکھا ہے کہ اسی طرح جنگِ صفین میں جب حضرت علی (علیہ السلام) نے بسر بن ابی ارطات کو قتل کرنے کے لیے تلوار اُٹھائی تھی تو وہ اُن کے سامنے ننگا ہوکر کھڑا ہوگیا تھا اور حضرت علی (علیہ السلام) اُس بے شرم کو بھی قتل کیے بغیر پلٹ آئے تھے اور جنگِ صفین میں ہی عمرو بن عاص بھی حضرت علی (علیہ السلام) کی ضربِ شدید سے بچنے کے لیے تہبند کھول کر اُن کے سامنے ننگا ہوگیا تھا تو آپ علیہ السلام نے اُسے بھی زندہ چھوڑ دیا تھا۔[2]

اُحد کے اس واقعے میں مختلف نام کتابوں میں ملتے ہیں مثلاً طلحہ بن عثمان، طلحہ بن ابوطلحہ اور ابوسعد بن ابی طلحہ وغیرہ۔ الغرض، طلحہ کے بعد اُس کے بھائی عثمان بن ابی طلحہ نے لپک کر جھنڈا اُٹھایا لیکن اُسے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے ہلاک کردیا۔ اب کفّار کا علم ابوسعید بن ابی طلحہ کے ہاتھ میں آیا لیکن اُسے سعد بن ابی وقاص نے موت کے گھاٹ اُتار دیا۔[3] بروایتے، طلحہ کے بعد

---

[1] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۱۶۰

ابوجعفر محمد بن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ھ)، تاریخ طبری، ج ۲ حصّہ اوّل ص ۱۷۸

[2] ابن کثیر، تاریخ ابن کثیر، البدایہ والنہایہ، جلد چہارم ص ۲۴

[3] ڈاکٹر نصیر احمد ناصر، کتاب: پیغمبر اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم، ص ۵۱۰

بنی عبدالدار کا دوسرا، تیسرا اور چوتھا شخص یکے بعد دیگرے میدان میں آئے اور سبھی امام علی علیہ السلام کے ہاتھوں قتل ہوئے۔ [1]

علامہ مجلسی لکھتے ہیں کہ ابوطلحہ کے بعد قریش کا علم اُس کے بیٹے ابوسعید نے اُٹھایا۔ حضرت علی علیہ السلام نے اُس کو بھی قتل کر دیا اور علم گر پڑا۔ پھر ابوطلحہ کے دوسرے بیٹے عثمان نے پرچم اُٹھایا تو امیرالمومنین علیہ السلام نے اُسے بھی واصل جہنم کر دیا۔ جھنڈا زمین پر گرا تو ابوطلحہ کے تیسرے بیٹے منافع نے اُسے اُٹھایا، وہ بھی حضرت علی علیہ السلام کی تلوار سے علم سمیت زمین بوس ہُوا۔ تب ابوطلحہ کے چوتھے لڑکے حارث نے علم اُٹھایا اور شاہِ ولایت حضرت علی علیہ السلام کی ضربت سے وہ بھی خاک مذلّت پر گرا۔ اب کی بار عزیز بن عثمان نے جھنڈا اُٹھایا اور تیغِ اسداللہ سے وہ بھی جہنم میں پہنچا۔ پھر عبداللہ بن جمیلہ نے پرچم کو بلند کیا اور وہ بھی قتل ہو گیا تو علم کو عبدالدار کے غلام صواب نے اُٹھایا، حضرت علی علیہ السلام نے اُس کو ایک ضربِ شمشیر لگائی اور اُس کا داہنا ہاتھ قطع ہو گیا، اُس نے جھنڈا بائیں ہاتھ میں لے لیا، آپ نے وہ ہاتھ بھی کاٹ دیا لیکن اُس نے علم کو اپنے کٹے ہوئے ہاتھوں سے سنبھالا اور پکارا کہ اے بنی عبدالدار! کیا جو شرطِ نصرت تھی میں نہیں بجا لایا؟ حضرت علی علیہ السلام نے اُس کے سر پر تلوار کا ایک ہاتھ مارا اور اُس کو جہنم واصل کر دیا۔ یہ دیکھ کر کفّار کے دِلوں پر بے حد خوف و ہراس چھا گیا۔ [2] عین اُسی وقت مسلمانوں نے شدید حملہ کیا اور دشمن کی صفیں اُلٹا کر رکھ دیں۔

ابوسفیان نے اُس موقع پر ایک چال چلی جو بری طرح ناکام ہو گئی۔ اُس نے چِلّا کر انصار سے کہا کہ اے اوس و خزرج! ہماری تم سے کوئی لڑائی نہیں، تم واپس چلے جاؤ ہم تم سے جنگ نہیں کریں گے، تم ہمیں اور ہمارے بھائیوں (مہاجرین) کو آپس میں نمٹنے دو۔ مگر انصار نے اُس کی پیش کش نفرت و حقارت سے ٹھکرا دی۔ [3] مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنے کی ایک اور

---

[1] سید محمد صحفی، حکایاتُ القرآن، طبع جامعہ تعلیمات اسلامی پاکستان

[2] علامہ باقر مجلسی (متوفی ۱۶۹۸ء)، حیاتُ القلوب، ج ۲ ص ۵۶۲

[3] علامہ علی نقی نقوی، تاریخ اسلام ص ۲۳۴

اُمید ابھی ابوسفیان کے دل میں باقی تھی اور وہ تھی راہب ابوعامر کی کوشش۔ ابوعامر مدینہ میں رہنے والا ایک تارِکُ الدُّنیا قسم کا آدمی تھا جس کے گرد کمزور عقیدہ اور توہم پرست لوگ منڈلاتے رہتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی عظمت و بزرگی دیکھ کر وہ حسد میں مبتلا ہو گیا تھا جس کی بنا پر مسلمانوں میں فاسق کے نام سے پکارا جانے لگا۔ اُس نے قریش سے کہا تھا کہ جب میں میدان میں جا کر انصار کو پکاروں گا تو وہ پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کا ساتھ چھوڑ کر میری جانب چلے آئیں گے۔ چنانچہ وہ بڑی نخوت سے میدان میں آیا اور قبیلہ اوس کے لوگوں کو اپنی طرف بلایا مگر مسلمانوں نے اُسے فاسق کہہ کر اُس پر لعنت بھیجی تو وہ تلملا اُٹھا اور مرنے مارنے پر تُل گیا۔ اُس نے خوب جنگ کی مگر بالآخر مسلمانوں کی تلواروں کا لقمہ بن گیا۔[۱]

ابتدائی فتح

کفّار کے اکثر لوگ بھاگ کھڑے ہوئے اور اُن کے لشکر کا شیرازہ بکھر گیا جب کہ مجاہدینِ اسلام جن میں سب سے ممتاز حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام تھے اور اُن کے ساتھ حضرت حمزہ بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ، حضرت مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ اور حضرت زبیر بن عوام رضی اللہ عنہ تھے، پورے جوش وخروش سے لڑ رہے تھے۔[۲] وہ اپنے دِین کا کما حقہٗ دفاع کر رہے تھے یہاں تک کہ اُنھوں نے قریش کے بڑے بُت ''ہبل'' کو بھی، جسے وہ اپنے ساتھ لائے تھے، سر کے بل گرا دیا اور دشمن کی کمر توڑ ڈالی۔ یوں رفتہ رفتہ میدانِ جنگ کافروں سے خالی ہو گیا اور اکثر مسلمان مالِ غنیمت سمیٹنے میں لگ گئے۔

اربابِ سیر لکھتے ہیں کہ کفّار کے جھنڈے کو یکے بعد دیگرے دس اشخاص نے اُٹھایا تھا یہاں تک کہ ایک عورت جس کا نام عمرہ بنت علقمہ حارثیہ تھا علمبردارِ قریش بنی جب کہ ایک عورت سلافہ بنت سعد زنِ طلحہ بن ابی طلحہ کا نام بھی علمبردار کی حیثیت سے مرقوم ہے۔[۳] پھر گھمسان کا

---

[۱] علامہ علی نقی نقوی، تاریخ اسلام، ص ۲۳۵

[۲] علامہ علی نقی نقوی، تاریخ اسلام ص ۲۳۲، ابوجعفر محمد بن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ھ)، تاریخ طبری، ج ۳ ص ۱۵

[۳] عبدالحق محدث دہلوی، مدارج النبوت ج ۲ ص ۱۸۵

رَن پڑا اور مسلمانوں نے مشرکوں پر پے در پے حملے کر کے اُن کی صفوں کو درہم برہم کر دیا اور میدانِ جنگ سے بھگا دیا۔ کفّار کے قتلِ عام پر اُن کی گانے بجانے والی عورتوں نے دَف پھینک دیے اور رونے پیٹنے اور واویلا کرنے لگیں۔ خالد بن ولید نے مشرکوں کی ایک ٹولی کے ساتھ پہاڑی دَرّے میں داخل ہونے کی کوشش کی تو وہاں متعین تیر اندازوں کے دستے نے اُس ٹولی کو تیروں کی بوچھاڑ سے پسپا کر دیا۔ خالد نے کئی حملے کیے لیکن کوئی بھی کارگر نہ ہُوا۔ آخر کار مسلمان غالب آ گئے اور کافروں کو ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا۔[۱]

اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور کے سابق وائس چانسلر ڈاکٹر نصیر احمد ناصر اپنی تالیف ''پیغمبر اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم'' میں لکھتے ہیں کہ (قریش کے پرچم بردار بنو عبدالدار کی ہلاکت کے بعد) قریش کے پرچم کے گرد گھمسان کا رَن پڑا، فریقین بے جگری سے لڑے۔ پرچم بلند رکھنے کی کوشش میں خاندانِ عبدالدار کے نو افراد لقمۂ اجل بن گئے تھے۔ اس معرکے میں حضرت ابو دجانہ (رضی اللہ عنہ)، حضرت حمزہ (رضی اللہ عنہ) اور حضرت علی علیہ السلام نے خاص طور پر بہادری کے وہ جوہر دکھائے کہ دیکھنے والے دنگ رہ گئے۔[۲]

مؤرّخ مولانا شبلی نعمانی کے الفاظ ہیں، ''علمبرداروں کے قتل اور حضرت علی (علیہ السلام) اور حضرت ابو دجانہ انصاری (رضی اللہ عنہ) کے بے پناہ حملوں سے فوج کے پاؤں اُکھڑ گئے، پری وش نازنینیں جو اپنے سُریلے رَجزوں سے سپاہیوں کے دِل اُبھار رہی تھیں، وہ بھی بدحواسی کے ساتھ ہٹیں اور مطلع صاف ہو گیا۔[۳]

حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی شہادت

حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ، ارطاۃ بن عبد شرجیل کو قتل کر کے سباع بن عبدالعزیٰ کی طرف بڑھ رہے تھے کہ گھات لگائے بیٹھے وحشی بن حرب نے اُنھیں دیکھ لیا تھا۔ وہ حبشیوں کا خاص ہتھیار ''حربہ''

---

[۱] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۱۶۰

[۲] ڈاکٹر نصیر احمد ناصر، کتاب: پیغمبر اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم، ص ۵۱۰

[۳] علامہ علی نقی نقوی، تاریخ اسلام، ص ۲۳۵۔ مولانا شبلی نعمانی (متوفی ۱۹۱۴ء)، سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم، ص ۲۷۶

چلانے میں بہت مہارت رکھتا تھا۔ موقع ملتے ہی اُس نے حربہ مار کر حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا (حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی شہادت اور اس کے پسِ پردہ سازش کا تفصیلی ذِکر آئندہ صفحات پر ملاحظہ فرمائیں)۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی شہادت کے باوجود مجاہدین کا دباؤ بڑھتا جا رہا تھا حتیٰ کہ کفّار کے پاؤں اُکھڑ گئے اور وہ میدانِ جنگ سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ (حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی شہادت کے وقت سے متعلق متضاد روایات ہیں، بعض کے مطابق یہ جنگ کے دوسرے حصّے میں شہید ہوئے)۔

قریش کی پسپائی کو عصرِ حاضر کے کچھ مؤلفین نے ابوسفیان کی چال قرار دیا ہے حال آنکہ ماضی کے مشہور و معروف مؤرّخین کے مطابق وہ شکست کھا کر بھاگے تھے، مثلاً ابوجعفر محمد بن جریر طبری لکھتے ہیں کہ ابودجانہ (رضی اللہ عنہ)، حمزہ بن عبدالمطلب (رضی اللہ عنہ) اور علی بن ابی طالب (علیہ السلام) نے کچھ اور مسلمانوں کے ساتھ دشمنوں کا صفایا کر دیا، اللہ نے اپنی مدد اتاری اور اپنا وعدہ اُن سے پورا کیا اور اُنھوں نے مخالف فوج کو تلواروں سے اتنا مارا کہ اُنھیں ہٹا دیا اور شکست دے دی جس میں کسی شک وشبے کی گنجائش نہ تھی۔"[1] اور ماضی قریب کے مشہور مؤرّخ مولانا شبلی نعمانی کے الفاظ ہیں، "علمبرداروں کے قتل اور حضرت علی (علیہ السلام) اور ابودجانہ انصاری (رضی اللہ عنہ) کے بے پناہ حملوں سے فوج کے پاؤں اُکھڑ گئے، پری وش نازنینیں جو اپنے سُریلے رَجزوں سے سپاہیوں کے دِل اُبھار رہی تھیں، وہ بھی بدحواسی کے ساتھ ہٹیں اور مطلع صاف ہوگیا۔"[2] علامہ علی نقی نقن لکھتے ہیں، "زبیر سے روایت ہے کہ میں ہند (ہند اور ہندہ، یہ نام دونوں طرح سے تاریخ میں آیا ہے) بنت عتبہ کے ساتھ آئی عورتوں کو دیکھ رہا تھا، (شکست کے بعد) وہ پائنچے اُٹھائے بھاگی جا رہی تھیں اور اُن کے گرفتار کیے جانے میں کوئی دشواری نہیں تھی۔"[3] شیخ عبدالحق دہلوی لکھتے ہیں کہ وہ مغنیات جو گا رہی تھیں، (شکست کے بعد) بجائے گانے کے رونے پیٹنے، چیخنے

---

[1] ابوجعفر محمد بن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ھ)، تاریخ طبری، ج ۳ ص ۱۶

[2] مولانا شبلی نعمانی (متوفی ۱۹۱۴ء)، سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ص ۲۷۶

[3] علامہ علی نقی نقوی، تاریخ اسلام، ص ۲۳۵

چلانے اور واویلا کرنے لگیں۔ اُنھوں نے دَف ہاتھوں سے پھینک دیے اور اپنے دامنوں کو اُٹھالیا یہاں تک کہ اُن کی پنڈلیاں اور اُن کے پازیب کھل گئے (نظر آنے لگے) اور وہ پہاڑ کی طرف بھاگنے لگیں۔ [1]

مالِ غنیمت کا لالچ اور درّہ عینین والوں کی غلطی

جنگ اپنے انجام کو پہنچ گئی تھی، مشرکین پسپا ہو چکے تھے لیکن مسلمانوں کی اکثریت اُن کا پیچھا کر کے اُن پر کاری ضرب لگانے کی بجائے مالِ غنیمت کے دام میں پھنس گئی۔ لشکرِ اسلام مالِ غنیمت لُوٹنے میں مصروف ہُوا تو دَرّے پر متعین تیر اندازوں کا وہ دستہ بھی جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی طرف سے واضح طور پر ہدایات دی گئی تھیں کہ چاہے فتح ہو یا شکست تمھیں اپنی جگہ سے نہیں ہلنا، مالِ غنیمت کے لالچ میں آکر چل پڑا۔ اُن کے کمانڈر حضرت عبداللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ نے اُنھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ہدایت یاد دلائی اور روکنے کی بہت کوشش کی مگر اُنھوں نے ایک نہ سُنی اور اُن میں سے چالیس لوگ دَرّے کو خالی چھوڑ کر مالِ غنیمت لُوٹنے چلے گئے۔ عبداللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ اپنے دس ساتھیوں کے ساتھ ثابت قدم رہے اور اپنی جگہ سے نہیں ہلے۔ خالد بن ولید نے دَرّے کے سپاہیوں کو منتشر ہوتے ہوئے دیکھ لیا تھا، وہ اِسی تاک میں تھا، اُس نے عکرمہ بن ابوجہل کو ساتھ لیا اور ایک جماعت کے ساتھ عبداللہ بن جبیر رضی اللہ عنہ پر حملہ کر دیا۔ اُنھوں نے اپنے باقی ماندہ چند ساتھیوں کے ساتھ مقابلہ کیا لیکن زیادہ دیر تک حملہ آوروں کو روک نہ سکے اور بالآخر ساتھیوں سمیت شہید ہو گئے۔ بھاگتا ہُوا ابوسفیان دَرّہ خالی دیکھ کر اور مالِ غنیمت لوٹنے میں مصروف مسلمانوں کو غافل پا کر پلٹ آیا اور پوری قوّت کے ساتھ ہلّہ بول دیا۔ یہ بدقسمتی اور حرماں نصیبی محض رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی نافرمانی کی وجہ سے تھی جو درّے پر متعین تیر اندازوں سے سرزد ہوئی تھی۔ ایک تو مسلمانوں نے مالِ غنیمت کے لالچ میں اپنی صفوں کو خود ہی درہم برہم کر دیا تھا دوسرے قریش کے غیر متوقع حملوں نے اُنھیں بدحواس کر دیا۔

---

[1] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۱۶۰

نتیجتاً اُن میں نظم وضبط نہ رہا اور اپنے سالارِ اعظم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے اُن کا رابطہ منقطع ہو گیا۔ فوج میں نظم وضبط اور رابطہ نہ رہے تو اُن میں عسکریت بھی نہیں رہتی اور عسکریت نہ رہے تو وہ ایک مسلح ہجوم کی طرح ہو جاتی ہے اور اُس میں قوتِ تسخیر باقی نہیں رہتی۔ تقریباً یہی حال اسلامی لشکر کا ہو گیا تھا۔ حملہ آوروں سے نمٹنے کی بجائے جس کا جدھر رُخ تھا اُدھر بھاگ کھڑا ہُوا۔ مدارج النبوّت میں ہے کہ مسلمانوں کا لشکر تتر بتر ہو گیا اور اضطراب اور بدحواسی کا یہ عالم تھا کہ اپنے علامتی نشان تک بھول گئے اور غلطی سے ایک دوسرے کو ہی قتل کرنے لگے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ اُس بدحواسی کے سبب اسید بن حضیر کو دو زخم اپنے ہی ساتھیوں کے ہاتھ سے آئے، ابو بردہ بھی اسی طرح زخمی ہوئے اور حذیفہ کے والد یمان بھی مسلمانوں ہی کے ہاتھوں مارے گئے۔[۱]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے کئی اصحاب آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے پاس سے بھاگ کر اِدھر اُدھر منتشر ہو گئے تھے، چند مدینہ میں چلے گئے اور کچھ ایک چٹان پر جا کر ٹھہر گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم باوازِ بلند اُن کو پکارتے تھے کہ اے بندگانِ خدا میری طرف آؤ، میری طرف۔[۲] اِسی سے متعلق قرآن مجید میں ارشاد ہے:[۳]

''اِذْ تُصْعِدُوْنَ وَلَا تَلْوٗنَ عَلٰٓی اَحَدٍ وَّالرَّسُوْلُ یَدْعُوْكُمْ فِیْٓ اُخْرٰىكُمْ....''

(اُس وقت کو یاد کرو) جب تم بے تحاشا بھاگے چلے جا رہے تھے اور کسی کی طرف مڑ کر بھی نہیں دیکھتے تھے۔ حال آنکہ پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) تمھارے پیچھے سے تمھیں پکار رہے تھے....الخ)

شیخ عبدالحق محدث دہلوی ''مدارج النبوّت'' میں لکھتے ہیں، ''اُس وقت صحابہ چار قسموں میں بٹ گئے تھے۔ صحابہؓ کی ایک قسم جنگ میں مصروف تھی اور وہ شہید ہو رہی تھی، دوسرا گروہ بھاگ رہا تھا اور پہاڑ کی گھاٹیوں اور کونوں میں چھپ رہا تھا اور بعض شہر میں جا کر ٹھہر گئے تھے....الخ، جو جنگ کی آگ ٹھنڈی ہونے کے بعد حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت میں حاضر

---

[۱] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۱۶۱

[۲] ابو جعفر محمد بن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ھ)، تاریخ طبری، ج ۳ ص ۲۶

[۳] سورۃ آل عمران، آیت ۱۵۳

ہوئے تھے۔ اور ایک جماعت مرکزِ صدق پر ثابت قدم رہی اور راہِ فرار سے محفوظ رہی۔"[۱]

راہِ فرار سے محفوظ رہنے والی اور مرکزِ صدق پر ثابت قدم رہنے والی جماعت وہی تھی جس کے سردار رسولِ معظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گرد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جاں نثار بھائی اور وزیر جناب علی علیہ السلام اور اُن کے چند ساتھی تھے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی لکھتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس کوئی نہیں رہ گیا تھا سوائے اُس جماعت کے جو چودہ آدمیوں پر مشتمل تھی اور جس میں سات مہاجرین اور سات انصار تھے۔ جب قریش میدانِ جنگ میں چھائے ہوئے تھے اور مسلمانوں کو تہہ تیغ کیے جا رہے تھے تو صرف یہی جماعت ثابت قدم اور پر عزم تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ قریش مسلمانوں کو شکست فاش دینے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ وہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گرد گھیراؤ کرنے لگے، اُن کے حملے کا ہدف آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذاتِ اقدس تھی اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آس پاس گھمسان کا رَن پڑا، مجاہدین پروانوں کی طرح آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نثار ہونے لگے اور ایک وقت ایسا بھی آیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قریب صرف حضرت علی علیہ السلام اور دو چار مجاہدین رہ گئے۔ دشمن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نرغے میں لے کر تیروں، تلواروں اور نیزوں سے مسلسل حملے کرتے رہے لیکن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنی جگہ سے ہٹا نہ سکے۔[۲]

کہتے ہیں کہ عتبہ بن ابی وقاص، ابی قمیّہ لیثی، ابی بن خلف، عبداللہ بن حمید اسری اور عبداللہ بن شہاب زہری نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو شہید کرنے کا حلف اُٹھایا تھا چنانچہ وہ کسی نہ کسی طرح آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قریب پہنچ گئے۔ عبداللہ بن شہاب زہری ملعون نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چہرۂ مبارک کو زخمی کیا، بدبخت عتبہ بن ابی وقاص نے سنگ باری کی اور ایک پتھر لگنے سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نچلا دانت شہید ہو گیا (اکثر علما اس سے متفق نہیں۔مؤلف) اور لب مبارک زخمی ہوئے۔ ابن قمیہ ملعون نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سر اقدس پر اس زور کا وار کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خود

---

[۱] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۱۶۱

[۲] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۱۶۶

کے دو حلقے چہرۂ مبارک میں دھنس گئے اور رُوئے اقدس خون سے گلنار ہو گیا پھر عبداللہ بن حمید اسری ملعون آگے بڑھا تو حضرت ابو دجانہ رضی اللہ عنہ نے اُسے فی النار کر ڈالا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تیروں کی بوچھاڑ اور تلواروں کے سائے میں تھے لیکن عزم و ہمت کا پیکر بنے ہوئے تھے۔ لڑائی کا سارا زور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آس پاس تھا۔ دشمن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو شہید کرنے کی سرتوڑ کوشش کر رہا تھا لیکن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جان نثار سینہ سپر تھے۔ حضرت ابو دجانہ رضی اللہ عنہ بھی اُن میں ایک تھے جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر چلائے جانے والے تیروں کو اپنے سینے کی ڈھال پر روک رہے تھے یہاں تک کہ زخموں کی تاب نہ لا کر شہید ہو گئے۔ قمیّہ لیثی، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر حملہ آور ہُوا تو حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ بیچ میں حائل ہو گئے اور سخت مقابلے کے بعد جامِ شہادت نوش فرمایا۔ ابن قمیّہ نے سمجھا کہ اُس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو شہید کیا ہے پس وہ جوشِ مسرت میں اپنے رفیقوں کے ساتھ پلٹا اور ابوسفیان کے پاس ایک اُونچی جگہ چڑھ کر چلّایا، ''سنو! محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) شہید ہو گئے۔''[۱]

یہ افواہ افواج میں پھیلی تو مسلمان مغموم اور مایوس ہو گئے جب کہ قریش نے اسے اپنی فتح سمجھتے ہوئے لڑائی سے ہاتھ روک لیا۔ یہ اُن کی ناقابلِ تلافی غلطی تھی کیونکہ مجاہدین نے مایوسی اور حزن و ملال کے اُس عالم میں بھی ہتھیار نہیں ڈالے تھے اور جب اُنھیں معلوم ہُوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خیریت سے ہیں تو اُن کے تنِ مُردہ میں جان پڑ گئی، شکستہ حوصلوں میں توانائی لوٹ آئی اور وہ سرفروشانہ انداز میں پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے تھے۔

شیعہ علما جسم کے کسی حصّے کی کمی یعنی معذوری کو خلافِ شانِ رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سمجھتے ہیں چنانچہ اُن کی روایات کے مطابق جنگ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کوئی دانت شکستہ نہیں ہُوا تھا بلکہ صرف چہرہ مبارک زخمی ہُوا تھا۔[۲]

---

[۱] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۱۷۳ تا ۱۷۴

[۲] علامہ علی نقی نقوی، تاریخ اسلام، ص ۲۵۱ بحوالہ اعلام الوریٰ

شیرِ خدا علی ابن ابی طالب علیہ السلام کی استقامت

روایت ہے کہ جب مسلمانوں میں بھگدڑ مچ گئی اور وہ میدان سے فرار ہو گئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دشمن کے نرغے میں گھر گئے۔ اُس وقت امام علی علیہ السلام ایک متحرک سِپَر کی مانند آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گرد گھومتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حفاظت کرنے لگے اور دشمنوں کو مار مار کر بھگانے لگے۔ علی علیہ السلام نے ایسی شمشیر زنی کی کہ تلوار تابِ جلالِ علی نہ لا سکی اور ٹوٹ گئی۔ بقولے، آپ نے جناب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا کہ بہادر اپنے ہتھیار سے جنگ کرتا ہے اور میری تلوار ٹوٹ گئی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی تلوار ''ذوالفقار'' عطا کی اور فرمایا کہ اِس سے جنگ کرو۔ شیرِ خدا نے ذوالفقار لے لی اور جو شخص بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف بڑھتا ہُوا پایا اُسے جہنم رسید کر دیا۔ پھر آپ کوہِ اُحد کی طرف بڑھے اور اُس پہاڑ کی جانب پشت کر لی تا کہ جنگ ایک ہی سمت سے ہو کیونکہ اُس وقت سوائے آپ کے کوئی بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس نہیں تھا۔ آپ تمام وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ڈھال بنے ہوئے شمشیر زن رہے یہاں تک کہ آپ کے بدن پر نوے زخم آئے اور بہت سا خون بہہ گیا لیکن پائے ثبات میں لغزش نہ آئی اور برابر جہاد اور دفاع میں مصروف رہے۔[1]

جبرائیل علیہ السلام نے آپ کی جاں نثاری دیکھی تو بآوازِ بلند کہا: ''لَا فَتٰی اِلَّا عَلِی لَا سَیْفَ اِلَّا ذُوالْفِقَار'' (علی علیہ السلام کے سوا کوئی جوانمرد نہیں اور ذوالفقار کے سوا کوئی تلوار نہیں)

ہر مسلک کے علما اور ہر عہد کے موّرخین نے اُحد کے دن امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کو رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا واحد یاور اور مدد گار قرار دیا ہے اور اُن کے جذبۂ ایمانی اور ثابت قدمی کی بے حد تعریف کی ہے۔ اگر چہ دشمن کا محاصرہ تنگ ہو رہا تھا اور وہ پوری قوّت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نزدیک آ رہے تھے لیکن علی علیہ السلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے سینہ سپر تھے جس کی وجہ

---

[1] علامہ محمد باقر مجلسی (متوفی ۱۶۹۸ء)، حیاتُ القلوب، ج ۲ ص ۵۶۵

سے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک نہیں پہنچ پا رہے تھے۔ تب اُنھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر سنگ باری شروع کردی۔ ایک پتھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیشانی مبارک پر آ لگا جس سے گہرا زخم آ گیا اور خون بہنے لگا۔ دوسرا پتھر بدبخت عتبہ بن ابی وقاص کے ہاتھوں چہرۂ اقدس پر لگا جس سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دو دندانِ مبارک شہید ہوگئے (دندان کے شہید ہونے والی روایت پر مکاتب فکر میں اختلاف ہے۔مؤلف) اس کے علاوہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دوشِ اقدس پر تلوار کا وار بھی کیا گیا لیکن وہ وار کارگر ثابت نہ ہُوا۔ تاہم دشمنوں کے ہاتھوں یہ تمام تکالیف اُٹھانے کے باوجود عظیم الشان پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے لب ہائے مبارکہ بددُعا کے لیے وا نہیں کیے بلکہ خدا تعالیٰ سے اُس قوم کی ہدایت اور نجات کی دُعا فرمائی۔ [1]

''مدارج النبوّت'' میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی لکھتے ہیں، ''منقول ہے کہ جب مسلمانوں کو ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا اور وہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تنہا چھوڑ گئے تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جوش میں آئے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیشانی مبارک سے پسینہ متقاطر ہُوا۔ اس حالت میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علی ابن ابی طالب علیہ السلام کو دیکھا کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پہلو میں کھڑے ہیں تو فرمایا، ''یا علی! تم اپنے بھائیوں کے ساتھ کیوں نہیں مِل گئے؟'' (یعنی تم کیوں نہیں فرار ہوگئے؟) حضرت علی مرتضیٰ علیہ السلام نے عرض کیا، ''لَا کُفْرَ بَعْدَ الْاِیْمَانِ اِنَّ لِیْ بِکَ اُسْوَۃً'' (ایمان کے بعد کفر نہیں، بے شک میرے لیے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کی اقتدا ہے) مطلب یہ کہ مجھے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سروکار ہے، اُن سے نہیں جو غنیمت کے درپے ہوگئے اور ہزیمت میں مبتلا ہوگئے۔ عین اُسی لمحے کافروں کی ایک جماعت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانب حملہ آور ہوئی۔ فرمایا، ''یا علی (علیہ السلام)! اِس ٹولی سے میری حفاظت و خدمت کا حق بجالاؤ کیونکہ یہی وقتِ نصرت ہے۔'' حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہٗ اُس جماعت کی طرف متوجہ ہوئے اور سیّدِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گرد سے اُن کا گھیرا توڑ کر اُنھیں منتشر کردیا اور بہت سوں کو واصلِ جہنم کیا۔ اربابِ سیر بیان

---

[1] سید محمد صحفی، حکایاتُ القرآن، طبع جامعہ تعلیمات اسلامی پاکستان

کرتے ہیں کہ جب علی مرتضیٰ علیہ السلام نے کمال بہادری دکھائی اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نصرت کی تو جبرائیل علیہ السلام نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا کہ علی مرتضیٰ (علیہ السلام) نے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ کمال بہادری اور جواں مَردی دکھائی ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، ''اِنَّهٗ مِنِّیْ وَ اَنَا مِنْهُ'' (بلاشبہ یہ میرے ہیں اور میں اِن کا ہوں)۔ حدیث میں ہے کہ جب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ کلمہ ارشاد فرمایا تو جبریل علیہ السلام نے عرض کیا، ''وَاَنَا مِنْكُمَا'' (اور میں آپ دونوں کا ہوں)۔ روایت ہے کہ اُس وقت لوگوں نے غیب سے ایک آواز سُنی ''لَا فَتٰی اِلَّا عَلِیٌ لَا سَیْفَ اِلَّا ذُوْالْفِقَار'' (کوئی جوانمرد نہیں بجز علی کے اور کوئی تلوار نہیں بجز ذوالفقار کے) [۱]

''معارج النبوۃ'' اور ''کشف الغمہ'' میں اس واقعے کے آخر میں یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اے علی! تم نے اپنی تعریف سُنی جو رضوان نامی فرشتہ کررہا تھا؟ وہ کہتا تھا، ''لَا فَتٰی اِلَّا عَلِیٌ لَا سَیْفَ اِلَّا ذُوْالْفِقَار'' اور ''روضۃ الاحباب'' میں منقول ہے کہ یہ حدیث اسی طریقے سے بعض اکابر محدثین سے مروی ہے اور اہلِ سیر نے اپنی کتابوں میں بیان کیا ہے۔ الغرض حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہٗ نے مقابلہ ومحاربہ اور مجادلہ و شجاعت کا ایسا حق ادا کیا کہ اس سے زیادہ تصور نہیں کیا جاسکتا۔ [۲]

اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور کے سابق وائس چانسلر ڈاکٹر نصیر احمد ناصر لکھتے ہیں کہ حضرت علی علیہ السلام نے خاص طور پر بہادری کے وہ جوہر دکھائے کہ دیکھنے والے دنگ رہ گئے۔ [۳]

مروی ہے کہ جنگ میں سیّد المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم زخمی ہوئے تو امیر المومنین علیہ السلام اور سیّدۃُ نساء العالمین علیہا السلام آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے روئے مبارک سے خون صاف کرتے تھے۔ حضرت علی

---

[۱] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۱۶۶

[۲] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۱۶۷ بحوالہ معارج النبوۃ علی بن عیسیٰ اربیلی (متوفی ۶۹۴ ہجری)، کشفُ الغُمۃ

[۳] ڈاکٹر نصیر احمد ناصر، کتاب: پیغمبر اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ص ۵۱۰

علیہ السلام پانی لے کر آتے اور جناب سیّدہ فاطمہ زہراء علیہا السلام والدِ گرامی کا خون دھوتیں۔ نمازِ ظہر کا وقت ہُوا تو حالتِ جنگ میں اور زخمی ہونے کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نماز کے لیے کھڑے ہوگئے۔ فضا خونیں اور دہشت ناک تھی، دشمن ابھی میدانِ جنگ میں موجود تھا مگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اپنے باقی ماندہ مجاہدین کے ساتھ اپنے پروردگار کے حضور سربسجود تھے۔ رزم ہوتی یا بزم، غم واندوہ ہوتا یا مسرت و شادمانی کا عالم، آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نہ تو اپنے معبودِ برحق کو بھول سکتے تھے اور نہ ہی کبھی بھولے۔

انجام

مؤرّخین لکھتے ہیں کہ (ابتدائی کامیابی کے بعد) نامراد کفّار صحنِ معرکہ میں اِدھر اُدھر کتوں کی مانند دوڑ رہے تھے۔ وہ سیر و تفریح، رجز خوانی اور خوشی و شادمانی کا اظہار کر رہے تھے۔ اُن کی عورتیں مثلاً ہندہ وغیرہ مسلمان شہیدوں کے پاس آئیں اور حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ کے سوا تمام شہیدوں کا مُثلہ کرنے لگیں۔ وہ اُن کے شکم چاک کرتیں، کلیجے نکالتیں، ناک کان کاٹتیں، ڈوریوں میں پرو کر ہار بناتیں اور اپنے گلوئے ناہنجار اور ناپاک ہاتھوں میں پہنتیں۔ حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ کے مُثلہ نہ کرنے کا سبب یہ تھا وہ ابو عامر راہب کے بیٹے تھے جو مشرکوں میں سے تھا۔[1]

اتنا سب کچھ ہو جانے کے باوجود چند اہلِ ایمان ثابت قدم بھی تھے اور رحمتِ الٰہی کے منتظر بھی جبھی قادرِ مطلق نے ہاری ہوئی جنگ کو اپنے بندوں کے حق میں پلٹ کر اُنھیں فتح سے ہمکنار کر دیا۔ تاریخ کے قارئین جانتے ہیں کہ جنگ کی ہار جیت کا انحصار فریقین کے مجموعی طور پر ہونے والے جانی نقصان پر نہیں ہوتا بلکہ دشمن کے سرداروں اور علمبرداروں کی موت یا پسپائی اور مقاصدِ جنگ میں کامیابی کے حصول پر ہوتا ہے۔ اس جنگ میں ستر مجاہدینِ اسلام درجہ شہادت پر فائز ہوئے جن میں مردِ میدان حضرت امیر حمزہ رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ دوسری طرف کافروں کا اگرچہ زیادہ جانی نقصان نہیں ہُوا تھا لیکن ابوسفیان کے سوا اُن کے تمام علمبردار اور سردار جہنم رسید ہوئے تھے اور جو فوج باقی رہ گئی تھی وہ فوج نہیں محض عوام کی ایک غیر منظّم بھیڑ بن گئی تھی۔

---

[1] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۱۷۶

اگرچہ مسلمانوں نے ابتدا میں فرار ہوکر اور بھاری جانی نقصان اُٹھا کر تاریخ کو اپنا گواہ تو بنالیا تھا لیکن چند مومن جو ثابت قدم رہے اُن کی جانفشانی کے انعام کے طور پر اور رسولِ اکرم ﷺ کی برکت کے طفیل بالآخر فتح اسلام کی پیشانی کا جھومر بنی۔

جنگ ختم ہوچکی تھی۔ شکست کے بعد ابوسفیان ہارے ہوئے جواری کی طرح اِدھر اُدھر نا کام و نامراد پھر رہا تھا۔ وہ ایک پہاڑ پر چڑھا اور رسول اللہ ﷺ پر نظر پڑی تو اپنی خجالت کو چھپانے کی خاطر نعرہ لگایا، ''اے ہبل تُو بلند رہے۔'' رسول اللہ ﷺ کے حکم پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی جوابی نعرہ بلند کیا، ''اللہ بلند اور جلیل ہے۔'' ابوسفیان بولا، ''ہمارے لیے عزّیٰ ہے تمھارے لیے عزّیٰ نہیں۔'' صحابہؓ بولے، ''اللہ ہمارا مددگار ہے تمھارا کوئی مددگار نہیں۔'' تب ابوسفیان نے چیلنج دیا کہ آئندہ سال بدر میں ہمارا تمھارا مقابلہ پھر ہوگا۔ حضور ﷺ نے اُس کا چیلنج قبول فرمایا اور ایک صحابی کے ذریعے جواب دیا کہ ٹھیک ہے یہ بات ہمارے تمھارے درمیان طے ہوگئی۔[۱]

یہ جواب سُن کر ابوسفیان اپنے لشکر کو لے کر پلٹ گیا۔ اُس کا منصوبہ ناکام ہوچکا تھا جس کا اُسے احساس ہوگیا۔ قریش نہ تو رسول اللہ ﷺ کو شہید کرنے میں کامیاب ہوئے تھے اور نہ ہی مسلمانوں کو شکستِ فاش دے کر ہلاک و اسیر کرسکے تھے۔

اگلے دن آنحضرت ﷺ نے قریش کے تعاقب کا فیصلہ کیا۔ مجاہدین نے اس پر لبیک کہا اور ایک نئے ولولے اور عزم کے ساتھ آپ ﷺ کے جھنڈے تلے جمع ہوگئے۔ اُسی روز شام کو آپ ﷺ نے حمراء الاسد میں پڑاؤ ڈالا اور لشکر کی حفاظت کے لیے سخت انتظامات کیے تاکہ دشمن شبخون نہ مار سکے۔ صبح ہوئی تو آپ ﷺ نے ایک مضبوط دفاعی مورچہ قائم کیا اور مجاہدین کی صف بندی فرمائی۔ مومنین کے دِل قوّتِ ایمانی سے سرشار تھے اور اُن کا جذبۂ جہاد اپنے عروج پر تھا چنانچہ جب وہ صف آرا ہوئے تو ہیبت و طاقت کا ایک فقید المثال نظارہ پیش کررہے تھے۔ اُدھر ابوسفیان مسلمانوں کے مکمل استیصال کے لیے بھرپور تیاری کیے بیٹھا تھا اور

---

[۱] ابوجعفر محمد بن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ھ)، تاریخ طبری، ج ۲ حصہ اوّل ص ۱۸۸

سوچ رہا تھا کہ اب کے زبردست حملہ کر کے مسلمانوں کا صفایا کردوں گا۔ اُسے مجاہدین کے حمراء الاسد میں اس طرح صف آرا ہونے کی خبر ملی تو اُس کا دِل بیٹھ گیا اور وہ خوف اور مایوسی کے عالم میں بے نیل مرام مکّہ لوٹ گیا۔ [۱]

جب مشرکین مکّہ لوٹ گئے تو بعض صحابہ کے دلوں میں خدشہ پیدا ہُوا کہ مبادا وہ لوٹ کر مدینہ طیبہ پر حملہ کر دیں۔ چنانچہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام سے فرمایا کہ وہ دشمنوں کے تعاقب میں جائیں اور تسلی کریں۔ حضرت علی علیہ السلام نے اُن کا تعاقب کیا اور یہ خبر لائے کہ مشرکین مکّہ کی طرف چلے گئے ہیں۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ سُن کر فرمایا کہ آج کے بعد کفّارِ قریش کبھی بھی کامیاب نہیں ہوں گے اور انشا اللہ ہمیں مکّہ مکرمہ کی فتح نصیب ہوگی۔ [۲]

تاریخ طبری میں اس کی تفصیل یوں بیان کی گئی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علی ابن ابی طالب (علیہ السلام) کو حکم دیا کہ آپ مشرکین کے پیچھے جا کر دیکھیں کہ وہ کیا کر رہے ہیں اور اُن کا لائحہ عمل کیا ہے؟ اگر اُنھوں نے گھوڑوں کو کوتل (بغیر سوار کے خالی گھوڑے) ساتھ لیا ہو اور خود اُونٹوں پر سوار ہوں تو سمجھ لیں کہ اب وہ مکّہ پلٹ رہے ہیں اور اگر اس کے برعکس وہ گھوڑوں پر سوار ہوں اور اُونٹوں کو خالی ساتھ لے جا رہے ہوں تو جان لیں کہ اُن کا ارادہ مدینہ کا ہے۔ قسم ہے اُس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، اگر وہ مدینہ کا رُخ کریں گے تو میں فوراً مدینہ پہنچ کر اُن سے لڑوں گا۔ علی علیہ السلام کہتے ہیں کہ حسبِ حکم میں اُن کے پیچھے چلا کہ دیکھوں وہ کیا کرتے ہیں؟ جب میں نے دیکھا کہ اُنھوں نے گھوڑوں کو کوتل کر دیا ہے اور اُونٹوں پر سوار ہوگئے ہیں تو میں سمجھ گیا کہ اب وہ مکّہ جا رہے ہیں۔ [۳]

---

[۱] ڈاکٹر نصیر احمد ناصر، کتاب: پیغمبرِ اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ص ۵۱۷
ابن ہشام (متوفی ۸۳۳ء)، سیرۃ ابن ہشام، ج ۲ ص ۱۷۲

[۲] شیخ عبد الحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۱۷۷

[۳] ابو جعفر محمد بن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ھ)، تاریخ طبری، ج ۲ حصّہ اوّل ص ۱۸۸

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جہاد

اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حاملِ معجزات وکرامات تھے مگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عام حالاتِ زندگی میں اپنی قوتِ اعجاز سے کام لینا پسند نہیں فرماتے تھے۔ اگر ایسا ہوتا تو تیرہ سالہ مکی دور میں کفّار آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو طرح طرح کی اذیتیں دینے میں کامیاب نہ ہوسکتے اور نہ ہی جنگِ اُحد میں کوئی زخم آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جسمِ اطہر پر آسکتا، اسی لیے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جنگ میں اپنی مدافعت بھی فرمائی اور اس مقصد کے لیے اسلحے کا استعمال بھی کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شریعت میں بھی کوئی حکم ایسا نہیں تھا جو جنگ میں مدافعانہ طور پر اسلحے کے استعمال میں مانع ہوتا بلکہ اسلام میں تو جہاد ایک اہم اُصول کی حیثیت رکھتا ہے چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بنفسِ نفیس جہاد بھی کیا۔ اس ضمن میں روایت ہے کہ جنگِ اُحد میں ایک مشرک اُبی بن خلف آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو شہید کرنے کے ارادے سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف بڑھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُس کی گردن پر نیزہ مارا، اُسے معمولی زخم آیا مگر وہ ہلاک ہوگیا۔

طبری میں اس روایت کی تفصیل یوں بیان کی گئی ہے، ''ابن شہاب الزہری سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شہادت کی خبر مشہور ہوجانے کے بعد جب مسلمانوں کو معلوم ہُوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم موجود ہیں تو وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آگئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اُن کی معیت میں دَرّے کی طرف روانہ ہوئے اور جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دَرّے میں جا کر بیٹھ گئے تو اُبی بن خلف یہ کہتا ہُوا وہاں پہنچا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کہاں ہیں؟ میں ہلاک ہوجاؤں اگر وہ میرے ہاتھوں زندہ بچ جائیں۔ صحابہؓ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حکم دیں تو ہم آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنی آڑ میں لے لیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، نہیں، اس کی ضرورت نہیں، اسے آنے دو۔ جب وہ قریب آیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حارث بن الصمہؓ کا نیزہ اُٹھایا۔ راوی کہتا ہے کہ اُس موقع پر بعض لوگوں سے یہ بات بھی نقل ہوئی ہے کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھالا اُٹھایا تو ایک بجلی سی کوندگئی اور ہم اس طرح جھرجھرائے جس طرح کہ اُونٹ جھرجھری لیتا ہے اور اُس کے روئیں

جھڑ جاتے ہیں۔ پھر آپ ﷺ نے اُس کے سامنے جا کر وہ بھالا اُس کی گردن پر مارا تو وہ کئی مرتبہ اپنے گھوڑے پر چکر کھانے کے بعد قریش کی طرف پلٹ گیا۔ رسول اللہ ﷺ کے نیزے سے اُسے معمولی سی خراش آئی تھی مگر وہ کہنے لگا ''بخدا محمد (ﷺ) نے مجھے مار ڈالا۔'' قریش نے اُسے سمجھایا کہ بلا وجہ خوف سے تیرا دَم نکلا جا رہا ہے، تیرا زخم مہلک نہیں۔ اُس نے کہا کہ جب محمد (ﷺ) مکّہ میں تھے تو اُنھوں نے مجھ سے کہا تھا کہ میں تجھ کو قتل کروں گا، اس لیے اگر وہ مجھ پر تھوک ہی دیتے تو مجھے ہلاک کر دیتے، یا بقولے، اُس نے کہا کہ اگر محمد (ﷺ) میرے منہ پر کھجور کی گٹھلی ہی مار دیتے تو بھی میں مارا جاتا۔ پس، جب قریش اُسے واپس مکّہ لے جا رہے تھے تو اُس دشمنِ خدا کا راستے ہی میں کام تمام ہو گیا۔ عبدالرحمٰن بن عوف سے مروی ہے کہ اس واقعے سے پہلے وہ رسول اللہ ﷺ سے جب بھی ملتا تھا تو کہا کرتا تھا کہ اے محمد (ﷺ)! میں اپنے گھوڑے عود کو روزانہ دلے ہوئے جَو کھلا رہا ہوں تاکہ اُس پر سوار ہو کر آپ (ﷺ) کو قتل کروں۔ اُس کے جواب میں آنحضرت ﷺ فرماتے کہ ان شاء اللہ میں ہی تجھے قتل کروں گا۔ [1]

میں نے جب تاریخ کی کتابوں میں رسول اللہ ﷺ کے دستِ مبارک سے ایک کافر کے قتل ہونے کا واقعہ پڑھا تو اُلجھ کر رہ گیا اور بہت دیر تک اس پر غور وفکر کرتا رہا۔ رسول اللہ ﷺ کو تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجا گیا اور بے شک آپ ﷺ بلا تفریقِ مذہب وملّت تمام انسانوں بلکہ حیوانوں کے لیے بھی سراپا رحمت ہیں تو آپ ﷺ کے دستِ مبارک سے ایک انسان کا قتل ہو جانا میرے خیالِ کم مایہ میں نہیں سما رہا تھا۔ تا دیر مختلف قسم کی تاویلات سے دست وگریبان رہنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ کئی کام ایسے بھی تو ہیں جو رسالت مآب ﷺ نے انجام نہیں دیے حال آنکہ وہ مستحب تھے یا پھر اُن میں کوئی شرعی رکاوٹ

---

[1] ابوجعفر محمد بن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ھ)، تاریخ طبری، ج ۲ حصّہ اوّل ص ۱۸۴
شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۱۷۵

بھی حائل نہیں تھی جیسے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کبھی اذان نہیں دی، یا اپنی کسی زوجہ کو طلاق نہیں دی۔ اِن دونوں افعال کی تاویل یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اگر اذان دیتے تو جس جس کی سماعت تک اُس اذان کے کلمات پہنچتے اُس کا نماز کے لیے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف چلے آنا واجب ہوجاتا چاہے وہ جس حالت میں ہوتا اور جو بھی عذر مانع ہوتا۔ بالفاظِ دیگر حکمِ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بجالانا اُس کے لیے ضروری ہوتا پس آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُمت کی آسانی کے لیے اذان نہیں دی۔ دوسرا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کسی بیوی کو طلاق نہیں دی جس کی وجہ یہ سمجھ میں آتی ہے کہ اگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایسا کرتے تو طلاق کا عمل سُنّتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بن جاتا جسے لوگ اپنے مقاصد کے لیے یا بلاوجہ ہی محض اس لیے بخوشی اور متواتر انجام دیتے کہ یہ سُنّتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے اور اس طرح معاشرتی نظام درہم برہم ہوکر رہ جاتا۔ اس دوسری توجیہہ سے یہ معاملہ سمجھنے میں قدرے آسان ہوجاتا ہے کہ رسولِ گرامی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کسی عمل سے اجتناب کرنا یا انجام دینا اُمت کے لیے ایک نمونے کی حیثیت رکھتا ہے۔ پس اگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جنگ میں دشمن پر حملہ نہ کرتے یا اپنا دفاع نہ کرتے تو اُمّتِ مسلمہ کے لیے یہ عمل بھی سُنّتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بن جاتا اور مجاہدین لڑنے سے گُریز کرتے اور ایسی صورت میں جہاد کا تصور ہی ختم ہوکر رہ جاتا۔ چنانچہ میرے نزدیک آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ عمل بھی اتمامِ حُجّت کے طور پر ہوگا۔ اس خیال کو تقویت مندرجہ بالا روایت کا بغور مطالعہ کرنے سے بھی پہنچتی ہے جس میں بہت واضح طور پر بیان کیا گیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُبی بن خلف کو نیزہ اس طرح مارا کہ اُس کی گردن پر معمولی سی خراش آئی اور قریش نے اُسے کہا کہ بخدا تجھے ایسا مہلک زخم نہیں آیا جس سے تُو مرجائے۔ لیکن اس کے باوجود وہ مرگیا۔ اب وہ مرا کیسے؟ ممکن ہے کہ وہ اُس ضرب سے نہ مرا ہو جو نبی رحمۃً للعالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لگائی تھی بلکہ اللہ نے اُسے اپنے فرشتوں کے ذریعے مارا ہو جیسا کہ بدر میں ہُوا، اور اس طرف گمان اس لیے جاتا ہے کہ اُبی بن خلف کو لگنے والی ضرب سے متعلق صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کہتے ہیں کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھالا اُٹھایا تو ایک بجلی سی کوندگئی اور ہم اس طرح جھرجھرائے جس طرح کہ اُونٹ جھرجھری لیتا ہے اور اُس کے روئیں جھڑ جاتے ہیں۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُس

کے سامنے جا کر وہ نیزہ اُس کی گردن پر مارا جس سے وہ کئی مرتبہ اپنے گھوڑے پر چکر کھا گیا۔ بجلی کا کوندنا، لوگوں کا جھرجھری لینا اور اُبی بن خلف کا ایک معمولی ضرب کے باوجود کئی مرتبہ گھوڑے پر چکر کھا جانا بالکل وہی کیفیت ہے جو بدر میں ملائکہ کی آمد پر نظر آتی ہے۔ (واللہ اعلم)

نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور علی علیہ السلام کی تلواریں حضرت فاطمہ علیہا السلام کے سپرد

حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم جنگ سے واپس تشریف لائے تو اپنی تلوار حضرت فاطمۃ الزہراء علیہا السلام کے سپرد کی، جناب علی مرتضیٰ علیہ السلام نے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی پیروی کرتے ہوئے اپنی تلوار جناب زہراء علیہا السلام کے سپرد کی اور فرمایا کہ بخدا آج اِس نے میرے ساتھ خوب وفاداری کی۔ اُس موقع پر حضرت علی علیہ السلام نے یہ اشعار بھی کہے:[۱]

افاطم ھاك السيف غير ذميم　　فلست برعديد ولا بمليم

اے فاطمہ (علیہا السلام)! یہ تلوار لو جس سے مجھے کوئی شکایت نہیں

اور نہ ہی میں بزدل اور نکما ہوں

لعمری لقد قاتلت فی حب احمد　　وطاعة رب بالعباد رحيم

قسم ہے میری جان کی میں احمد (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کی محبت

اور اپنے رب کی اطاعت میں جو اپنے بندوں پر رحیم ہے، لڑا

وسيفی بكفی كالشهاب اهزه　　اجذبه من عاتق وضميم

اس حال میں کہ تلوار میرے ہاتھ میں روشن ستارے کی طرح تھی

جسے میں چلا رہا تھا اور اس سے کاندھوں اور پسلیوں کو قطع کر رہا تھا

---

[۱] ابوجعفر محمد بن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ھ)، تاریخ طبری، ج ۲ حصہ اوّل ص ۱۹۲

فماذلت حتی فضی ربی جموعھم وحتی شفینا نفس کل حلیم

میں اسی طرح شمشیر زنی کرتا رہا یہاں تک کہ میرے رب نے اُن کی جماعت کو پراگندہ کر دیا اور ہم نے ہر حلیم شخص کے دِل کو دشمن کے قتل سے ٹھنڈا کر دیا

واقعاتی تسلسل سے متعلق ایک اہم وضاحت

جنگِ اُحد کے حالات کا باریک بینی سے جائزہ لینے پر واقعاتی تسلسل کا فقدان واضح طور پر محسوس ہوتا ہے۔ کبھی تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ جنگ کے ابتدائی حصّے ہی میں شہید ہو گئے تھے اور کبھی لگتا ہے کہ دوسرے حصّے میں شہید ہوئے۔ اِسی طرح بعض اوقات یہ نظر آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کفّار کے نرغے میں تن تنہا کھڑے ہیں اور پہلے ابودجانہ انصاری رضی اللہ عنہ اور بعد میں ایک خاتون اُمّ عمارہ انصاریہؓ، آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی حفاظت کا فریضہ انجام دیتے ہیں اور کبھی یہ دکھائی دیتا ہے حضرت علی علیہ السلام اور کچھ جانباز آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے آگے سینہ سپر ہیں۔ اس واقعاتی تضاد کی وجہ سے روایات معتبر نظر نہیں آتیں جب کہ حقیقت یہ نہیں ہے، روایات قابلِ اعتبار ہیں لیکن اُنھیں بیان کرنے کا انداز صحیح نہیں ہے۔

معروف تاریخ نگار علامہ علی نقی نقوی لکھتے ہیں، ''زمانۂ سابق کے مؤرّخین کی یہ عادت نہیں تھی کہ واقعے کو مسلسل لکھیں، راویوں سے جو منتشر طور پر بیانات ملتے تھے اُنھیں پاشان و پریشاں طریقے پر درج کر دیتے تھے۔ راویوں نے بھی زیادہ تر تسلسل کے ساتھ پورا واقعہ بیان نہیں کیا بلکہ حسبِ موقع واقعے کے جس جزو کے بیان کی جس وقت ضرورت محسوس ہوئی بس اتنا بیان کر دیا۔ اب بعد کے مورّخین کو وہ سب بیانات یکجا ملتے ہیں تو اُنھیں ترتیب قائم کرنے میں بڑی دِقت محسوس ہوتی ہے اور اسی بے ترتیبی سے بعض اوقات واقعات میں تضاد محسوس ہوتا ہے۔ کبھی لگتا ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے آس پاس کوئی بھی نہیں تو کہیں پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے پاس کچھ آدمی موجود ہیں اور ساتھ موجود مجاہدوں میں کبھی زیادہ تعداد نظر آتی ہے

اور کبھی بہت مختصر۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ واقعے کے بیان میں اختلاف کی صورت نہیں بلکہ جنگ بگڑنے کے بعد یکے بعد دیگرے جنگ کے مختلف ادوار سامنے آئے ہیں۔ پہلا دور وہ ہوگا جس میں اکثریت کے قدم اُٹھ گئے مگر حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام کے ساتھ ابو دجانہ انصاریؓ، حضرت حمزہؓ اور شاید ڈیڑھ دو سو مجاہدین ابھی مصروفِ پیکار تھے جس کی قطعی دلیل شہدائے اُحد کی تعداد ہے جو متفق علیہ حیثیت رکھتی ہے یعنی ستر آدمی مسلمانوں میں سے شہید ہوئے۔ اگر یہ مانا جائے کہ پورے اسلامی لشکر نے فرار اختیار کیا تو آخر یہ مجاہدین کیونکر قتل ہوئے؟ ماننا پڑتا ہے کہ ایک معتد بہ (معقول) تعداد ایسی تھی جو مصروفِ جہاد رہی اور اُن کی دیکھا دیکھی بہت سے لوگ ابھی نتیجے کے انتظار میں تذبذب کے عالم میں ہوں گے اور یہ وہ دَور تھا جس میں براہِ راست رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر حملے نہیں ہو رہے ہوں گے اور نہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جسمِ مبارک کے زخمی ہونے کی نوبت آئی ہوگی۔ اس کے بعد دوسرا دَور وہ ہوگا جب جانباز مجاہدین کی شہادت کی وجہ سے رفتہ رفتہ اُن کی تعداد تیزی سے کم ہوتی گئی ہوگی۔ اس طرح وہ منزل آئی کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس اتنے سپاہی نہیں رہ گئے تھے جن کی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حملوں سے محفوظ رہ سکیں، اُس وقت ایک موقع وہ آیا ہوگا جب مردانِ میدان میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بالکل قریب ابو دجانہ انصاری رضی اللہ عنہ تھے اور اب اُن کو بجائے دشمنوں سے بڑھ بڑھ کے جنگ کرنے کے یہی صورت جاں نثاری کی نظر آئی کہ وہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے سِپر بن کر کھڑے ہو جائیں جس کا تذکرہ پہلے آ چکا ہے۔ پھر حضرت ابو دجانہ رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد وہ وقت آیا ہوگا جب حضرت اُمّ عمارہؓ کو اس کی ضرورت پڑی ہوگی کہ وہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ڈھال بن کر دشمنوں کا دفعیہ کریں مگر ظاہر ہے کہ ایک خاتون کا بس کثیر التعداد دشمنوں کے سامنے کہاں چل سکتا تھا۔ اُدھر میدانِ جہاد میں ایک حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام رہ گئے تھے، وہ دشمنوں سے لڑنے میں مصروف تھے اور اِدھر رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھے جواب دشمنوں کے حملے کا مرکز بن گئے تھے۔"[1]

---

[1] علامہ علی نقوی، تاریخ اسلام، ص ۲۴۸

جنگ میں مسلمان خواتین کی خدمات

جنگِ اُحد میں مسلمان خواتین نے بھی اپنی بساط کے مطابق حصّہ لیا اور جذبۂ انسانی و ایمانی سے سرشار ہو کر ایسی خدمات انجام دیں جو ہمیشہ کے لیے مشعلِ راہ بن گئیں۔ اس جنگ میں مجاہدین بڑی تعداد میں زخمی یا شہید ہوئے تھے۔ بقولے، شہدا کی تعداد ستّر اور زخمیوں کی چالیس تھی۔ جب یہ خبر مدینہ منوّرہ پہنچی تو مسلمان خواتین سے نہ رہا گیا اور وہ اپنے دینی بھائیوں کی مدد کرنے میدانِ جنگ میں پہنچ گئیں۔ وہ زخمیوں کی مرہم پٹی کرتیں، پانی پلاتیں اور اُن کی خدمت اور دیکھ بھال کرتیں۔ اُن خواتین میں جناب سیّدۃُ نساء العالمین حضرت فاطمۃ الزہراء علیہاالسلام سب میں نمایاں تھیں۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ ''نرسنگ'' کی بانی فلورنس نائٹنگ ایل (Florence Nightingale) تھی جو ۱۲ مئی ۱۸۲۰ء کو اٹلی میں پیدا ہوئی اور ۱۳ اگست ۱۹۱۰ء کو برطانیہ میں فوت ہوئی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس تحریک کا سنگِ بنیاد خاتونِ جنّت سیّدۃُ نساء العالمین حضرت فاطمۃ الزہراء علیہاالسلام نے جنگِ اُحد میں رکھا تھا۔

جاں نثارانِ اُحد کا مختصر تذکرہ

حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام

آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وفادار بھائی اور جاں نثار وزیر تھے۔ آپ علیہ السلام نے آغوشِ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں آنکھ کھولی اور سایۂ رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں پرورش پائی۔ ہمیشہ نبی گرامی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آگے سرِ تسلیم خم کیے رہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حفاظت کے لیے سینہ سپر رہے۔ اُحد میں آپ کے کارناموں کا تفصیلی ذِکر اُوپر آ چکا ہے۔

حضرت امیر حمزہ رضی اللہ عنہ

حضرت امیر حمزہ بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا تھے۔ اپنے بھائی

حضرت ابو طالب علیہ السلام کے بعد ہمیشہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے سامنے ڈھال بنے رہے۔ ان کی موجودگی میں قریش کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی طرف میلی آنکھ سے دیکھنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی۔ اُحد میں جن تین افراد کی شجاعت تاریخ کے اوراق پر سنہری حروف میں رقم ہے اُن میں حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا نام بہت نمایاں ہے۔ ایک سیاہ فام غلام نے جس کا نام وحشی ابووسمہ تھا، چھپ کر وار کیا جس سے ان کی شہادت ہوئی۔

حضرت امیر حمزہ رضی اللہ عنہ کی شہادت کا پس منظر

حضرت امیر حمزہ رضی اللہ عنہ ایک عام سپاہی کی طرح میدانِ جنگ میں لڑتے ہوئے اتفاقاً شہید نہیں ہوئے تھے۔ مؤرخین لکھتے ہیں کہ اُن کی شہادت کے پیچھے ایک گہری سازش تھی جسے ابوسفیان کی بیوی ہندہ بنت عتبہ اور جبیر بن مطعم نے تیار کیا تھا۔ اُن دونوں کو جنگِ بدر میں اپنے اقربا کے مارے جانے کا شدید غم وغصہ تھا جس کی بنا پر اُنھوں نے جبیر بن مطعم کے غلام وحشی ابووسمہ بن حرب کو لالچ دے کر تیار کیا کہ وہ مسلمانوں کی تین اہم ترین شخصیات، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم، امیر المومنین علی علیہ السلام اور حضرت حمزہ بن عبد المطلب رضی اللہ عنہ میں سے کسی ایک کو قتل کرے گا تو اُسے آزاد کر دیا جائے گا۔[۱] وحشی ابووسمہ ایک خطرناک ہتھیار ''حربہ'' کے استعمال میں بہت مہارت رکھتا تھا اور اُس کا نشانہ کبھی خطا نہیں ہوتا تھا۔

جبیر کا چچا طعیمہ جنگِ بدر میں جناب علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے ہاتھوں قتل ہُوا تھا۔ اُس نے وحشی سے کہا کہ تم محمد (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کے چچا کو میرے چچا طعیمہ کے بدلے میں قتل کر دو میں تمھیں آزاد کر دوں گا۔ ہندہ بنت عتبہ کا یہ حال تھا کہ جب وہ وحشی کے پاس سے گزرتی یا وہ اُس کے پاس سے گزرتا تو اُسے کہتی، ''اے ابووسمہ! تُو میرا دل ٹھنڈا کر اور اپنا بھی۔''[۲]

---

[۱] آیت اللہ جعفر سبحانی، دی میسیج (The Message)، باب ۳۲

[۲] ابوجعفر محمد بن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ھ)، تاریخ طبری، ج ۲ ح اوّل ص ۱۷۴

''بخاری'' میں جعفر بن عمر بن اُمیّہ ضمری سے مروی ہے کہ وہ اور عبیداللہ بن عدی سفر میں تھے کہ حمص سے گذرتے ہوئے اُس وحشی کے ہاں گئے جس نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو شہید کیا تھا۔ اُنھوں نے وحشی سے کہا کہ تم ہمیں حمزہ (رضی اللہ عنہ) کی شہادت کے بارے میں کچھ بتاؤ۔ وحشی نے کہا، ''حمزہ نے طعیمہ بن عدی کو بدر میں مار ڈالا تھا اُس پر میرے مالک جبیر بن مطعم نے کہا کہ اگر تُو حمزہ کو میرے چچا کے بدلہ میں قتل کر دے تو میں تجھے آزاد کر دوں گا۔ پس جنگ کے دن میں ایک بڑے پتھر کی اوٹ میں چھپ کر بیٹھ گیا اور جب حمزہ میرے قریب سے گذرے تو میں نے اپنا حربہ اُن پر پھینکا۔ میں نے ناف اور عانہ کے درمیان نشانہ لگایا تھا یہاں تک کہ وہ اُن کی رانوں کے درمیان سے نکل گیا اور اُن کے لیے جان لیوا ثابت ہُوا۔''

اربابِ سیر بیان کرتے ہیں کہ طعیمہ بن عدی کے کہنے پر جب وحشی اُحد کی طرف چلا تو راہ میں ہندہ بنت عتبہ زوجہ ابوسفیان ملی۔ وہ وحشی کے پاس پہنچی اور کہا کہ جب تک تُو ہماری خاطر داری نہیں کرے گا تجھے آزادی نہیں ملے گی، میں بھی تجھے بہت کچھ دوں گی کیونکہ میرے باپ عتبہ کو روزِ بدر حمزہ نے ہی مارا تھا۔ وحشی کہتا ہے کہ میں نے میدانِ جنگ میں حمزہ کو دیکھا کہ وہ شیرِ مست کی مانند اپنی قوم سے نکل کر آرہے ہیں اور لشکرِ قریش کی صفوں کو درہم برہم کر رہے ہیں۔ پھر سباع بن عبدالعزیٰ خزاعی کفّار کی صفوں سے نکل کر آیا اور اپنا مقابل مانگا تو حمزہ اُس کے مقابل ہوئے اور اُسے مار ڈالا۔ میں ایک پتھر کی اوٹ میں گھات لگائے بیٹھا تھا۔ میں حربہ خوب چلاتا ہوں اور میرا نشانہ کم ہی خطا ہوتا ہے۔ پس جب وہ بے خبری میں میرے پاس سے گذرے تو میں نے اپنا حربہ اُن کے عانہ (ناف سے نیچے کا حصّہ) پر پھینکا جو دوسری طرف پار ہو گیا۔ میں نے دیکھا کہ وہ میری طرف متوجہ ہوئے ہیں تو میں بھاگ کھڑا ہُوا، پھر وہ زمین پر گر گئے۔ کچھ دیر بعد میں پھر اُن کی طرف گیا اور اپنے خنجر سے اُن کا پیٹ چاک کر کے جگر نکالا اور اُسے ہندہ کے پاس لے آیا اور کہا کہ یہ ہے تیرے باپ کے قاتل حمزہ کا جگر۔ اُس نے مجھ سے لے لیا اور منہ میں چبا کر تھوک دیا (گویا کہ ہندہ نے وحشی سے کہہ رکھا تھا کہ جب تُو حمزہ (رضی اللہ عنہ) کو شہید کر دے تو

اُن کا جگر میرے پاس لانا، یا پھر یہ سیاہ قاسی القلب از خود اُسے اُس کے پاس لے گیا تھا کیونکہ اُس نے اسے لالچ دے رکھا تھا) تب ہندہ نے اپنے کپڑے، زیور اور تمام سونا چاندی مجھے دے دیے اور وعدہ کیا کہ جب مکّہ پہنچوں گی تو سرخ سونے کی دس اشرفیاں مزید دُوں گی۔ ہندہ نے مجھ سے کہا کہ مجھے وہ جگہ دکھاؤ جہاں حمزہ کی لاش ہے۔ میں اُسے وہاں لے گیا۔ اُس نے حمزہ کے ناک، کان اور ہاتھ پاؤں کاٹ لیے اور اپنے ساتھ مکّہ لے آئی۔ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا جگر چبانے کی وجہ سے ہی ہندہ کو ''آکِلَۃُ الْاَکْبَاد''، یعنی ''جگر خورہ'' کہا جاتا ہے۔[۱]

حضرت ابو دجانہ انصاری رضی اللہ عنہ

اس جنگ میں حضرت ابو دجانہ رضی اللہ عنہ کے فخر و غرور اور شجاعت کا واقعہ بہت دلچسپ ہے۔ زبیر سے مروی ہے، ''جنگِ اُحد کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک تلوار ہاتھ میں لیے اُسے بغور دیکھ رہے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ کون ہے جو اس کو لے کر اس کا حق ادا کرے؟ میں نے کھڑے ہو کر عرض کیا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! میں اس کا مستحق ہوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے میری طرف سے منہ پھیر لیا اور پھر فرمایا کہ کون ہے جو اس تلوار کو لے کر اس کا حق ادا کرے؟ میں نے پھر کہا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! میں اس کا مستحق ہوں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پھر منہ پھیر لیا اور فرمایا کہ کون ہے جو اس تلوار کو لے کر اس کا حق ادا کرے؟ اس مرتبہ ابو دجانہ سماک بن خرشہ نے آگے بڑھ کر کہا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! میں اس کا حق ادا کروں گا اور مجھے بتائیں کہ وہ حق کیا ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اس تلوار کا حق یہ ہے کہ اس سے کسی مسلمان کو قتل نہ کیا جائے اور کوئی کافر اس کے وار سے بچ نہ پائے۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وہ تلوار اُن کو دے دی۔ ابو دجانہ کی عادت تھی کہ جب لڑنے نکلتے تو سر پر ایک کپڑا باندھ لیتے۔ میں نے سوچا دیکھوں کہ آج یہ کیا کرتے ہیں۔ چنانچہ اُنھوں نے تلوار اُٹھائی اور جو مشرک سامنے آتا اُسے پاش پاش کرتے ہوئے آگے بڑھنے لگے یہاں تک کہ وہ دامنِ کوہ میں ایسی جگہ جا پہنچے جہاں مشرکین کی عورتیں دَف بجا رہی

[۱] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء) مدارج النبوت، ج ۲ ص ۱۶۵

تھیں۔ ایک عورت گا رہی تھی:

نَحْنُ بَنَاتَ طَارِقٍ نَمْشِي عَلَى النَّمَارِقِ

إِنْ تُقْبِلُوا نُعَانِقِ أَوْ تُدْبِرُوا نُفَارِقِ

فِرَاقَ غَيْرِ وَامِقِ

ابو دجانہ (رضی اللہ عنہ) نے اُسے مارنے کے لیے تلوار اُٹھائی مگر رُک گئے اور اُسے چھوڑ دیا۔ میں نے کہا کہ اے ابو دجانہ! میں نے تمھاری ساری کارگزاری دیکھی ہے مگر تم نے اُس عورت پر تلوار اُٹھائی پھر اُسے چھوڑ کیوں دیا؟ ابو دجانہ (رضی اللہ عنہ) نے جواب دیا کہ میرے نزدیک ایک عورت کو قتل کرنا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تلوار کے شایانِ شان نہیں تھا پس میں نے اُسے چھوڑ دیا۔ [1]

ابنِ اسحٰق سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب فرمایا کہ کون ہے جو اس تلوار کو لے اور اس کا حق ادا کرے تو کئی اصحاب اُٹھے مگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وہ تلوار اُن میں سے کسی کو نہ دی۔ بنوساعدہ کے ابو دجانہ (رضی اللہ عنہ) نے عرض کیا کہ میں اس تلوار کا حق ادا کروں گا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تلوار اُن کو دے دی۔ ابو دجانہ (رضی اللہ عنہ) بڑے شجاع آدمی تھے، لڑائی میں اکڑتے تھے اور سرخ رومال اپنے سر پر باندھتے تھے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دستِ مبارک سے تلوار لے کر اُنھوں نے اپنا سرخ رومال سر پر باندھا اور پھر صفوں کے بیچ اکڑتے ہوئے چلنے لگے۔ بنوسلمہ کے ایک انصاری سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُنھیں اس طرح اکڑ کر چلتے ہوئے دیکھا تو فرمایا کہ یوں تو ایسی چال سے اللہ عزوجل ناراض ہوتا ہے مگر اِس موقع پر نہیں۔ [2]

حضرت ابو دجانہ رضی اللہ عنہ نے جنگ کے ابتدائی مرحلے میں نہایت شجاعت و مردانگی کے ساتھ دشمن کا مقابلہ کیا لیکن دوسرے مرحلے میں جب کئی مسلمان رسولِ گرامی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ساتھ چھوڑ کر جا چکے تھے تو یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اُوپر جھک گئے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف آنے والے تیروں کو اپنی پشت پر لے رہے تھے۔ یہاں تک کہ تیروں نے ان کا پیکرِ وفا چھلنی کر دیا

---

[1] ابو جعفر محمد بن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ھ)، تاریخ طبری، ج ۲ حصہ اوّل ص ۱۸۰

[2] ابو جعفر محمد بن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ھ)، تاریخ طبری، ج ۲ حصہ اوّل ص ۱۸۰

اور یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر قربان ہو گئے۔ [1]

روایت ہے کہ جب کئی مسلمان، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو میدان میں تنہا چھوڑ کر بھاگ گئے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس صرف امیر المومنین علی علیہ السلام اور حضرت ابو دجانہ انصاری رضی اللہ عنہ رہ گئے تھے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابو دجانہ رضی اللہ عنہ کو دُعا دی اور فرمایا، ''ابو دجانہ! تم بھی چلے جاؤ میں تم کو اپنی بیعت سے آزاد کرتا ہوں۔'' یہ سُن کر ابو دجانہ رضی اللہ عنہ رونے لگے اور آسمان کی طرف منہ کر کے بولے، ''نہیں! خدا کی قسم میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیعت سے آزاد نہیں ہو سکتا۔ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! میں کہاں جاؤں؟ کیا اپنی بیوی کے پاس جو ایک دن مر جائے گی؟ اور اپنے بیٹے کے پاس جو ایک روز موت سے ہم کنار ہو جائے گا؟ اور اپنے گھر جو ایک دن کھنڈر بن جائے گا؟ اور اپنے مال و متاع کی حفاظت کروں جو آخرش فنا ہو جائے گا؟ اور پھر موت کی طرف رُخ کروں جو انسان کے بہت نزدیک ہے؟'' حضرت ابو دجانہ رضی اللہ عنہ کے ایمان و ایثار سے لبریز یہ کلمات سُن کر حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُن پر لطف و کرم فرمایا اور جنگ کی اجازت دے دی اور آخر کار وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نثار ہو گئے۔ [2]

حضرت عَمرو بن جموح رضی اللہ عنہ

حضرت عَمرو بن جموح رضی اللہ عنہ ایک عُمر رسیدہ مومن تھے۔ بڑھاپے اور ناتوانی کی وجہ سے اُن کی کمر جھک چکی تھی، اُن کا ایک پاؤں بھی کسی حادثے میں زخمی ہو گیا تھا مگر اس کے باوجود اُن کے حوصلے جوان اور جذبۂ ایمانی مضبوط تھا۔ اُن کے چار جوان بیٹے تھے جنھیں وہ جہاد پر روانہ کر چکے تھے اور خوش تھے کہ وہ سچائی اور ایمان کے راستے پر گامزن ہُوئے۔ اُن کی شدید خواہش تھی کہ وہ بھی جہاد میں حصّہ لیں اور اپنی جان اللہ کی راہ میں قربان کریں لیکن اُن کے رشتہ

---

[1] علامہ علی نقوی، تاریخ اسلام، ص ۲۴۴

[2] ابو جعفر محمد بن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ھ)، تاریخ طبری، ج ۲ حصّہ اوّل ص ۱۸۰

دار اُنھیں منع کرتے تھے کہ اس عمر اور حالت میں آپ پر جہاد واجب نہیں۔ اپنے احباب کی اس توجیہہ سے وہ مطمئن نہیں تھے لہٰذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ میرے قرابت دار مجھے جنگ میں حصّہ لینے سے منع کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تم پر اس عمر میں جہاد واجب نہیں، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس بارے میں کیا فرماتے ہیں؟ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اس عُمر میں اللہ کی طرف سے آپ ان ذمہ داریوں سے مستثنیٰ ہیں۔ حضرت عمرو بن جموح رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے گذارش کی کہ اس کے باوجود آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میری درخواست قبول فرمائیں اور مجھے اذنِ جہاد عطا فرمائیں۔ اُن کے اقربا پھر اُنھیں سمجھانے لگے لیکن نبی اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عمرو بن جموح رضی اللہ عنہ کا جذبۂ جہاد دیکھتے ہوئے اُن لوگوں سے فرمایا کہ انھیں حق کی راہ میں جان فدا کرنے سے مت روکو۔ چنانچہ عمرو بن جموح رضی اللہ عنہ جہاد کے لیے گھر سے نکلے تو دُعا کی، ''الٰہی! مجھے اپنی راہ میں جان فدا کرنے میں کامیاب فرما اور مجھے میرے گھر میں (زندہ) واپس نہ بھیجنا۔'' اُن کی دُعا مستجاب ہوئی اور وہ گھر کی بجائے بارگاہِ الٰہی میں پہنچ گئے۔[۱]

رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ اور سمُرہ بن جندب رضی اللہ عنہ

جنگِ اُحد میں جہاں ایک طرف مسلمانوں کا ایک گروہ جنگ پر جانے سے گریزاں تھا تو دوسری طرف کئی مسلمان بچّے ایسے تھے جو جہاد میں حصّہ لینے کے لیے بیتاب تھے۔ اُن میں سے اکثر کو تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُن کی کم سِنی کی بنا پر واپس بھیج دیا مثلاً ابوسعید خُدری، عرابہ بن اوس، زید بن ثابت، اسید بن ظہیر، براء بن عازب اور عبداللہ بن عمیر یا عبداللہ بن عمرو غیرہ لیکن کچھ بچّے ایسے بھی تھے جو کسی صورت واپسی پر آمادہ نہیں تھے۔ اُن کا جذبۂ جہاد اور شوق و ولولہ دیکھ کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُن کو محاذ پر جانے کی اجازت مرحمت فرما دی۔ اُن بچّوں میں رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ اور سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ کا نام تاریخ میں سنہری حروف سے رقم ہے۔

---

[۱] آیت اللہ جعفر سبحانی، دی میسیج (The Message)، ص ۳۴۸

جہاد کے لیے بضد رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ بہت کم عمر تھے، اُن کو جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے رُوبرو پیش کیا گیا تو وہ ایڑیاں اُٹھا کر اور اپنے پنجوں کے بل اُچک کر کھڑے تھے تا کہ اُن کا قد بڑا نظر آئے اور وہ کم عمر معلوم نہ ہوں۔ کم سِن مجاہد کی شوقِ جہاد سے بھرپور یہ معصومانہ حرکت دیکھ کر رسولِ گرامی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا اس بچّے کو ساتھ چلنے دو۔ بروایتے وہ ماہر تیر انداز بھی تھے اور اُن کے انتخاب کی ایک وجہ اُن کی یہ مہارت بھی تھی۔

سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ اپنی کم سِنی کی بِنا پر رافع سے پہلے واپس بھیجے جا چکے تھے۔ اُنھوں نے جب دیکھا کہ رافع کو منتخب کر لیا گیا ہے تو وہ مچل گئے۔ اُنھوں نے اپنے سر پرست مری بن سنان کے ذریعے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) نے رافع کو جنگ پر جانے کی اجازت دے دی ہے حالانکہ میں اُس سے زیادہ قوی ہوں اور دعویٰ کرتا ہوں کہ اگر اُس کے ساتھ کُشتی لڑوں تو اُسے پچھاڑ دوں۔ رسولِ معظم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو سمرہ بن جندب رضی اللہ عنہ کا یہ طفلانہ استدلال پسند آیا، فرمایا ٹھیک ہے کُشتی لڑو۔ چنانچہ کُشتی ہوئی اور واقعی سمرہؓ نے رافعؓ کو پچھاڑ دیا۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اُنھیں بھی جنگ پر جانے کی اجازت مرحمت فرما دی۔[1] بقولے، رافع بن خدیج رضی اللہ عنہ اور سمُرہ بن جندب رضی اللہ عنہ کی عمریں پندرہ سال سے کم تھیں، رافع بن خدیج کا انتقال ۷۴ ہجری میں اور سمرہ بن جندب کا ۵۴ ہجری میں ہوا۔

حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ

دستورِ عرب کے مطابق لڑائی میں کم از کم دو پرچم ہوتے تھے، ایک بڑا اور ایک چھوٹا۔ بڑے جھنڈے کو ''رایۃ'' کہتے تھے جب کہ چھوٹا ''لواء'' کہلاتا تھا۔ لشکرِ اسلام میں ہمیشہ حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام حاملِ رایۃ ہُوا کرتے تھے لیکن لواء صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کسی کو بھی عطا کر دیا جاتا تھا۔ اُحد میں بھی حسبِ روایت حاملِ رایۃ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام تھے اور

---

[1] آیت اللہ جعفر سبحانی، دی میسیج (The Message)، ص ۳۴۷

علامہ علی نقوی، تاریخ اسلام، ص ۲۲۸۔ ابو جعفر محمد بن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ھ)، تاریخ طبری، ج ۳ ص ۱۲

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لواء حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو دیا تھا۔ یہ عین شبابِ جنگ میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قریب لڑ رہے تھے کہ ابنِ قمیہ لیثی کے ہاتھوں شہید ہو گئے۔ مصعب رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لواء بھی علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے سپرد کر دیا۔[1]

حضرت سعد بن ربیع رضی اللہ عنہ

حضرت سعد بن ربیع رضی اللہ عنہ کا تعلق انصاری قبیلے بنی الحارث بن خزرج سے تھا۔ دورانِ جنگ میں وہ لاپتا ہو گئے تھے۔ جنگ کے اختتام پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ کون ہے جو سعد بن ربیع کی خبر لائے کہ وہ زندوں میں ہیں یا شہیدوں میں؟ چنانچہ ایک انصاری اُن کی تلاش میں روانہ ہوئے اور میدانِ جنگ میں ایک جگہ اُنھیں ایسی حالت میں پایا کہ وہ زخموں سے چُور چُور تھے اور آخری سانسیں لے رہے تھے۔ اُنھوں نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے تمھاری تلاش میں بھیجا ہے۔ سعد رضی اللہ عنہ نے کہا، ''رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں میرا سلام عرض کرنا اور کہنا کہ اللہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو وہ بہترین جزا عطا فرمائے جو کسی بھی نبی کو اُس نے عطا کی ہو۔ اور میری قوم کو میرا سلام پہنچانا اور میری طرف سے کہنا کہ جب تک تم میں سے ایک بھی متنفس باقی ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بال بھی بیکا نہ ہونے پائے ورنہ روزِ قیامت خدا کے سامنے تمھارے پاس کوئی جواب نہ ہوگا۔'' اتنا کہہ کر سعد بن ربیع رضی اللہ عنہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔[2]

حضرت زیاد بن سکن رضی اللہ عنہ

حضرت زیاد بن سکن رضی اللہ عنہ یا عمار بن زیاد بن سکن رضی اللہ عنہ (اس روایت کے ذیل میں یہ دونوں نام کتابوں میں ملتے ہیں۔ مؤلف) انصار کی ایک جماعت کے ساتھ رسولِ معظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے مصروفِ جہاد تھے۔ اُن کے تمام ساتھی ایک ایک کر کے شہید ہو گئے تھے۔ وہ بھی شدید زخمی ہو کر گرے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اُنھیں میرے پاس لاؤ۔ چنانچہ اُن کو

---

[1] علامہ علی نقوی، تاریخ اسلام، ص ۲۴۵۔ ابوجعفر محمد بن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ھ)، تاریخ طبری، ج ۲ ص ۱۸۳

[2] علامہ علی نقوی، تاریخ اسلام، ص ۲۴۵، ابوجعفر محمد بن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ھ)، تاریخ طبری، ج ۲ ص ۱۸۳

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس لا کر لٹا دیا گیا۔ اُن کی خوش بختی ملاحظہ ہو کہ جب اُنھوں نے جان جانِ آفریں کے سپرد کی تو اُن کا رخسار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قدموں پر تھا۔[1]

حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ غسیل الملائکہ

یوم اُحد سے ایک دن پہلے حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ کی شادی تھی اس لیے وہ میدانِ جنگ میں حاضر نہ ہو سکے تھے۔ جب اُنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شہادت کی افواہ یا جنگ میں مسلمانوں کی بگڑتی ہوئی صورتِ حال کی خبر سُنی تو حالتِ جنابت میں ہونے کے باوجود جذبۂ ایمانی سے سرشار بغیر غسل کیے کہ مبادا دیر ہو جائے، بے تحاشا اُحد کی طرف بھاگے اور جاتے ہی کفّار پر ٹوٹ پڑے۔

''بُرے والدین کی اچھی اولاد'' والا محاورہ حضرت حنظلہؓ اور اُن کی بیوی پر خوب صادق آتا ہے۔ اُن کا باپ ابو عامر، نبی اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بدترین دشمنوں میں سے ایک تھا۔ عجب اتفاق ہے کہ جنگِ اُحد میں وہ قریش کی طرف سے لڑ رہا تھا جب کہ حنظلہ رضی اللہ عنہ مسلمانوں کی طرف سے میدان میں آئے تھے۔ وہ ابھی چوبیس سال کے نہیں ہوئے تھے کہ جنگِ اُحد سے ایک دن پہلے اُن کی شادی قبیلہ اوس کے مشہور منافق عبداللہ بن اُبی کی بیٹی سے ہوئی۔ حنظلہ رضی اللہ عنہ نے حکمِ جہاد سنا تو پریشان ہو گئے کیونکہ آنے والی رات اُن کی شبِ عروس تھی اور چڑھنے والا دن کفر و ایمان کے درمیان جنگ کا دن تھا۔ اسی پریشانی کے عالم میں وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ایک شب کے لیے اجازت طلب کی۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُنھیں ایک رات کی رخصت عطا فرمائی۔

علامہ مجلسی کہتے ہیں کہ مندرجہ ذیل آیتِ کریمہ اسی ضمن میں نازل ہوئی:[2]

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاِذَا كَانُوْا مَعَهٗ عَلٰٓى اَمْرٍ جَامِعٍ لَّمْ يَذْهَبُوْا

---

[1] علامہ علی نقوی، تاریخ اسلام، ص ۲۴۵، ابو جعفر محمد بن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ھ)، تاریخ طبری، ج ۲ ص ۱۸۳

[2] علامہ محمد باقر مجلسی (متوفی ۱۶۹۸ء)، بحار الانوار، ج ۲۰ ص ۵۷

حَتّٰى يَسْتَاْذِنُوْهُ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَاْذِنُوْنَكَ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ فَاِذَا اسْتَاْذَنُوْكَ لِبَعْضِ شَاْنِهِمْ فَاْذَنْ لِّمَنْ شِئْتَ مِنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمُ اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ [1] (مؤمن تو صرف وہ لوگ ہیں جو اللہ اور اُس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) پر ایمان رکھتے ہیں اور جب کسی اجتماعی معاملے میں رسول (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کے ساتھ ہوتے ہیں تو جب تک آپ (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) سے اجازت نہیں لے لیتے کہیں نہیں جاتے، (اے محبوب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم!) بے شک جو لوگ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) سے اجازت مانگتے ہیں وہی اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) پر ایمان رکھتے ہیں، پس جب وہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) سے اپنے کسی خاص کام کے لیے اجازت مانگیں تو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) اُن میں سے جسے چاہیں اجازت دے دیں اور اُن کے لیے اللہ سے مغفرت طلب کریں، بیشک اللہ بڑا بخشنے والا، بڑا رحم کرنے والا ہے۔)

شبِ عروسی گزار کر وہ مردِ مومن میدانِ جنگ کی طرف روانہ ہو رہے تھے کہ اُن کی ایک شب کی دُلہن کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اُس نے اُنھیں کہا کہ تھوڑی دیر کے لیے رُک جائیں۔ چنانچہ حنظلہ رُک گئے اور دُلہن نے چار معزز افراد کو وہاں بلوایا جو کسی عذر کے سبب جنگ پر نہیں جا سکے تھے۔ دُلہن نے حنظلہ کی موجودگی میں اُن سے کہا کہ گواہ رہنا کہ میری شادی حنظلہ سے ہو چکی ہے اور گزشتہ شب اِنھوں نے حقوقِ زوجیت ادا کیے ہیں۔ معززین نے کہا کہ ہمیں یہ سب بتانے کی کیا ضرورت تھی؟ دُلہن نے کہا، ''رات میں نے خواب میں دیکھا کہ آسمان شگافتہ ہُوا اور میرا شوہر اُس میں داخل ہو گیا پھر آسمان پہلے کی طرح ہو گیا۔ میں سمجھتی ہوں کہ اس خواب کی تعبیر یہ ہے کہ حنظلہ شہید ہو جائیں گے یعنی ان کی روح آسمان کی طرف پرواز کر جائے گی۔''

پس حنظلہ فوراً ہی اُحد کی طرف روانہ ہو گئے اور جاتے ہی کفّار پر ٹوٹ پڑے۔ دورانِ جنگ میں اُنھوں نے لشکرِ کفّار کے سالار ابوسفیان کو دیکھا تو اُس سے گتھم گتھا ہو گئے اور اُسے گرا کر چاروں شانے چت کر دیا اور پھر اُس کا کام تمام کرنے کے لیے اُس کے سینے پر سوار ہو گئے۔

---

[1] سورۃ النور، آیت ٦٢

ابوسفیان کی چیخ وپکار سُن کر ایک مشرک شداد بن اسود اُس کی مدد کو آیا اور حنظلہ رضی اللہ عنہ پر حملہ کر دیا۔ ابوسفیان تو بچ نکالیکن وہ خود شہید ہو گئے۔ حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ''میں نے دیکھا کہ حنظلہ کو ملائکہ نے غسل دیا۔''[۱] اسی وجہ سے اُنھیں ''غسیل الملائکہ'' کہا جانے لگا اور یہ لقب حضرت حنظلہ کی نسل میں خاندانی لقب کے طور پر چلتا رہا۔ روایت ہے کہ جب اہلِ مدینہ نے یزید کی بداعمالیوں کی وجہ سے اُس کی بیعت سے انکار کیا تو اِن ہی حنظلہ رضی اللہ عنہ کے بیٹے حضرت عبداللہ کو اپنا سردار بنایا جو یوم حرہ (جب یزید کی فوج نے مدینہ میں قتل عام کیا) شہید ہوئے۔[۲]

حضرت اُمِّ عمارہ انصاریہؓ

اُحد میں جہاں کئی ''مرد'' جان بچانے کی خاطر بھاگ گئے تھے وہاں اِس خاتون کی جاں نثاری قابلِ رشک ہے۔ یہ میدانِ جنگ میں زخمی مجاہدوں کی مرہم پٹی کے لیے آئی تھیں، جب دیکھا کہ کئی مسلمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ساتھ چھوڑ کر بھاگ گئے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تنہا پا کر مشرکین آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر حملہ آور ہو رہے ہیں تو یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے ڈھال بن کر کھڑی ہو گئیں اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف آنے والے تیروں کو اپنے نازک بدن پر لینے لگیں۔ پھر دشمن نے نیزوں اور تلواروں سے حملہ کیا تو یہ بھی تلوار سونت کر مقابلے پر اُتر آئیں یہاں تک کہ شدید زخمی ہو گئیں۔[۳]

یہودی مخریق کی جاں نثاری

اُحد میں ایک یہودی جس کا نام مخریق تھا، کی جاں نثاری بھی کتابِ تاریخ کا ایک

---

[۱] ابوجعفر محمد بن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ھ)، تاریخ طبری، ج ۳ ص ۲۱

[۲] علامہ علی نقوی، تاریخ اسلام، ص ۲۴۶

[۳] علامہ علی نقوی، تاریخ اسلام، ص ۲۴۶۔ خواجہ محمد لطیف، اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ، ج ۱ ص ۹۹
ابن ہشام (متوفی ۸۳۳ء) سیرت ابن ہشام، ج ۲ ص ۸۴

سنہری ورق ہے۔ روایت ہے کہ جب اُحد میں مسلمانوں پر سخت پریشانی کا دَور آیا اور حالات دِگرگوں ہوئے تو مخریق نے اپنی قوم سے کہا کہ تم پر محمد (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کی حمایت لازم ہے۔ یہودیوں نے کہا کہ آج تو ہفتے کا دن ہے جس میں ہم کوئی کام نہیں کرتے۔ اُس نے کہا ہفتہ وفتہ کچھ نہیں۔ وہ مسلح ہُوا اور میدان کی طرف چل پڑا۔ چلتے وقت اُس نے اپنی قوم سے کہا کہ اگر میں قتل ہو جاؤں تو میرا تمام مال محمد (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کا ہے وہ اُس کا جو چاہیں کریں۔ مخریق میدان میں پہنچا اور حمایتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم میں جنگ کرنے لگا یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر قربان ہوگیا۔[1]

حضرت عمرو بن ثابتؓ

عمرو بن ثابت ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ جب اُنھیں معلوم ہُوا کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر مشکل وقت آیا ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم جنگ کے لیے تشریف لے گئے ہیں تو اُنھوں نے اپنی تلوار اور سپر اُٹھائی اور اُحد کی طرف روانہ ہوگئے۔ بروایتے اُنھوں نے کلمۂ شہادت پڑھا اور لشکرِ کفّار پر ٹوٹ پڑے۔ عمرو جہاد کرتے کرتے شدید زخمی ہوگئے اور زخموں کی تاب نہ لا کر بالآخر گر پڑے۔ انصار میں سے ایک شخص اُن کی طرف سے گزرا تو وہ کشتوں کے درمیان پڑے ہوئے تھے مگر ابھی زندہ تھے۔ انصاری نے اُن سے پوچھا کہ اے عمرو! کیا تم اپنے پہلے دِین پر ہو؟ کہا خدا کی قسم نہیں، میں خدا کی وحدانیت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی رسالت کی گواہی دیتا ہوں۔ اتنا کہا اور واصلِ رحمتِ الٰہی ہوگئے۔

ایک صحابی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے سوال کیا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم! عمرو بن ثابت مسلمان ہوتے ہی مارے گئے، کیا وہ شہید ہیں؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا ''واللہ وہ شہید ہے اور ایسا کہ جس نے ایک رکعت نماز بھی نہیں پڑھی مگر جنّت میں جا پہنچا۔''[2]

---

[1] علامہ علی نقوی، تاریخ اسلام، ص ۲۶۶۔ ابوجعفر محمد بن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ھ)، تاریخ طبری، ج ۳ ص ۲۱

[2] علامہ محمد باقر مجلسی (متوفی ۱۶۹۸ء)، حیاتُ القلوب، ج ۲ ص ۵۶۵

شہدائے اُحد کی تجہیز وتدفین

ابن الوردی لکھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سب سے پہلے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی نماز جنازہ پڑھائی جس میں سات تکبیریں کہیں۔ پھر دوسرے شہدا کو باری باری اُن کے پہلو میں رکھا جاتا اور اُن کی نماز جنازہ بشمول حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کے پڑھائی جاتی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس طرح تمام شہدا کی نماز جنازہ پڑھائی کہ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ ہر نماز میں شامل تھے۔ پھر اُن کو ایک قبر میں علاحدہ دفن کیا گیا۔ عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ اور عمرو بن جموح رضی اللہ عنہ کے بارے میں رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اِن کے درمیان بہت اتحاد تھا لہٰذا انھیں ایک ہی قبر میں اکٹھا دفن کرو۔[1] اور باقی تمام شہدا کو اجتماعی طور پر الگ دفن کیا گیا۔ ایک روایت کے مطابق کچھ لوگ اپنے شہدا کو اُٹھا کر مدینہ لے گئے اور وہاں دفن کیا پھر رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایسا کرنے سے منع فرما دیا اور کہا کہ جہاں اِن کا مقتل ہے اِن کو وہیں دفن ہونا چاہیے۔[2]

شہدائے اُحد کا ماتم

ابن جریر سے روایت ہے کہ حضرت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، انصار کے دو قبیلوں بنی عبدالاشہل اور بنی ظفر کے مکانات کی طرف سے گذرے تو جنگِ اُحد میں شہید ہونے والوں کی خواتین کو نوحہ و ماتم کرتے سنا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آنکھیں اشکبار ہوگئیں اور فرمایا حمزہ رضی اللہ عنہ پر رونے والیاں نہیں ہیں؟ دو انصاری صحابہ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ اور حضرت اسید بن حضیر رضی اللہ عنہ واپس ہوئے اور خواتین کو ہدایت کی کہ وہ جائیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا کا ماتم کریں۔[3]

علامہ طبرسی لکھتے ہیں کہ وہ تمام خواتین حضرت سیّدہ فاطمۃ الزہراء علیہا السلام کے پاس آئیں

---

[1] علامہ علی نقوی، تاریخ اسلام، ص ۲۶۷۔ ابوجعفر محمد بن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ھ)، تاریخ طبری، ج ۳ ص ۲۱

[2] علامہ علی نقوی، تاریخ اسلام، ص ۲۶۷

[3] ابوجعفر محمد بن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ھ)، تاریخ طبری، ج ۳ ص ۲۱

اور آپ علیہا السلام کو جناب حمزہ رضی اللہ عنہ کا پُرسا دیا۔ پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم مسجد میں تشریف لے جا رہے تھے کہ حضرت فاطمۃ الزہراء علیہا السلام کے گھر سے رونے کی صدائیں سنیں تو رونے والی خواتین کے لیے دُعائے خیر کی اور فرمایا تم نے ہمدردی و غم خواری کا حق ادا کیا۔[۱]

مشہور مؤرّخ ابن سعد واقدی نے لکھا ہے کہ اس کے بعد انصار کی خواتین میں یہ رواج بن گیا کہ جب اُن کا کوئی عزیز فوت ہوتا تو وہ پہلے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا نام لے کر روتیں پھر مرنے والے پر گریہ زاری کرتیں۔[۲]

حضرت زینب بنت خزیمہؓ سے نکاح

جناب رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم رحمۃً لِّلعالمین تھے چنانچہ کچھ ایسی بیوہ عورتوں کو جن کا کوئی پرسان حال نہیں ہوتا تھا معاشرتی تحفظ فراہم کرنے کی خاطر آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے نکاح میں لیا اور سایۂ رحمت فراہم کیا۔ ایسی ہی ایک خاتون حضرت زینب بنت خزیمہؓ تھیں جو اپنی فیاضی کی وجہ سے اُمّ المساکین کے لقب سے مشہور تھیں۔ یہ تین بار بیوہ ہو چکی تھیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اُن سے نکاح فرمایا لیکن نکاح کے دو یا تین ماہ بعد ہی وہ انتقال کر گئیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اُن کی نماز جنازہ پڑھائی اور جنّت البقیع میں سپرد خاک کیا۔[۳]

غزوۂ حمراء الاسد

(ہفتہ ۱۶ شوال ۳ ہجری / یکم اپریل ۶۲۵ء)

مدینہ سے آٹھ میل دُور حمراء الاسد کے مقام پر یہ غزوہ واقع ہُوا اس لیے اسے غزوۂ حمراء الاسد کہا جاتا ہے۔ بعض مؤرّخین لکھتے ہیں کہ اُحد سے واپس آ کر اگلے ہی دن یعنی

---

[۱] علامہ علی نقوی، تاریخ اسلام، ص ۲۶۷

[۲] محمد ابن سعد (متوفی ۲۳۰ ہجری)، طبقات ابن سعد، بحوالہ تاریخ احمدی، ص ۴۵، ۴۶

[۳] ڈاکٹر نصیر احمد ناصر، کتاب: پیغمبر اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم، ص ۵۲۵

بروز ہفتہ ۱۶ شوال ۳ہجری کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اعلان فرمایا کہ ہم دشمن کے تعاقب میں روانہ ہونگے۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اُن مسلمانوں کے ساتھ جو اُحد کی جنگ میں شریک ہوئے تھے قریش کے تعاقب میں حمراء الاسد تک تشریف لے گئے۔ قریش وہاں سے آگے مکّہ کی طرف نکل گئے تھے لہٰذا تین دن حمراء الاسد میں قیام فرمانے کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم واپس تشریف لے آئے۔ بروایتے یہ قیام دشمن پر یہ ظاہر کرنے کے لیے کیا گیا تھا کہ اُحد کے واقعے سے مسلمان ہمت نہیں ہارے اور ان میں لڑنے کی جرأت ابھی بھی ہے۔[1]

عصرِ حاضر کے بعض محققین کا خیال ہے کہ مندرجہ بالا روایت کچھ خوش عقیدہ مؤرّخین نے مسلمانوں کی کمزوری کو چھپانے اور اُن کی وفاداری کو امکانی حد تک پایہ ثبوت کو پہنچانے کے لیے تصنیف کی ہے۔[2]

اس کا استدلال یوں پیش کیا گیا ہے:

اوّل، جنگِ اُحد کے اختتام پر دونوں فریقین کے درمیان یہ قول وقرار ہو گیا تھا کہ جنگ اب آئندہ سال ہوگی تو اس کے بعد دِرایتی طور پر یہ بات قابلِ قبول نہیں رہتی تھی کہ اُن کا تعاقب کیا جاتا۔

دوم، مسلمانوں میں اُحد میں جو عملی کمزوریاں نمایاں ہوئیں تھیں وہ اتنی واضح تھیں کہ جنگ کے بعد اس طرح کا کوئی نمائشی مظاہرہ ممکن نہیں لگتا۔

سوم، جب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم حضرت علی علیہ السلام کو اُن کے تعاقب میں روانہ کر کے پہلے ہی یہ اطمینان کر چکے تھے کہ وہ لوگ مکّہ کی طرف گامزن ہو چکے ہیں اور اُن کی واپسی کا کوئی امکان نہیں تو پھر یہ نمائشی اہتمام شانِ رسالت کے مطابق معلوم نہیں ہوتا۔ پس اس غزوے کی روایت کو پائیدار نہیں کہا جا سکتا۔ (واللہ اعلم)

---

[1] ابو جعفر محمد بن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ھ)، تاریخ طبری، ج ۳ ص ۲۸

[2] علامہ علی نقوی، تاریخ اسلام، ص ۱۷۲

سنہ ۴ ہجری

سریہ ابو سلمہؓ مخزومی

(یکم محرم ۴ ہجری/ ۱۳ جون ۶۲۵ء)

سنہ ۳ ہجری کے آخری ماہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو اطلاع ملی کہ فید کے کوہستانی علاقے قطن میں طلحہ بن خویلد اور اُس کا بھائی سلمہ بن خویلد جو قبیلہ بنو اسد کے سردار تھے اپنی قوم کو مدینہ منوّرہ پر چڑھائی کے لیے جمع کر رہے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اُس فتنے کو ختم کرنے کے لیے یکم محرم ۴ ہجری بمطابق ۱۳ جون ۶۲۵ء کو حضرت ابو سلمہؓ کی قیادت میں ڈیڑھ سو مجاہدین کا ایک سریہ روانہ فرمایا۔ دشمنوں کو اُن کی پیش قدمی کی خبر ہوئی تو منتشر و رُوپوش ہو گئے۔[۱]

سریہ عبداللہ بن انیسؓ

(۵ محرم ۴ ہجری/ ۱۷ جون ۶۲۵ء)

سریۂ ابو سلمہ مخزومی کے فوراً بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو خبر ملی کہ بنو لحیان کا رئیس سفیان بن خالد، عُرنہ میں اہلِ اسلام کے خلاف جنگ کی تیاریوں میں مصروف ہے اور اُس کا ارادہ اس فتنے کو دوسرے قبیلوں تک پھیلانے کا بھی ہے۔ اُس کا منصوبہ کامیاب ہو جاتا تو یقیناً ایک بہت بڑا تصادم ہوتا اور کئی قیمتی جانوں کا ضیاع ہوتا چنانچہ سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اُس شریر کی شرارتوں کو فرو کرنے کے لیے ۵ محرم ۴ ہجری/ ۱۷ جون ۶۲۵ء کے دن حضرت عبداللہ بن انیسؓ کو روانہ کیا۔ عبداللہ بن انیسؓ نے اُس کو واصلِ جہنم کر دیا اور کامیاب واپس لوٹے۔ بروایتے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اُنھیں انعام کے طور پر ایک عصا عطا فرمایا۔[۲]

---

[۱] ڈاکٹر نصیر احمد ناصر، کتاب: پیغمبر اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم، ص ۵۳۲

محمد ابن سعد (متوفی ۲۳۰ ہجری)، طبقات ابن سعد ۲:۵۳۔ ابن قیم، زاد المعاد (اردو) ۲:۱۹۹

[۲] عبدالحق محدث دہلوی، مدارج النبوت ج ۲ ص ۱۹۲۔ ڈاکٹر نصیر احمد، کتاب: پیغمبر اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم، ص ۵۳۳

رجیع کا المیہ

(صفر ۴ ہجری/ جولائی، اگست ۶۲۵ء)

اُحد کے بعد جو دوسرا اندوہناک واقعہ پیش آیا وہ رجیع کا تھا۔[۱] یہ المیہ ہجرت کے چھتیسویں مہینے ماہِ صفر ۴ ہجری میں بمطابق جولائی/ اگست ۶۲۵ء مکّہ اور عسفان کے درمیان حجاز کے نواح میں ہذیل کی طرف پیش آیا۔ اس کو سریۂ رجیع اور سریۂ ابی مرثد الغنویٰ بھی کہتے ہیں۔

عرب قبائل نے، جن کے نام طبرسی نے عضل وریش بیان کیے ہیں اور ابنِ خلدون نے عضل وقارہ (بنوالھون، بنوخزیمہ اور بنواسد) لکھے ہیں،[۲] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے پاس ایک وفد بھیجا اور درخواست کی کہ ہم اسلام لانا چاہتے ہیں اس لیے اپنے کچھ آدمی ہمارے پاس بھیجئے تاکہ وہ ہمیں دینِ اسلام کی تعلیم دیں۔ اُنھیں یہ معلوم ہوگا کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم مکّہ میں تھے تو اسی قسم کی گزارش مدینہ والوں نے بھی کی تھی اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے حضرت مصعب بن عمیرؓ کو اُن کے ہاں بھیج دیا تھا لہٰذا اُنھوں نے سوچا کہ اگر ہم بھی ویسی ہی درخواست کریں تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ضرور قبول فرمالیں گے۔

مؤرّخین کا کہنا ہے کہ جنگِ اُحد میں کافروں کی ایک علمبردار سلافہ بنت سعد زنِ طلحہ بن ابی طلحہ کا شوہر اور بیٹے مارے گئے تھے، اُس نے اعلان کر رکھا تھا کہ جو اُن کے قاتلوں کے سر لائے گا اُسے سو بہترین اُونٹ انعام میں دے گی۔[۳] چنانچہ دشمنِ اسلام وفتنہ گر سفیان بن خالد ہذلی نے لالچ میں آکر ایک سازش تیار کی اور اپنی قوم کے چند لوگوں کو تیار کر کے مدینہ طیبہ کی طرف روانہ کیا جنہوں نے جھوٹ موٹ کا اسلام ظاہر کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے درخواست کی

---

[۱] کے اے حمید، تاریخ مسلمانانِ عالم، ج ص ۷۷

[۲] علامہ علی نقی نقوی، تاریخ اسلام، ص ۲۷۲ بحوالہ طبرسی، تاریخ ابن خلدون (اُردو) حصہ اوّل، ص ۹۵

[۳] عبدالحق محدث دہلوی، مدارج النبوت ج ۲ ص ۱۸۵، جمال الدین محدث، روضۃ الاحباب

کہ صحابہ کی ایک جماعت کو ہمارے ساتھ روانہ کریں تا کہ وہ ہماری قوم کو قرآن کی تعلیم دیں اور اسلامی شعار سکھائیں۔ (شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے مدارج النبوّت میں سفیان بن خالد ہذلی کا نام لکھا ہے جو کہ اس لحاظ سے اشتباہ پیدا کرتا ہے کہ وہ تو ماہِ محرم میں ہونے والے سریہ عبداللہ بن انیس میں مارا جا چکا تھا۔ اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور کے سابق وائس چانسلر ڈاکٹر نصیر احمد ناصر اپنی کتاب میں اس کا نام خالد بن سفیان لکھتے ہیں لیکن ساتھ ہی وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ وہ تو قتل ہو گیا لیکن اُس کے قبیلے والوں یعنی بنی لحیان نے اس کے منصوبے کو عملی جامہ پہنایا۔ واللہ اعلم)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے سات اور بروایتے دس صحابہ رضی اللہ عنہم کو جن کے امیر حضرت عاصم بن ثابت رضی اللہ عنہ یا حضرت مرثد بن ابی مرثد رضی اللہ عنہ تھے روانہ فرمادیا۔ اس جماعت میں شامل صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے نام یہ تھے:

۱۔ حضرت عاصم بن ثابت بن ابی الاقلح رضی اللہ عنہ

۲۔ حضرت مرثد بن ابی مرثد الغنوی رضی اللہ عنہ

۳۔ حضرت عبداللہ بن طارق رضی اللہ عنہ

۴۔ حضرت معتّب بن اسید رضی اللہ عنہ

۵۔ حضرت خالد بن ابی بکر لیثی رضی اللہ عنہ

۶۔ حضرت خبیب بن عدی رضی اللہ عنہ

۷۔ حضرت زید بن الدثنہ بن بیاضہ رضی اللہ عنہ

یہ سات یا دس صحابہ منافقوں کی اُس جماعت کے ساتھ روانہ ہو گئے اور ابھی موضع ''بدہ'' جو عسقان اور مکّہ کے درمیان واقع تھا پہنچے تھے کہ سفیان بن خالد کو خبر ہوئی اور وہ دو سو کافروں کے ساتھ اور بروایتے تین سو تیر اندازوں کے ساتھ نکلا۔ اُسے پتا چلا کہ مسلمان بدہ سے رجیع کی طرف بڑھ چکے ہیں تو وہ اُن کے تعاقب میں دوڑا اور معصوم اور بے خبر مسلمانوں

کوراستے میں جالیا۔ اہل ایمان نے بڑی جوانمردی سے اُن کا مقابلہ کیا لیکن تین سو مسلح غنڈوں کے سامنے جنہوں نے دھوکے سے وار کیا تھا، دس افراد زیادہ دیر تک نہ ٹھہر سکے اور یکے بعد دیگرے راہِ شہادت پر گامزن ہو گئے۔ [۱] بقول قاتلوں کی شدید خواہش تھی کہ حضرت عاصم بن ثابت رضی اللہ عنہ کا سر کاٹ کر سو اُونٹ انعام حاصل کریں لیکن اُن کی یہ آرزو حسرتِ ناتمام بن کے رہ گئی۔ پہلے تو حضرت عاصم رضی اللہ عنہ کی نعش پر شہد کی مکھیوں نے ہجوم کیا جس کی وجہ سے وہ کوشش کے باوجود قریب نہ آسکے پھر موسلا دھار بارش شروع ہو گئی جو اُن کی نعش کو نہ جانے کہاں بہا لے گئی اور یوں اُن کا ارمان پورا نہ ہو سکا۔ [۲]

ایک روایت یہ ہے کہ جب مسلمان مقابلے پر اُتر آئے تو حملہ آوروں نے کہا کہ ہم تمھاری جاں بخشی کرتے ہیں مگر اس شرط پر کہ ہم تمھیں گرفتار کر کے مکّہ لے جائیں گے اور تمھارے بدلے تاوان وصول کریں گے۔ اس پر حضرت مرثد رضی اللہ عنہ اور اُن کے دو ساتھیوں نے انکار کر دیا اور مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہو گئے۔ باقیوں کو اُنھوں نے قید کر لیا اور مکّہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ ایک مجاہد نے راستے میں لڑ کر جان قربان کر دی جب کہ حضرت خبیب اور حضرت زید رضی اللہ عنہما کو اُنھوں نے مکّہ میں لے جا کر قریش کے ہاتھوں فروخت کر دیا۔ [۳]

بروایتے باقی ماندہ کو سفیان بن خالد ہذلی مکّہ لے گیا تھا جنھیں سخت ترین ایذائیں دینے کے بعد پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ حضرت خبیب رضی اللہ عنہ کے گلے میں جب پھانسی کا پھندا ڈالا گیا تو اُنھوں نے چند شعر کہے جن کا ایک ایک لفظ جذبۂ ایمانی سے لبریز تھا۔ اُنھوں نے کہا: [۴]

---

[۱] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۱۸۵ تا ۱۹۰
ڈاکٹر نصیر احمد ناصر، کتاب: پیغمبر اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم، ص ۵۳۳ تا ۵۳۵

[۲] ڈاکٹر نصیر احمد ناصر، کتاب: پیغمبر اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم، ص ۵۳۴

[۳] ابن خلدون (متوفی ۱۴۰۶ء)، تاریخ ابن خلدون، ج ۲ ص ۲۲۸

[۴] کے اے حمید، تاریخ مسلمانانِ عالم، ص ۷۷

میں اس مقتل میں بیڑیوں میں جکڑا ہُوا ہوں

قاتلوں نے مجھے ایک شہتیر کے پاس لا کھڑا کیا ہے

کفّار کا ایک جمِ غفیر میرے گرد جمع ہے

میرا تماشا دکھانے کو عورتیں اور بچّے بھی بلائے گئے ہیں

یہ کہتے ہیں اگر میں کفر اختیار کروں

تو میری جاں بخشی کر دیں گے

میں تو کفر پر موت کو ترجیح دیتا ہوں

میں موت سے نہیں ڈرتا

مگر دوزخ کی آگ سے ڈرتا ہوں

میں ان کے سامنے عاجزی کروں گا اور

نہ ہی روؤں اور چلّاؤں گا

مجھے یقین ہے میں بارگاہِ الٰہی میں حاضر ہونے جا رہا ہوں

اے عرش کے مالک! تُو مجھے اس مصیبتِ کبریٰ میں صبر عطا فرما

ان کافروں نے میرے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے ہیں

اور میں زندگی سے مایوس ہو چکا ہوں

خدا کی قسم! میں اسلام پر فدا ہو رہا ہوں

مجھے اس کی پروا نہیں کہ میں کس پہلو گرتا ہوں

اور کس طرح جان دیتا ہوں

المیہ بئرِ معونہ/سریہ منذر بن عمرو/سریۃ القریٰ
(صفر ۴ ہجری/ جولائی اگست ۶۲۵ء)

سریہ بئر معونہ غزوۂ اُحد کے چار ماہ بعد ہجرت کے چوتھے سال ماہِ صفر میں واقع ہُوا۔ [1] امیرِ سریہ حضرت منذر بن عمرؓو کے نام سے اس کو سریۃ المنذر بن عمرو بھی کہا جاتا ہے۔ سریۃ القریٰ بھی اسی سریہ کو کہتے ہیں جس کی وجہ یہ ہے کہ اس سریے میں شامل اکثر اصحاب کو ''قُرّاء'' یعنی تعلیم یافتہ صحابہ کہا جاتا تھا۔ بئر معونہ بِلادِ ہذیل کے ایک موضع کا نام ہے جو مکّہ اور عسفان کے درمیان ہے۔ اس سریے کی رُوداد سریۂ رجیع سے کافی مماثلت رکھتی ہے۔

روایت ہے کہ قبیلہ نجد و بنی عامر کا ایک شخص ابو براء عامر بن مالک، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت میں حاضر ہُوا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اُسے دعوتِ اسلام دی۔ اُس نے قبولِ اسلام کرنے کی بجائے دِینِ اسلام کی تعریف کی اور کہا میں جانتا ہوں کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کا دِین مبارک اور حنیف (سچا) ہے، میری قوم بہت بڑی ہے اگر آپ (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) صحابہ کی ایک جماعت میرے ہمراہ بھیج دیں تو ممکن ہے کہ وہ دِینِ اسلام کو قبول کرلیں۔

گویا اُس کا مطلب یہ تھا کہ میں تو چاہتا ہوں کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کی دعوت قبول کرلوں لیکن مجھے اپنی قوم کا خیال ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ نجدی سرکشی کریں گے۔ ابو براء نے کہا کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) اس کا اندیشہ نہ فرمائیں میں کسی کو ایسا موقع نہ دوں گا کہ وہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کے صحابہ سے تعرض کریں۔ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ستر اصحاب کو اور بروایتے چالیس کو اور بقولے بیس سے تیس کو اُس کے ہمراہ روانہ کردیا اور امیرِ سریہ حضرت منذر بن عمرؓو کو مقرر فرمایا۔ [2] الغرض خوش کردار حفاظِ قرآن کی وہ جماعت روانہ ہوگئی یہاں تک کہ بئر معونہ نامی کنویں کے پاس پہنچ کر قیام کیا اور اپنے ایک ساتھی حزام بن ملحانؓ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا خط

---

[1] علامہ علی نقی نقوی، تاریخ اسلام، ص ۲۷۴، مراۃ الجنان للیافی مطبوعہ حیدر آباد دکن، ج ا ص ۹

[2] علامہ علی نقی، تاریخ اسلام، ص ۲۷۵، ابو عبداللہ محمد بن عمر واقدی (متوفی ۸۲۲ء)، المغازی للواقدی، ج ا ص ۳۴۷

دے کر وہاں کے سردار عامر بن طفیل کے پاس بھیجا۔ عامر بن طفیل، ابو براء عامر بن مالک کا بھتیجا تھا اور دینِ اسلام کا مخالف اور مسلمانوں کا سخت دشمن تھا۔ حزام بن ملحان رضی اللہ عنہ اُس کے پاس پہنچے تو وہ شقی القلب، قاصدِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھتے ہی آگ بگولا ہو گیا اور تمام سفارتی اُصول اور آداب بالائے طاق رکھتے ہوئے ایک شخص کو اشارہ کیا جس نے عقب سے نیزہ مارا جو اُن کے جسم کے آر پار ہو گیا۔

بروایتے عامر بن طفیل نے خود حضرت حزام رضی اللہ عنہ کو شہید کیا پھر اپنے قبیلے کو اصحابِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جنگ کرنے پر اُکسایا لیکن وہ آمادہ نہ ہوئے کیونکہ وہ جانتے تھے کہ مسلمانوں کی یہ جماعت اس وقت ابو براء کی امان میں ہے۔ پھر عامر بن طفیل نے دیگر قبائل سلیم، عصیہ، رعل اور ذکوان کو ساتھ ملا کر ایک لشکر تیار کیا اور جنگ کے لیے بئر معونہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ مسلمانوں نے بڑی جوانمردی اور ثابت قدمی سے اُن کا مقابلہ کیا لیکن بالآخر سب کے سب شہید ہو گئے۔[1] اُن شہدا کے دو ساتھی عمرو بن اُمیّہ ضمری اور حارث بن صمہ اتفاق سے لڑائی کے وقت اُن کے ساتھ نہیں تھے۔ وہ دونوں کافی دُور چراگاہ میں اُن مویشیوں کو چرا رہے تھے جو وہ اپنے ساتھ لائے تھے۔ اُنھوں نے ایسے پرندوں کو فضا میں منڈلاتے دیکھا جو عموماً لاشوں پر جمع ہو جایا کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ پریشانی کے عالم میں اُس طرف بھاگے اور وہاں پہنچ کر اپنے تمام ساتھیوں کو خاک و خون میں آغشتہ پایا۔ عمرو نے کہا کہ ہمیں جا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خبر کرنی چاہیے مگر حضرت حارث رضی اللہ عنہ نے ساتھ چلنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ میں تو اس سعادت سے محروم نہیں رہوں گا کہ اسی میدان میں لڑتے ہوئے اپنی جان قربان کر دوں جہاں ہمارے ساتھی شہید ہوئے ہیں۔ چنانچہ اُنھوں نے کافروں کو للکارا اور دو کو فی النار کرتے ہوئے خود بھی شہید ہو گئے۔ عمرو بن اُمیّہ ضمری مدینہ نہیں جا سکے اور کافروں کے ہاتھوں اسیر ہو گئے۔ ایک

---

[1] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۱۹۱ تا ۱۹۳

علامہ علی نقی نقوی، تاریخ اسلام، ص ۲۷۵۔ ڈاکٹر نصیر احمد ناصر، کتاب: پیغمبر اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ص ۵۳۶

روایت کے مطابق علامہ طبرسی کا بیان ہے کہ عمرو بن اُمیّہ ضمری ہی نے مدینہ جا کر حضرت پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو اس سانحہ کی اطلاع دی جس کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو بہت صدمہ ہُوا اور مجسمِ ضبط وتحمل، رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم جو اپنے جسم اطہر پر پتھروں کی بارش سہہ کر بھی دشمنوں کے لیے بددُعا نہیں کیا کرتے تھے اُن بے گناہوں کے قتل سے اتنے متاثر ہوئے کہ اُن کا خونِ ناحق بہانے والوں کے نام لے لے کر مدتوں اُن پر لعنت کرتے رہے۔[1]

غزوہٗ بنی نُضیر

(ربیع الاوّل ۴ ہجری/ اگست ستمبر ۶۲۵ ء)

یہ غزوہ ربیع الاوّل ۴ ہجری/ اگست ستمبر ۶۲۵ ء میں پیش آیا۔ یہودیوں کے ایک قبیلے بنونُضیر کے نام کی نسبت سے اس غزوے کو غزوۂ بنونُضیر کہا جاتا ہے۔

شر پسند اور جنگجو بنونُضیر قلعوں میں رہتے تھے اور اُن کے پاس اسلحے کے بڑے بڑے ذخائر تھے۔ میثاقِ مدینہ کے پابند ہونے کے باوجود وہ قریش کے لیے مسلمانوں کی جاسوسی بھی کیا کرتے تھے اور اسی لیے راس المنافقین عبداللہ بن اُبَیّ کے حلیف بھی تھے۔ اسلام اور پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے لیے اُن کا وجود ایک مستقل خطرہ تھا کیونکہ وہ درپردہ سازشوں اور ریشہ دوانیوں میں مصروف رہتے تھے۔ جنگِ اُحد کے بعد وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو شہید کرنے کا منصوبہ بنا رہے تھے کہ اسی دوران میں بنو عامر کے دو اشخاص کے خون بہا کی ادائیگی کے سلسلے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو اُن کے پاس جانا پڑا، کیونکہ بنونُضیر ایک طرف مسلمانوں کے معاہد تھے تو دوسری طرف بنو عامر کے بھی تھے۔ بروایتے بنو عامر کے وہ مقتولین عمرو بن اُمیّہ ضمری کے ہاتھوں قتل ہوئے تھے چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اُن کے پاس تشریف لے گئے تو وہ بظاہر بڑے تپاک سے ملے لیکن

---

[1] علامہ علی نقی نقوی، تاریخ اسلام ص ۲۷۶ بحوالہ طبرسی و ابو عبداللہ محمد بن عمر واقدی (متوفی ۸۲۲ ء)،
المغازی للواقدی مطبوعہ آکسفورڈ یونیورسٹی، ج ۱ ص ۳۴۷

حقیقت میں بہت خوش تھے کہ اُنھیں اپنے ناپاک منصوبے پر عمل کرنے کا ایک سنہری موقع ہاتھ آرہا تھا۔ اُنھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بہت احترام کے ساتھ ایک دیوار کے سائے میں بٹھایا اور ایک شخص عمرو بن حجاش نُضری کو مامور کیا کہ وہ چھت پر چڑھ کر ایک بھاری پتھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر گرائے تاکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شہید ہو جائیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیغمبرانہ بصیرت نے اُن کے ارادے پہچان لیے چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فوراً اُٹھ کھڑے ہوئے اور وہاں سے تشریف لے گئے۔ علامہ طبرسی لکھتے ہیں، ''جبرائیل امین (علیہ السلام) اُترے اور اُنھوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اطلاع دی کہ ان لوگوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف یہ منصوبہ بنایا ہے۔''[۱] ابنِ خلدون نے لکھا ہے، ''اللہ نے بذریعہ وحی اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس کی اطلاع دی۔''[۲]

اپنے اس ناپاک منصوبے میں ناکام ہونے کے بعد اُنھوں نے ایک اور سازش تیار کی جس کا تانا بانا رجیع اور بئر معونہ کے واقعات کی روشنی میں تیار کیا گیا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ نبیِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسلام کی ترویج و تبلیغ کے لیے ہمیشہ کوشاں رہتے ہیں اور اس سلسلے میں کوئی درخواست کی جائے تو اسے رَد نہیں فرماتے لہٰذا اُنھوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں پیغام بھیجا کہ ہم اپنے علمائے دِین کا آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے مناظرہ کرانا چاہتے ہیں اس لیے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اپنے صحابہ کے ساتھ تشریف لے آئیں۔ اگر آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہمارے علما کو لاجواب کر کے اسلام کی حقانیت ثابت کرنے میں کامیاب ہو گئے تو ہم سب مسلمان ہو جائیں گے۔ اُن کے درپردہ عزائم یہ تھے کہ اُن کے آدمی خنجروں وغیرہ سے مسلح ہوں گے جو دورانِ مناظرہ میں یکبارگی حملہ کر کے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو شہید کر دیں گے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس مرتبہ بھی اُن کے مذموم ارادے کی خبر ہو گئی اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اُن کے ہاں تشریف نہیں لے گئے۔

بنونُضیر کی روز افزوں بڑھتی ہوئی فتنہ انگیزیوں سے یہ ثابت ہو گیا تھا کہ وہ مسلمانوں

---

[۱] علامہ علی نقی نقوی، تاریخ اسلام، ص ۲۷۹ بحوالہ طبرسی

[۲] ابن خلدون (متوفی ۱۴۰۶ء)، تاریخ ابن خلدون، ج ۲ ص ۲۷۱

کے ساتھ کیے گئے اپنے تحریری معاہدے سے روگردانی کر رہے ہیں جو صریحاً ایک قسم کی بغاوت تھی۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُن کی بغاوت کو فرو کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

اُدھر بنونُضیر نے بھی مسلمانوں پر حملہ کرنے کا منصوبہ بنالیا، اُنھیں اس منصوبے میں قریش، عبداللہ بن اُبَیّ اور اپنے چند حلیف قبیلوں کی معاونت حاصل تھی۔ ایک قبیلہ بنوقریظہ، بنونضیر کا ہم مذہب تھا۔ بنونُضیر اُس کے ساتھ بھی معاہدہ حلف کرنا چاہتے تھے حال آنکہ وہ پہلے ہی میثاقِ مدینہ کے تحت مسلمانوں کے حلیف تھے لیکن بنونضیر کے ارادوں کے پیشِ نظر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پہل کر کے بنوقریظہ سے تجدید عہد کروالیا اور اس طرح بنونُضیر کو ایک دفعہ پھر منہ کی کھانا پڑی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُن کے خلاف کوئی تادیبی کاروائی کرنے سے پہلے اتمامِ حُجّت کے طور پر کہا کہ اپنے معاہدے کی تجدید کرو لیکن عبداللہ بن اُبی کی شہہ اور مدد کے وعدے پر اُنھوں نے صاف انکار کردیا۔ چنانچہ عہدنامے کی علانیہ خلاف ورزی کرنے پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُنھیں دس دن کے اندر اندر مدینہ سے نکل جانے کا حکم دے دیا۔[1] بروایتے اُنھوں نے یہ حکم منظور کرلیا تھا بلکہ اس پر عمل بھی شروع کردیا تھا لیکن رئیس المنافقین عبداللہ بن اُبی کے بھڑکانے پر انکار کردیا اور جنگ کے لیے قلعہ بند ہوگئے۔[2]

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اُن کی تادیب کے لیے ایک جماعت کو لے کر روانہ ہوئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علم حضرت علی علیہ السلام کو دیا اور قلعے کا محاصرہ کرلیا۔ یہودیوں نے قلعے سے تیر برسانے شروع کردیے، ایک تیر رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خیمے میں بھی آیا جس پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا خیمہ وہاں سے دوسری جگہ منتقل کردیا گیا۔ حضرت علی علیہ السلام اُن تیراندازوں کو سبق سکھانے کے لیے متفکر تھے کہ اُن کے ایک ماہر تیرانداز عزوار اور دو پہلوانوں کو ایک کمین گاہ سے برآمد ہوتے دیکھا۔ شیرِ خدا جناب علی علیہ السلام فوراً اُن پر حملہ آور ہوئے۔ آپ نے عزوار کو قتل کیا اور

---

[1] ڈاکٹر نصیر احمد ناصر، کتاب: پیغمبر اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ص ۵۳۶

[2] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۱۹۶

اُس کا سر لے کر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ باقی دونوں پہلوانوں کو آپ کے ساتھیوں نے جہنم رسید کر دیا۔ اس کے بعد کسی کو قلعے سے نکلنے کی جرأت نہ ہوئی۔

عبداللہ بن اُبی اور حلیف قبیلوں میں سے کسی کو بھی بنونضیر کی مدد کرنے کی ہمت نہ ہوئی اور جب کسی طرف سے کوئی کمک نہ ملی تو محصور رہتے رہتے وہ عاجز آ گئے اور پندرہ روز بعد ہتھیار ڈال کر جلاوطنی پر آمادہ ہو گئے۔ آنحضرت ﷺ نے حضرت محمد بن مسلمہؓ کے ذریعے اُنھیں پیغام بھیجا کہ تین دن کے اندر اندر مدینہ سے نکل جاؤ۔ چنانچہ اُن میں سے کچھ لوگ شام اور وادی القریٰ کی طرف کوچ کر گئے اور باقی خیبر میں جا بسے جن میں اُن کے سردار حیی بن اخطب اور ابورافع بن ابوحقیق وغیرہ بھی شامل تھے۔ بنونُضیر کے مدینہ بدر ہو جانے سے مدینے کا دفاع مضبوط تر ہو گیا اور مسلمانوں کو ایک مہلک مارِ آستین سے نجات مل گئی۔ بروایتے یہ ہجرت کے چھتیس ماہ بعد ربیع الاوّل کا واقعہ ہے۔[1]

غزوۂ ذات الرقاع

(جمادی الاوّل ۴ ہجری/ اکتوبر، نومبر ۶۲۵ء)

یہودی قبیلے بنونُضیر کا فتنہ ابھی ختم ہُوا ہی تھا کہ جمادی الاوّل ۴ ہجری میں بنوغطفان کے جنگجو قبائل، بنی محارب اور بنی ثعلبہ نے سر اُٹھا لیا۔ اُن کا ارادہ مدینہ کو تاخت و تاراج کرنے کا تھا۔ جناب رسولِ خدا ﷺ کو اُن کے ناپاک عزائم کی خبر ہوئی تو آپ ﷺ چار سو اور بروایتے سات سو مجاہدین کے ساتھ اُن کی سرکوبی کے لیے نجد روانہ ہوئے پھر وہاں سے ذات الرقاع پہنچے جہاں وہ تمام شرپسند عناصر جمع تھے۔ جب اُنھیں آنحضرت ﷺ کی آمد کی خبر ہوئی تو وہ فرار ہو گئے اور جنگ کی نوبت نہیں آئی۔[2]

---

[1] سید محسن امین عاملی (متوفی ۱۹۵۳ء)، اعیان الشیعہ، ج ۲ ص ۲۱۱

[2] ڈاکٹر نصیر احمد ناصر، کتاب: پیغمبر اعظم و آخر ﷺ، ص ۵۴۱

ہم پہلے ذِکر کر چکے ہیں کہ ہجرت کے تیسرے سال محرم میں اور بروایتے بارہ ربیع الاوّل کو بھی ایک غزوہ واقع ہُوا تھا جس کو غزوۂ ذی امر، غزوۂ بنی ام، غزوۂ انمار اور غزوۂ غطفان بھی کہا جاتا ہے۔[۱] ذی امر، قبیلہ غطفان کے ایک چشمے کا نام تھا اور اسی نسبت سے ابن سعد نے طبقات میں اس غزوے کا نام غزوۂ غطفان لکھا ہے۔[۲]

اس غزوے میں نجد کے قبیلہ غطفان کے دو گروہوں بنی ثعلبہ اور بنی محارب نے اپنے سردار ''دعشور غطفان'' اور بقولے خطیب بغدادی، ''غواث'' کی سرکردگی میں مدینہ پر حملے کا منصوبہ بنایا۔ وہ لوگ نجد کے علاقے مقام ذی امر میں جمع ہو کر ابھی غارت گری کی تیاریوں میں مصروف تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اُن کے عزائم کی خبر ہوگئی اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم محرم ۳ ہجری/ جون ۶۲۴ء میں چارسو اور بقولے چارسو پچاس مجاہدین کے ساتھ اُن کی سرکوبی کے لیے نجد تشریف لے گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی غیر متوقع پیش قدمی سے وہ لوگ گھبرا کر بھاگ گئے اور پہاڑوں میں رُوپوش ہوگئے۔ غزوۂ ذی امر، غزوۂ بنی ام، غزوۂ انمار یا غزوۂ غطفان وغیرہ (یہ ایک ہی مہم کے نام ہیں، اس کا مفصل ذکر اُوپر آچکا ہے) اور غزوہ ذات الرقاع کے حالات وواقعات اور کردار یعنی قبیلے ایک ہی ہیں۔ تاریخ میں ان دونوں غزوات کا ذِکر آیا ہے۔ ہوسکتا ہے دونوں غزوات دراصل ایک ہی ہوں جنھیں مختلف ناموں کے ساتھ مختلف مؤرّخین نے بیان کیا ہو یا واقعی دونوں غزوے الگ الگ ہوں۔ (واللہ اعلم)

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّاٰلِ مُحَمَّدٍ ○

---

[۱] ابن ہشام، سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ شیخ عبد الحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۱۴۶

[۲] سید محسن امین عاملی (متوفی ۱۹۵۳ء)، اعیان الشیعہ، ج ۲ ص ۱۷۸، علامہ علی نقی نقوی، تاریخ اسلام ص ۲۱۹

ولادتِ امام حسین علیہ السلام

۳شعبان ۴ ہجری (۷ جنوری ۶۲۶ء)

اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور کے سابق وائس چانسلر ڈاکٹر نصیر احمد ناصر لکھتے ہیں، ''یوں تو سارے بچّے ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو پیارے تھے لیکن حضرت فاطمۃ الزہراء (علیہا السلام) اور حضرت علی (علیہ السلام) کی طرح اُن کی اولاد بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو سب سے زیادہ محبوب تھی۔ اس حوالے سے سنہ ۴ ہجری کا اہم واقعہ ۵ شعبان کو حضرت امام حسین (علیہ السلام) کی ولادتِ سعید ہے جن کی قسمت میں شہادتِ عظمیٰ لکھی تھی۔ [1] شبلنجی لکھتے ہیں کہ ولادت کے بعد رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے امام حسین علیہ السلام کی آنکھوں میں لعاب دہن مبارک لگایا اور اپنی زبان اُن کے منہ میں دے کر بڑی دیر تک چساتے رہے، اس کے بعد دائیں کان میں اذان اور بائیں میں اقامت کہی پھر دُعائے خیر فرما کر حُسین نام رکھا۔ [2] حسین (علیہ السلام) نام رکھنے کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے حضرت فاطمہ علیہا السلام سے فرمایا کہ بیٹی جس طرح حسن (علیہ السلام) کا عقیقہ کیا گیا تھا اُسی طرح حسین (علیہ السلام) کے عقیقے کا بھی انتظام کرو اور جس طرح حسن (علیہ السلام) کے بالوں کے ہم وزن چاندی تصدق کی گئی تھی اُسی طرح حسین (علیہ السلام) کے بالوں کے ہم وزن چاندی تصدق کرو۔ چنانچہ ایک مینڈھا منگوایا گیا اور رسمِ عقیقہ ادا کی گئی۔ [3]

علامہ نجم الحسن کراروی بحوالہ علامہ حسین واعظ کاشفی لکھتے ہیں کہ امام حسین علیہ السلام کی ولادت کے بعد خلاقِ عالم نے جبرائیل علیہ السلام کو حکم دیا کہ زمین پر جا کر میرے حبیب محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو میری طرف سے حسین (علیہ السلام) کی ولادت پر مبارکباد دو اور ساتھ ہی اُن کی

---

[1] ڈاکٹر نصیر احمد ناصر، کتاب: پیغمبر اعظم وآخر صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم، ص ۵۳۶

[2] علامہ نجم الحسن کراروی، چودہ ستارے ص ۲۱۳ بحوالہ نور الابصار، ص ۱۱۳

[3] علامہ نجم الحسن کراروی، چودہ ستارے ص ۲۱۳ بحوالہ مطالب السؤل، ص ۲۱۳

شہادتِ عظمٰی سے بھی اُنھیں مطلع کرکے تعزیت ادا کرو۔ جناب جبرائیل علیہ السّلام بحکمِ ربِّ جلیل زمین پر وارد ہوئے اور اُنھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت میں پہنچ کر تہنیت اور تعزیت پیش کی۔ [1]

اُمّ الفضل رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ ایک دن میں بچّے کو لے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اُسے آغوش میں لے کر پیار کیا اور پھر رونے لگے۔ میں نے رونے کا سبب پوچھا تو فرمایا کہ ابھی ابھی جبرائیل میرے پاس آئے اور بتایا کہ یہ بچّہ اُمت کے ہاتھوں نہایت ظلم وستم سے شہید ہوگا۔ اور اے اُمّ الفضل وہ مجھے اِس کے مقتل کی سُرخ مٹی بھی دے گئے ہیں۔ [2] پھر فرمایا کہ یہ بات فاطمہ (علیہا السّلام) سے کوئی نہ کہے ورنہ وہ سخت پریشان ہوں گی۔ ملّا جامی لکھتے ہیں کہ اُمّ المومنین حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا نے بیان کیا کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم میرے گھر اس حال میں تشریف لائے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے سرِ مبارک کے بال بکھرے ہوئے تھے اور چہرے پر گرد پڑی ہوئی تھی۔ میں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو اس پریشان حالی میں دیکھ کر پوچھا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم! کیا بات ہے؟ فرمایا، ابھی ابھی جبرائیل مجھے عراق کے مقام کربلا میں لے گئے تھے اور وہاں میں نے حسین کا مقتل دیکھا۔ میں اُس جگہ سے یہ مٹی لایا ہوں۔ اے اُمّ سلمہ! اسے اپنے پاس محفوظ رکھو، جب یہ خون ہوجائے تو سمجھنا کہ میرا حسین شہید ہوگیا۔ [3] امام حسین علیہ السّلام ۱۰ محرم (۶۱ ہجری) کو کوفہ ودجلہ کے درمیان کربلا کے میدان میں شہید ہوئے۔ [4] آپ کو ابوالائمہ ثانی بھی کہا جاتا ہے کیونکہ آپ کی نسلِ پاک سے نو امام (علیہم السّلام) متولّد ہوئے۔

---

[1] علامہ نجم الحسن کراروی، چودہ ستارے ص ۲۱۴

[2] مشکوٰۃ ج ۸ ص ۱۴۰ طبع لاہور۔ مسند امام رضا ص ۳۸

[3] مولانا نورالدین عبدالرحمٰن جامیؒ (متوفی ۱۴۹۲ء)، شواہد النبوت، ص ۱۷۴

[4] اکمال فی اسماء الرجال در مشکوٰۃ (اردو) ج ۳ ص ۳۳۶

رضاعتِ امام حسین علیہ السلام

روایت ہے کہ امام حسین علیہ السلام نے ولادت کے بعد کبھی اپنی والدہ محترمہ یا کسی دایہ کا دُودھ نوش نہیں کیا۔ جب آپ بھوکے ہوتے تو جناب سرورِ انبیا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لاتے اور اپنی زبانِ مبارک آپ کے دہنِ اقدس میں دے دیتے اور آپ اُسے چوستے رہتے یہاں تک کہ سیر وسیراب ہو جاتے۔ پس معلوم ہونا چاہیے کہ آپ کی پرورش لعاب دہنِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ہوئی اور یہی وجہ ہے کہ آپ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بہت مشابہ تھے۔[1]

شہزادوں کے نام حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود رکھے

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں،" جب حسن (علیہ السلام) پیدا ہُوئے تو اُن کا نام حمزہ رکھا گیا اور جب حسین (علیہ السلام) پیدا ہُوئے تو اُن کا نام اُن کے چچا کے نام پر جعفر رکھا گیا۔ مجھے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بُلا کر فرمایا کہ مجھے اِن کے نام تبدیل کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ اللہ اور اُس کا رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بہتر جانتے ہیں۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُن کے نام حسن (علیہ السلام) اور حسین (علیہ السلام) رکھے۔"[2]

حسنین علیہم السلام کے نام اللہ نے حجاب میں رکھے تھے

مفضل سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حسن اور حسین (علیہم السلام) کے ناموں کو حجاب میں رکھا یہاں تک کہ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے بیٹوں کا نام حسن اور حسین (علیہم السلام) رکھا۔[3]

---

[1] علامہ نجم الحسن کراروی، چودہ ستارے ص ۲۱۴ بحوالہ نورالابصار ص ۱۱۳

[2] احمد بن حنبل، المسند ۱:۱۵۹۔ ابو یعلیٰ (متوفی ۹۱۹ھ)، المسند، ۱:۳۸۴۔ حاکم، المستدرک، ۴:۳۰۸ ابن عساکر (متوفی ۱۱۷۵ء)، تاریخ دمشق الکبیر ۷:۱۱۶۔ ذہبی، سیر اعلام النبلاء ۳:۲۴۷

[3] علی بن محمد ابن اثیر الجزری (متوفی ۸۳۸ھ)، اسد الغابۃ فی معرفۃ الصحابۃ ۲:۲۵ النووی، تہذیب الاسماء ۱:۲۸

حسنین علیہم السلام کے نام اہلِ جنّت کے نام ہیں

عمران بن سلیمان سے روایت ہے کہ حسن اور حسین (علیہم السلام) اہلِ جنّت کے ناموں میں سے دو نام ہیں جو کہ دَورِ جاہلیت میں پہلے کبھی نہیں رکھے گئے۔[۱]

نبی اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا حسنین علیہم السلام میرے بیٹے ہیں

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حسن و حسین (علیہم السلام) کا ہاتھ پکڑا اور فرمایا ''یہ میرے بیٹے ہیں۔''[۲]

نبی اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا میں ہی اِن کا نسب ہوں

سیّدۃُ نساء العالمین فاطمۃ الزہراء علیہا السلام سے مروی ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ہر عورت کے بیٹوں کا خاندان ہوتا ہے جس کی طرف وہ منسوب ہوتے ہیں ماسوائے فاطمہ (علیہا السلام) کی اولاد کے۔ پس میں ہی اُن کا ولی ہوں اور میں ہی اُن کا نسب ہوں۔[۳]

حضرت جابر بن عبداللہ انصاری رضی اللہ عنہ سے بھی منقول ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ہر ماں کے بیٹوں کا آبائی خاندان ہوتا ہے جس کی طرف وہ منسوب ہوتے ہیں سوائے

---

[۱] ابن حجر مکی (متوفی ۹۷۴ھ)، الصواعق المحرقۃ ۱۶۲

علی بن محمد ابن اثیر الجزری (متوفی ۸۳۸ھ)، اسد الغابۃ فی معرفۃ الصحابۃ ۲:۲۵

[۲] ذہبی، سیر اعلام النبلاء ۳: ۲۸۴۔ حافظ دیلمی (متوفی ۵۵۸ ہجری)، کتاب الفردوس، ۴: ۳۳۶

ابن جوزی، صفوۃ الصفوہ ۱: ۷۶۳

[۳] حافظ ابی القاسم سلیمان بن احمد طبرانی (متوفی ۳۶۰ ہجری)، المعجم الکبیر ۲۲: ۴۲۳

ابویعلیٰ (۹۱۹ ہجری)، المسند ۱۲: ۱۰۹۔ ہیثمی، مجمع الزوائد ۴: ۲۲۴۔ حافظ دیلمی (متوفی ۵۵۸ھ)، کتاب الفردوس ۳: ۲۶۴۔ خطیب بغدادی (متوفی ۱۰۷۱ء)، تاریخ بغداد ۱۱: ۲۸۵۔ عجلونی، کشف الخفا ۲: ۱۵۷

فاطمہ (علیہا السلام) کے بیٹوں کے۔ پس میں ہی اُن کا ولی اور میں ہی اُن کا نسب ہوں۔ [1]

حضرت عمر بن خطابؓ سے روایت ہے کہ میں نے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ ہر عورت کے بیٹوں کی نسبت اُن کے باپ کی طرف ہوتی ہے ماسوائے فاطمہ (علیہا السلام) کی اولاد کے، کہ میں ہی اُن کا نسب ہوں اور میں ہی اُن کا باپ ہوں۔ [2]

حضرت عمر بن خطابؓ ہی سے منقول ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ قیامت کے دن میرے حسب ونسب کے سوا ہر سلسلہ منقطع ہوجائے گا۔ ہر بیٹے کی باپ کی طرف نسبت ہوتی ہے ماسوائے اولادِ فاطمہ (علیہا السلام) کے کیونکہ اُن کا باپ بھی میں ہوں اور اُن کا نسب بھی میں ہی ہوں۔ [3]

نبی اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے امام حسن علیہ السلام اور امام حسین علیہ السلام کی مشابہت

حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ لوگوں میں حسین علیہ السلام سے زیادہ کوئی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مشابہت نہیں رکھتا تھا۔ [4] حضرت ابوجحیفہ سے روایت ہے کہ میں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھا ہے، حسن بن علی علیہ السلام آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مشابہ تھے۔ [5]

حضرت علی علیہ السلام فرماتے ہیں کہ حسن علیہ السلام سینے سے سر تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

---

[1] حاکم، المستدرک ۳:۱۷۹۔ ابویعلیٰ (۹۱۹ ہجری)، المسند ۲:۱۰۹
حافظ ابی القاسم سلیمان بن احمد طبرانی (متوفی ۳۶۰ ہجری)، المعجم الکبیر ۳:۴۴

[2] حافظ ابی القاسم سلیمان بن احمد طبرانی (متوفی ۳۶۰ ہجری)، المعجم الکبیر ۳:۴۴
ہیثمی، مجمع الزوائد ۴:۲۲۴۔ شوکانی، نیل الاوطار ۶:۱۳۹۔ صنعانی، سبل السلام

[3] احمد بن حنبل، فضائل الصحابہ ۲:۶۲۶۔ حافظ ابی القاسم سلیمان بن احمد طبرانی (متوفی ۳۶۰ ہجری)، المعجم الاوسط ۶:۳۶۷۔ حافظ ابی القاسم سلیمان بن احمد طبرانی (متوفی ۳۶۰ ہجری)، المعجم الکبیر ۳:۴۴۔ حسینی، البیان والتعریف ۲:۱۴۵۔ بیہقی، السنن الکبریٰ ۷:۶۴۔ ہیثمی، مجمع الزوائد ۴:۲۷۲

[4] جامع ترمذی ج ۲ حدیث نمبر ۳۵۴۶

[5] جامع ترمذی ج ۲ حدیث نمبر ۳۵۴۷

کے سب سے زیادہ مشابہ تھے اور حسین علیہ السلام سینے سے نیچے تک۔[1]

حضرت علی علیہ السلام ہی سے روایت ہے کہ جس شخص کی یہ خواہش ہو کہ وہ لوگوں میں ایسی ہستی کو دیکھے جو چہرے سے گردن تک حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سب سے کامل شبیہ ہو تو وہ حسن بن علی (علیہ السلام) کو دیکھ لے اور جس شخص کی یہ خواہش ہو کہ وہ لوگوں میں ایسی ہستی کو دیکھے جو گردن سے ٹخنوں تک رنگت اور صورت دونوں میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سب سے کامل شبیہ ہو تو وہ حسین بن علی (علیہ السلام) کو دیکھ لے۔[2]

حسنین علیہم السلام وارثانِ اوصافِ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں

جناب خاتونِ جنّت سیّدہ فاطمہ زہراء علیہا السلام سے روایت ہے کہ وہ اپنے بابا حضور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مرض الوصال کے دوران میں حسن علیہ السلام اور حسین علیہ السلام کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس لائیں تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ حسن (علیہ السلام) میری ہیّبت وسرداری کا وارث ہے اور حسین (علیہ السلام) میری جرأت وسخاوت کا۔[3]

حسنین علیہم السلام تمام جنّتی جوانوں کے سردار ہیں

امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام سے روایت ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، حسن (علیہ السلام) اور حسین (علیہ السلام) تمام جوانانِ جنّت کے سردار ہیں۔[4]

حضرت ابوسعید خُدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، حسن (علیہ السلام) اور حسین (علیہ السلام) جنتی جوانوں کے سردار ہیں۔[5] یہ حدیثِ مبارکہ متعدد صحابہ کرام سے متعدد احادیث کی کتب میں روایت کی گئی ہے۔

---

[1] جامع ترمذی ۵:۶۶۰۔ احمد بن حنبل، المسند ۱:۹۹۔ ابن حبان، الصحیح ۱۵:۴۳۰

[2] حافظ ابی القاسم سلیمان بن احمد طبرانی (متوفی ۳۶۰ ہجری)، المعجم الکبیر ۳:۹۵

[3] ابن حجر مکی، الصواعق المحرقۃ ۲:۵۶۰۔ طبرانی، المعجم الکبیر ۲۲:۴۲۳۔ شوکانی، در السحابہ ۳۱۰

[4] بزار، المسند ۳:۱۰۲۔ طبرانی، المعجم الکبیر ۳:۳۶۔ ہیثمی، مجمع الزوائد ۹:۱۸۲

[5] ترمذی، ۵:۶۵۶۔ نسائی، السنن الکبریٰ ۵:۵۰۔ احمد بن حنبل، المسند ۳:۳۔ حاکم، المستدرک ۳:۱۸۲

حسنین علیہم السلام سے محبت کرنا واجب ہے

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، جس نے مجھ سے محبت کی اُس پر لازم ہے کہ وہ اِن دونوں (حسن اور حسین علیہم السلام) سے بھی محبت کرے۔[1]
یہ حدیث مبارکہ کئی جلیل القدر صحابہ کرامؓ سے متعدد کتبِ احادیث میں روایت کی گئی ہے۔

حسنین علیہم السلام سے بغض رکھنے والا مبغوض ہے

سلمان فارسی رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ جس نے حسن وحسین (علیہم السلام) سے بغض رکھا اُس نے مجھ سے بغض رکھا اور جس نے مجھ سے بغض رکھا وہ اللہ کے ہاں مبغوض ہو گیا اور جو اللہ کے ہاں مبغوض ہُوا اُسے اللہ نے آگ میں داخل کر دیا۔[2]

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حسنین علیہم السلام کی خاطر منبر سے نیچے تشریف آوری

حضرت ابوبریدہؓ سے روایت ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم (مسجد میں جمعے کا) خطبہ ارشاد فرما رہے تھے کہ اتنے میں حسنین کریمین علیہم السلام تشریف لائے، اُنھوں نے سرخ رنگ کی پوشاکیں پہنی ہوئی تھیں اور وہ (صغر سنی کی وجہ سے) لڑکھڑا کر چل رہے تھے۔ حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم (اُنھیں دیکھ کر) منبر سے نیچے تشریف لائے، دونوں شہزادوں کو اُٹھایا اور اپنے سامنے بٹھالیا۔ پھر فرمایا میں نے اِن بچّوں کو لڑکھڑا کر چلتے دیکھا تو مجھ سے رہا نہ گیا حتیٰ کہ میں نے اپنی بات کاٹ کر انھیں اُٹھالیا۔[3]

حسنین علیہم السلام پشتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نماز ادا کر رہے

---

[1] نسائی، السنن الکبریٰ ۵: ۵۰۔ ابن خزیمہ، الصحیح ۲: ۴۸۔ ہیثمی، مجمع الزوائد ۹: ۱۷۹

[2] حاکم، المستدرک ۳: ۱۸۱۔ ابی القاسم سلیمان بن احمد طبرانی (متوفی ۳۶۰ھ)، المعجم الکبیر ۳: ۵۰

[3] ترمذی ۵، الجامع الصحیح: ۶۵۸۔ نسائی، السنن ۳: ۱۹۲۔ احمد بن حنبل، المسند ۵: ۳۴۵۔ ابن کثیر تفسیر القرآن

تھے تو حسن و حسین علیہم السلام آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پشتِ مبارک پر سوار ہو گئے۔ لوگوں نے اُن کو منع کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اِن کو چھوڑ دو، اِن پر میرے ماں باپ قربان ہوں۔[1] یہ حدیث مبارکہ کئی مشہور و معروف کتب میں الفاظ کی کمی بیشی کے ساتھ متعدد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے روایت کی گئی ہے لیکن مفہوم سب کا تقریباً ایک جیسا ہی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طوالتِ سجدہ

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سجدے میں ہوتے تو حسن یا حسین علیہم السلام آتے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کمرِ مبارک پر سوار ہو جاتے جس کے باعث آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سجدوں کو لمبا کر لیتے۔ ایک موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا گیا کہ کیا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سجدوں کو طویل کر دیا ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ مجھ پر میرا بیٹا سوار تھا اس لیے جلدی کرنا (سجدے سے سر اٹھانا) مجھے اچھا نہ لگا۔[2]

کیا اچھے سوار ہیں

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے حسن و حسین (علیہم السلام) کو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کندھوں پر (سوار) دیکھا تو حسرت بھرے لہجے میں کہا کہ آپ کے نیچے کتنی اچھی سواری ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جواب میں ارشاد فرمایا، ''ذرا یہ بھی دیکھو کہ سوار کتنے اچھے ہیں۔''[3]

احمد بن حنبل نے ''المسند'' میں اور حاکم نے ''المستدرک'' میں اس حدیث کو حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے۔

---

[1] طبرانی، المعجم الکبیر ۳:۴۷۔ ابن حبان، الصحیح ۱۵:۴۲۶۔ ابن ابی شیبہ، المصنف ۶:۳۷۸

[2] ابویعلیٰ (۹۱۹ھ)، المسند ۶:۱۵۰۔ ہیثمی، مجمع الزوائد ۹:۱۸۱

[3] بزار، المسند ۱:۴۱۸۔ ہیثمی، مجمع الزوائد ۹:۱۸۱۔ شوکانی، در المسحابہ فی مناقب القابۃ والصحابہ ۳۰۸۔ ابن عدی، الکامل ۲:۳۶۲

حُرمتِ شراب

بروایتے ۴ ہجری میں اور بقولے ۶ ہجری میں اور ایک قول کے مطابق ۸ ہجری میں شراب کو حرام قرار دیا گیا۔[۱] اسلام سے پہلے لوگ کئی طرح کی بُری عادات میں اس طرح مبتلا تھے کہ وہ بُری عادتیں معاشرے کا ایک جزوِ لاینفک بن کر رہ گئی تھیں۔ رسولِ گرامی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُس معاشرتی بگاڑ کو سنوارنے کے لیے اور اُن عادتوں کے تدارک کے لیے ایک حکیمِ حاذق کی طرح بیماری کی نوعیت کے حساب سے قوم کو علاج فراہم کیا۔ یہ ایک طے شدہ حقیقت ہے کہ عادات کو ترک کرنا آسان نہیں ہوتا جب کہ نشے جیسی عادت کو چھوڑنا تو مشکل ترین عوامل میں سے ایک ہے۔ شراب نوشی کی عادت اسلام سے پہلے عرب معاشرے میں اس طرح سرایت کر چکی تھی کہ معزز طبقے کے اکثر لوگوں میں اس کا استعمال جمالیاتی ذوق کا آئینہ دار سمجھا جانے لگا۔ چنانچہ اس شیطانی تصور کو ذہنوں سے مٹانے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مرحلہ وار ذہنی تربیت کا آغاز کیا اور لوگوں پر یہ حقیقت آشکار کی کہ شراب جمیل نہیں بلکہ کریہہ ہے لہٰذا اسے جمالیاتی ذوق کا آئینہ دار سمجھنا محض فریبِ نظر ہے۔ جیسا کہ ارشادِ خداوند متعال ہُوا:[۲]

وَمِنْ ثَمَرٰتِ النَّخِيْلِ وَالْاَعْنَابِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْهُ سَكَرًا وَّرِزْقًا حَسَنًا ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ ﴿۶۷﴾

(کھجور اور انگور کے پھلوں سے بھی جن سے تم نشہ آور عرق بھی بنا لیتے ہو اور بہترین رزق بھی ہیں یقیناً اس میں ایک نشانی ہے اُن لوگوں کے لیے جو عقل سے کام لیتے ہیں) یعنی کھجور اور انگور کے پھلوں سے جو تم نشہ آور عرق بنا لیتے ہو اُس سے بہتر رزق بھی موجود ہے اگر تم سمجھ سکو تو اور اس میں عقل والوں کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں۔

اس آیت مبارکہ کے ذریعے اُن لوگوں پر جو شراب کو ایک جمیل اور لطیف شے سمجھتے

---

[۱] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۲۰۳

[۲] سورۃ النحل، آیت ۶۷

تھے یہ واضح کر دیا کہ یہ جمیل ہے اور نہ لطیف بلکہ ایک نشہ آور عرق ہے جو عقل و دانش کو گمراہی کے اندھیروں میں دھکیل دیتا ہے جب کہ لطیف و حسین اور بہترین رزق تو کچھ اور ہے جسے وہی جان سکتے ہیں جو عقل والے ہیں۔ اس کی صراحت کے لیے قرآن حکیم نے واضح تراکیب و اسالیب کے ذریعے یوں سمجھایا:[1]

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ؕ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ۫ وَ اِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ؕ (اے نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم!) لوگ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) سے شراب اور جوئے سے متعلق دریافت کرتے ہیں، کہہ دیجئے کہ ان میں بڑا نقصان (یا گناہ) ہے اگرچہ ان میں لوگوں کے لیے کچھ فائدے بھی ہیں مگر ان کا نقصان (یا گناہ) ان کے فائدے سے بہت بڑا ہے)

یعنی اب یہ بتایا کہ اگرچہ شراب میں کچھ لوگوں کے لیے چند فوائد بھی ہیں لیکن سمجھ لو کہ یہ کام ہے نقصان اور گناہ کا، اب تمھاری مرضی کہ تھوڑے سے فائدے کے لیے بڑے نقصان یا گناہ کا سودا کرو یا اس سے بچو۔ بالفاظ دیگر ایک کوڑھ مغز اور بدذوق شخص ہی تھوڑے سے فائدے پر بہت بڑے نقصان کو ترجیح دے گا۔ ایسا شخص اہلِ دانش میں شمار ہوسکتا ہے نہ اہلِ ذوق میں۔

تیسرے مرحلے پر مسلمانوں پر یہ پابندی لگا دی کہ خبردار! تمھیں اس کی اجازت نہیں کہ کسی قسم کا نشہ کرو اور پھر نشے کی حالت میں نماز کے قریب جاؤ، چنانچہ ارشادِ خالق ہُوا:[2]

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ....

(اے ایمان والو! نماز کے قریب مت جاؤ جب تم نشے کی حالت میں ہو یہاں تک کہ (نشہ اُتر جائے اور) تمھیں معلوم ہو کہ تم کیا کہہ رہے ہو....الخ) یہ پابندی کوئی معمولی نہیں تھی۔ اس سے ترکِ نماز کا ارتکاب ہوتا تھا جو کہ ایک گناہِ کبیرہ ہے۔

---

[1] سورۃ البقرہ، آیت ۲۱۹

[2] سورۃ النساء، آیت ۴۳

چوتھے اور آخری مرحلے پر شراب نوشی کو ایک شیطانی عمل قرار دے کر اس سے صریحاً منع فرمادیا، پس خداوند متعال نے بڑی وضاحت کے ساتھ فرمادیا:[1]

اِنَّمَا يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ﴿۹۱﴾ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاحْذَرُوْا ۚ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ﴿۹۲﴾ لَيْسَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِيْمَا طَعِمُوْٓا اِذَا مَا اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاَحْسَنُوْا ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۹۳﴾

(شیطان تو بس یہی چاہتا ہے کہ تمھارے درمیان شراب اور جوئے کے ذریعے بغض وعداوت ڈالے، اور تمھیں اللہ کی یاد اور نماز سے باز رکھے (روکے)۔ کیا اب تم (ان چیزوں سے) باز آؤ گے؟ اور اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اور (نافرمانی سے) بچتے رہو اور اگر تم نے روگردانی کی تو پھر تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ ہمارے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ذمہ تو صرف واضح طور پر (ہمارا پیغام) پہنچا دینا ہے اور بس۔ جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کیے اُن پر اس میں کوئی گناہ نہیں کہ جو وہ (پہلے) کھا پی چکے ہوں، البتہ (اب) پرہیز کریں اور ایمان لائیں اور نیک عمل کریں، اور اس ایمان و پرہیز پر قائم وثابت قدم بھی رہیں اور تمام برے کاموں سے پرہیز کرتے رہیں اور نیکیاں کرتے رہیں اور اللہ نیک عمل کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔)

مندرجہ بالا احکاماتِ الٰہی سورۃ المائدہ کی متواتر تین آیات کے ہیں جن میں پروردگار نے تسلسل کے ساتھ فرمایا کہ:

ا۔ شیطان تو یہی چاہتا ہے کہ تمھارے درمیان شراب وغیرہ کے ذریعے بغض وعداوت ڈالے اور تمھیں اللہ کی یاد اور نماز سے باز رکھے۔

---

[1] سورۃ المائدہ، آیت ۹۱ تا ۹۳

یوں شراب نوشی کو ایک شیطانی فعل قرار دیتے ہوئے آگاہ کیا کہ یہ بغض وعداوت کا سبب بھی ہے اور اللہ کی یاد سے غافل کرنے کا ذریعہ بھی۔

۲۔ پھر فرمایا کہ کیا یہ جان لینے کے بعد تم ایسی بُری چیز سے باز آؤ گے؟ اور میں اور میرا رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم جو تمھیں اس سے منع کرتے ہیں تو کیا تم ہماری اطاعت کرو گے اور ہماری نافرمانی سے بچتے رہو گے؟

۳۔ اس کے بعد تنبیہ کردی کہ اگر تم باز نہ آئے اور نافرمانی کی تو تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا کام تو صرف واضح طور پر ہمارا پیغام پہنچا دینا ہی ہے اور بس۔

یعنی اُن کا کام تھا کہ ہمارے پیغام کے ذریعے تمھیں اچھے بُرے کی تمیز کرا دینا اب تمھاری مرضی کہ اس پر عمل کر کے صالح اور پرہیز گار بندوں میں شامل ہو جاؤ یا نافرمان اور گمراہ لوگوں میں شامل ہو کر اللہ کی ناراضی کا سامنا کرو۔

۴۔ ساتھ ہی یہ وضاحت بھی فرمادی کہ جو لوگ ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کیے اُن پر اُس میں کوئی گناہ نہیں جو وہ پہلے کھا پی چکے ہوں البتہ اب پرہیز کریں، ایمان لائیں، نیک عمل کریں، پھر اس ایمان اور پرہیز پر قائم اور ثابت قدم بھی رہیں اور آئندہ تمام بُرے کاموں سے بچتے رہیں اور نیکیاں کرتے رہیں کیونکہ اللہ نیک عمل کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

مطلب یہ کہ، اہلِ ایمان اس حکم سے پہلے اگر شراب نوشی کرتے رہے ہیں تو اُس پر اُنھیں کوئی گناہ نہیں ہوگا البتہ یہ ضروری ہے کہ وہ آئندہ اس سے اجتناب کریں اور ثابت قدم رہیں کیونکہ اللہ اُن ہی لوگوں کو دوست رکھتا ہے جو پرہیز گار اور عملِ صالح کرنے والے ہوتے ہیں۔

اب اتنی وضاحت اور صراحت کے باوجود بھی اگر کوئی یہ کہے کہ قرآن میں کہیں شراب کی ممانعت نہیں کی گئی تو ایسے لوگوں کی عقل پر ماتم کرنے کے سوا اور کیا کیا جا سکتا ہے؟

حضرت اُمّ سلمہؓ سے نکاح

(شوال ۴ ہجری/ مارچ ۶۲۶ء)

جناب رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شوال ۴ ہجری میں حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا سے نکاح فرمایا۔[۱]

غزوۂ بدر الموعد یا بدر الاُخریٰ

(ذیقعد ۴ ہجری/ اپریل ۶۲۶ء)

جنگِ اُحد کے اختتام پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سالارِ قریش ابوسفیان نے چیلنج دیا تھا کہ اگلے سال بدر کے میدان میں پھر مقابلہ ہوگا۔[۲] رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُس کی دعوتِ مبارزت کو قبول کرلیا تھا چنانچہ اُسی للکار کے جواب میں یکم ذیقعدہ کو ہجرت کے ۴۵ ماہ بعد[۳] اور بروایتے ماہِ شعبان میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لشکرِ اسلام کے ساتھ بدر کی طرف روانہ ہوئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لشکر کا علم حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کو دیا۔[۴] ابوسفیان بھی غالباً اس خیال سے کہ جنگِ اُحد کی ہولناکیوں کے بعد مسلمانوں کو جنگ کی ہمت نہیں ہوگی اور وہ بدر میں نہیں آئیں گے اور یوں ہم بغیر لڑے ہی کامیاب وکامران ہوجائیں گے، اپنی فوج لے کر مکّہ سے نکلا۔ ظہران پہنچ کر اُسے اپنے مخبروں سے اطلاع ملی کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنا لشکر لے کر کوچ کر چکے ہیں اور جنگ کے لیے بالکل تیار ہیں تو اُس کی اُمیدوں پر پانی پھر گیا، اُسے پیش قدمی کی جرأت نہ ہوئی اور وہیں سے واپس پلٹ گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بدر میں ایک ہفتہ تک قیام فرمایا اور سولہ (۱۶) دن بعد مدینہ طیّبہ واپس تشریف لائے۔[۵]

---

[۱] ڈاکٹر نصیر احمد ناصر، کتاب: پیغمبر اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ص ۵۴۲

[۲] ابوجعفر محمد بن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ھ)، تاریخ طبری، ج ۲ حصہ اوّل ص ۱۸۸

[۳] محمد بن عمر واقدی (متوفی ۸۲۲ء)، المغازی للواقدی ص ۳۴۸۔ علامہ علی نقی نقوی، تاریخ اسلام ص ۲۸۱

[۴] محمد بن عمر واقدی، المغازی للواقدی ص ۳۸۴۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۲۰۸

[۵] علامہ علی نقی نقوی، تاریخ اسلام، ص ۲۸۲

وفات حضرت فاطمہ بنت اسد علیہا السلام

(۴ یا ۵ ہجری/ سنہ ۶۲۶ ء)

ہجرت کے چار یا پانچ سال بعد سنہ ۶۲۶ ء میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ماں بن کر پالنے والی عظیم ہستی حضرت فاطمہ بنت اسد علیہا السلام بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو داغِ مفارقت دے گئیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اُن کی وفات سے بہت صدمہ پہنچا۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ جب حضرت فاطمہ بنت اسد علیہا السلام کا انتقال ہُوا تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اُن کے گھر تشریف لے گئے اور اُن کے سرہانے بیٹھ کر فرمایا، ''اے میری ماں! خدا آپ کو اپنی حفاظت میں رکھے، بہت دفعہ آپ نے مجھے کھلانے کے لیے خود بھوک برداشت کی۔ آپ نے ایسی اچھی چیزیں مجھے کھلائیں اور ایسا اچھا پہنایا جن سے آپ نے خود کو (میری خاطر) محروم رکھا۔ خدا یقیناً آپ کے ان اعمال سے خوش ہے کیونکہ آپ کی نیت اللہ کی رضا حاصل کرنا اور آخرت میں کامیاب ہونا تھی۔'' اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُن کے (کفن کے) لیے اپنا کرتہ عنایت فرمایا اور اُن کی قبر میں اُتر کر اُسے ملاحظہ کیا اور اُن کا جسمِ اقدس قبر میں خود اُتارا۔ کثیر اربابِ سیر نے اس روایت کو نقل کیا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُن کے کفن کے لیے اپنا کرتہ مبارک عطا فرمایا اور جب اُنھیں لحد میں اُتارا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی لحد میں اُن کے ساتھ لیٹ گئے تھے۔[1] آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اُن کے حق میں اکثر فرمایا کرتے تھے کہ میرے چچا ابو طالب (علیہ السلام) کے بعد میرے ساتھ اچھا سلوک کرنے والا اُن سے بڑھ کر اور کوئی نہیں تھا۔

---

[1] علی بن محمد اثیر الجزری (متوفی ۸۳۸ھ)، اسد الغابۃ ج۵ ص۵۱۷

طبرانی، المعجم الکبیر ۲۴: ۳۵۱۔ طبرانی المعجم الاوسط ۱: ۶۷۔ ابن عبد البر، الاستیعاب ۴: ۱۸۹۱۔ ابو نعیم، حلیۃ الاولیاء ۳: ۱۲۱۔ ابن جوزی، العلل المتناھیۃ ۱: ۲۶۹۔ ابن جوزی، صفوۃ الصفوۃ ۲: ۵۴۔ عسقلانی، الاصابۃ فی تمیز الصحابۃ ۸: ۶۰

ھیثمی، مجمع الزوائد ۹: ۲۵۶

سنہ ۵ ہجری

غزوۂ دومۃ الجندل

(۲۵ ربیع الاوّل ۵ ہجری/ ۲۴ اگست ۶۲۶ء)

دومۃ الجندل ایک پہاڑ کا نام ہے جو مدینہ سے کوفہ کی طرف دس منزل پر واقع ہے۔ ارباب سیر کہتے ہیں کہ دومۃ الجندل ایک قلعے کا نام ہے جس کی بنیاد پتھر پر رکھی گئی تھی۔ ''مواہب'' میں کہا گیا ہے کہ اُس کے اور دمشق کے درمیان پانچ روز کی مسافت ہے اور یہ مدینہ منوّرہ سے پندرہ سولہ روز کی مسافت پر ہے۔ یہ نام دومی بن اسماعیل کے نام پر ہے جس نے وہاں قیام کیا تھا۔ قاموس میں کہا گیا ہے اسے دوما جندال بھی کہتے ہیں۔[1] یہ غزوہ وہاں پر واقع ہُوا اس لیے اسے غزوۂ دومۃ الجندل کہا جاتا ہے۔

اسلام سے پہلے عرب کے کئی قبیلوں کا پیشہ رہزنی اور ڈکیتی تھا۔ قیامِ اسلام کے بعد اُن کو مسلمانوں کی طرف سے شدید مُزاحمت کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا کیونکہ جب کبھی مدینہ کے گردونواح میں وہ ایسی کسی کاروائی کی کوشش کرتے تو مسلمان مجاہدین اُن کی سرکوبی کو پہنچ جاتے۔ کفّار دینِ اسلام کو اپنے آبائی مذہب کے لیے خطرہ سمجھتے ہوئے پہلے ہی اس کے بہت بڑے دشمن تھے اب جو اُن کی اس طرح کی پیشہ ورانہ سرگرمیوں میں رکاوٹ پیدا ہونے لگی تو وہ اس کا سدباب کرنے کے لیے فکرمند ہونے لگے۔ چنانچہ اُنھوں نے سوچا کہ اسلام کے مرکز پر حملہ کر کے اُسے تباہ و برباد کر دیا جائے اور پھر مدینہ اور اس کے نواح میں خوب لوٹ مار اور غارت گری کی جائے۔

ربیع الاوّل ۵ ہجری/ ۲۴ اگست ۶۲۶ء کو رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو خبر ملی کہ مشرکین کی ایک بڑی تعداد مدینہ طیّبہ کو تاراج کرنے اور اردگرد کے علاقوں اور قافلوں کو لوٹنے کے لیے دومۃ

---

[1] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۲۳۷

الجندل میں جمع ہو رہی ہے۔ مدارج النبوّت میں ہے کہ وہاں کا حاکم اکیدار نصرانی تھا جو ایک بہت بڑا لشکر لے کر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقابلے کے لیے آیا تھا۔[1] بروایتے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت سباع بن عرفطہ غفاری کو مدینہ کا عامل مقرر کیا اور ایک ہزار مجاہدین کا دستہ لے کر اُن کی سرکوبی کے لیے فوراً دومۃ الجندل کی جانب کوچ کیا۔[2] مشرکین کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیش قدمی کی اطلاع ملی تو گھبرا کر فرار ہو گئے اس طرح اس فتنے کو سر اُٹھاتے ہی دبا دیا گیا۔

غزوۂ مریسیع یا غزوۂ بنی المصطلق

(شعبان ۵ ہجری/ ۲۸ دسمبر ۶۲۶ء)

تاریخ ابن خلدون میں ہے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شعبان ۶ ہجری تک مدینہ میں قیام فرمایا اس کے بعد غزوہ بنی مصطلق وقوع میں آیا۔[3] ابن العماد حنبلی نے بھی اس غزوے کا ذِکر ۶ ہجری کے واقعات میں کیا ہے۔[4] مدارج النبوّت میں ہے کہ یہ غزوہ دوشعبان ۵ ہجری میں ہُوا۔[5] مریسیع مدینہ سے باہر ایک مقام کا نام ہے جہاں یہ غزوہ ہُوا اس وجہ سے اسے غزوۂ مریسیع کہا جاتا ہے اور قبیلہ بنی المصطلق کی وجہ سے غزوۂ بنی المصطلق کہلاتا ہے۔ بروایتے، بنو مصطلق کا ایک سردار حارث بن ابی ضرار لشکر لے کر حملہ کے لیے مدینہ طیبہ کی طرف روانہ ہُوا تو حضرت نبی اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مریسیع کے ایک کنویں پر اُس کا مقابلہ کیا۔[6]

حارث بن ابی ضرار کے ساتھ اُس کے قبیلے والوں کے علاوہ آس پاس کے کئی دشمنانِ اسلام بھی تھے۔ خدا کی قدرت سے اُن پر لشکرِ اسلام کی ایسی ہیبت طاری ہوئی کہ خزاعہ والوں کا

---

[1] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۲۳۷

[2] ڈاکٹر نصیر احمد ناصر، کتاب: پیغمبر اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ص ۵۴۶

[3] ابن خلدون (متوفی ۱۴۰۶ء)، تاریخ ابن خلدون مطبوعہ ۱۹۶۵، ج ۲ ص ۷۸۱

[4] شذرات الذہب، ج ۱ ص ۱۱

[5] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۲۱۱

[6] سید محسن امین عاملی (متوفی ۱۹۵۳ء)، اعیان الشیعہ، ج ۲ ص ۲۱۹

ساتھ دینے والے اردگرد کے تمام لوگ اُس کا ساتھ چھوڑ کر فرار ہو گئے اور حارث اپنے قبیلے کے ساتھ میدان میں تنہا رہ گیا۔ اسلامی لشکر نے اُن پر یکبارگی حملہ کر دیا جس کے نتیجے میں اُن کے دس آدمی مارے گئے اور باقی سب قیدی بنا لیے گئے۔ [1]

حضرت جویریہؓ سے نکاح

حضرت جویریہؓ، قبیلہ بنو مصطلق کے سردار حارث بن ابی ضرار کی بیٹی تھیں اور غزوۂ بنی مصطلق کے گرفتار شدگان میں سے تھیں۔ وہ اسلام سے متاثر ہو کر ایمان لے آئیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اُنھیں آزاد کر دیا پھر از راہِ عنایت اپنے عقد میں لیا اور تالیف قلوب کی خاطر تمام جنگی قیدیوں کو بھی رہا کر دیا۔ اُن کے قبیلے کے کئی لوگ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا حُسنِ سلوک دیکھتے ہُوئے مسلمان ہو گئے۔ طبری میں حضرت عائشہؓ سے مروی ہے کہ یہ نہایت خوبصورت تھیں اور ثابت بن قیس بن الشماس یا اُن کے چچا زاد کے حصّے میں آئی تھیں۔ حضرت جویریہؓ نے فدیے پر اُس سے آزادی کا معاہدہ کر لیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے پاس اپنے زرِ آزادی کی ادائیگی میں مدد لینے آئیں۔ اُنھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ میں جویریہ بنت حارث بن ابی ضرار ہوں جو کہ اپنی قوم کا سردار اور رئیس تھا، مجھ پر جو وقت آ گیا ہے وہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) پر روشن ہے، میں نے اپنی آزادی کا معاہدہ لکھوا لیا ہے اور آپ (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) سے زرِ آزادی کی ادائیگی میں مدد لینے حاضر ہوئی ہوں۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے وہ رقم ادا فرما دی اور (بعد ازاں اُن کی رضامندی کے ساتھ) اُن سے نکاح کر لیا۔ اس رشتے کی وجہ سے بنو مصطلق کے سو سے زیادہ قیدی آزاد کر دیے گئے۔ حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ جویریہؓ سے بڑھ کر اپنی قوم کے لیے بابرکت بی بی میں نے کوئی اور نہیں دیکھی۔ [2]

''مدارج النبوّت'' میں ہے، حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ جب تقسیم غنائم اور اسیروں

---

[1] علامہ علی نقی نقوی، تاریخ اسلام ص ۲۸۲

[2] ابی جعفر محمد بن جریر طبری، (متوفی ۳۱۰ھ) تاریخ طبری، جلد دوم حصہ اوّل، ص ۲۴۱

سے فارغ ہوئے اُس وقت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میرے ساتھ ایک چشمے پر تشریف فرما تھے کہ اچانک جویریہ بنت الحارث بن ضرار وہاں آ گئیں۔ وہ بہت ملیح اور صاحبِ حُسن و جمال تھیں، سب سے پہلی بات اُنھوں نے یہ کہی کہ یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میں مسلمان ہوتی ہوں اور اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَ اَنَّکَ رَسُوْلُہٗ پڑھتی ہوں۔ پھر کہا کہ میں حارث بن ضرار کی بیٹی ہوں اور اس قبیلے کی سردار اور پیشوا ہوں اور اب لشکرِ اسلام کے ہاتھوں قید ہوں۔ میں ثابت بن قیس کے حصّے میں آئی ہوں، اُس نے میرے ساتھ معاہدہ کیا ہے کہ رقم کے عوض مجھے آزاد کردے گا مگر میں وہ رقم ادا کرنے کی طاقت نہیں رکھتی، میں اُمید کرتی ہوں کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) رقم کی ادائیگی میں میری مدد فرمائیں گے تاکہ میں آزاد ہوسکوں۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ میں تمھاری مدد کروں گا اور تمھارے ساتھ اس سے بھی زیادہ حُسنِ سلوک کروں گا۔ اُنھوں نے عرض کیا کہ اس سے بہتر سلوک کیا ہوگا؟ فرمایا کہ میں ادائے زرِفدیہ کرکے تجھے اپنے عقد میں لاکر اپنی زوجیت سے سرفراز کروں گا۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ثابت بن قیس کے پاس کسی کو بھیجا اور فدیے کی رقم اُن کے سپرد کرائی اور آزاد ہوجانے کے بعد حضرت جویریہؓ کو اپنے نکاح میں لے لیا۔ اربابِ سیر بیان کرتے ہیں کہ اس کے بعد بنی مصطلق کے قیدیوں کو جن کی تعداد ایک سو نوّے سے زیادہ تھی آزاد کردیا گیا۔[۱]

حضرت زینب بنت جحشؓ سے نکاح

یوں تو جناب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیاتِ طیّبہ کا ہر پہلو اہلِ فکر و نظر کے لیے بہترین نمونہ ہے لیکن آنجناب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ازدواجی زندگی معاشرتی حیات کا گہری نظر سے مطالعہ کرنے والوں کے لیے نہایت بصیرت افروز ہے۔ رشتۂ ازدواج صرف میاں بیوی کے درمیان ایک تعلق ہی کا نام نہیں بلکہ دو خاندانوں، دو معاشروں اور بسا اوقات دو قوموں کے درمیان گہرے

---

[۱] ابی جعفر محمد بن جریر طبری، (متوفی ۳۱۰ھ) تاریخ طبری، جلد دوم حصہ اوّل، ص ۲۴۱

اور مضبوط روابط اور مراسم کا ذریعہ بھی ہوتا ہے۔ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی ایک قبیلے یا قوم کے راہبر نہیں تھے بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تو ساری انسانیت کے قائد اور راہنما تھے۔ یہی وجہ ہے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہر قول و فعل ظلمتِ حیات میں شمعِ فروزاں کی حیثیت رکھتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ازدواجی زندگی بھی صرف آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات تک محدود نہیں بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کبھی اپنوں بیگانوں کی تالیف قلوب کی خاطر اور کبھی دینی یا معاشرتی مصلحتوں کی بنا پر بحکمِ الٰہی نکاح کی ذمہ داریوں کو قبول فرمایا۔ چنانچہ حضرت زینب بنت جحش سے نکاح کے معاملے میں محققین کا کہنا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو امتثالِ امرِ الٰہی میں عربوں کے اس غلط اور غیر فطری عقیدے کا بطلان کرنا تھا کہ متبنّیٰ (لے پالک بیٹا) حقیقی بیٹے کی طرح ہوتا ہے اور اُس کی بیوہ یا مطلقہ سے نکاح ناجائز ہے۔ جیسا کہ ارشادِ الٰہی ہے: [1]

وَمَا جَعَلَ اَدۡعِيَآءَكُمۡ اَبۡنَآءَكُمۡ‌ؕ ذٰلِكُمۡ قَوۡلُكُمۡ بِاَفۡوَاهِكُمۡ‌ؕ وَاللّٰهُ يَقُوۡلُ الۡحَـقَّ وَهُوَ يَهۡدِى السَّبِيۡلَ ۝۴

(اور نہ ہی اُس (اللہ) نے تمھارے منہ بولے بیٹوں کو تمھارا (حقیقی) بیٹا بنایا ہے اور وہی (سیدھے) راستے کی ہدایت کرتا ہے۔)

اور پھر اِس کی مزید وضاحت یوں فرمادی: [2]

وَاِذۡ تَقُوۡلُ لِلَّذِىۡۤ اَنۡعَمَ اللّٰهُ عَلَيۡهِ وَاَنۡعَمۡتَ عَلَيۡهِ اَمۡسِكۡ عَلَيۡكَ زَوۡجَكَ وَاتَّقِ اللّٰهَ وَتُخۡفِىۡ فِىۡ نَفۡسِكَ مَا اللّٰهُ مُبۡدِيۡهِ وَتَخۡشَى النَّاسَ‌ۚ وَاللّٰهُ اَحَقُّ اَنۡ تَخۡشٰىهُ‌ؕ فَلَمَّا قَضٰى زَيۡدٌ مِّنۡهَا وَطَرًا زَوَّجۡنٰكَهَا لِكَىۡ لَا يَكُوۡنَ عَلَى الۡمُؤۡمِنِيۡنَ حَرَجٌ فِىۡۤ اَزۡوَاجِ اَدۡعِيَآئِهِمۡ اِذَا قَضَوۡا مِنۡهُنَّ وَطَرًا‌ؕ وَكَانَ اَمۡرُ اللّٰهِ مَفۡعُوۡلًا ۝۳۷

(اے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! وہ وقت یاد کریں) جب آپ اُس شخص (زید بن حارثؓ) سے کہہ رہے

---

[1] سورۃ الاحزاب، آیت ۴

[2] سورۃ الاحزاب، آیت ۳۷

تھے جس پر اللہ نے اور آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے احسان کیا تھا کہ اپنی بیوی کو اپنے پاس رہنے دے (اُسے نہ چھوڑ) اور اللہ سے ڈر، اور آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) وہ بات اپنے دل میں چھپا رہے تھے جسے اللہ ظاہر کرنے والا تھا اور آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) لوگوں (کی طعن وتشنیع) سے ڈر رہے تھے حال آنکہ اللہ اس بات کا زیادہ حقدار ہے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اُس سے ڈریں (بہرحال) جب زید نے اُس عورت (زینب بنت جحشؓ) سے اپنی حاجت پوری کر لی (اُسے طلاق دے دی) تو ہم نے اُس خاتون کی شادی آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے کر دی تاکہ اہلِ ایمان پر اپنے منہ بولے بیٹوں کی بیویوں سے (نکاح کرنے) کے معاملے میں کوئی تنگی نہ رہ جائے جب وہ اُن سے حاجت پوری کر چکے ہوں (یعنی اُنھیں طلاق دے کر فارغ کر چکے ہوں) اور اللہ کا حکم تو بہرحال ہو کر رہتا ہے۔)

حضرت زینب بنت جحشؓ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پھوپھی زاد تھیں اس لحاظ سے اُن کا تعلق قریش کے بہت معزز گھرانے سے تھا۔ زمانہ قدیم کے نامعقول لسانی، قومی اور رنگ ونسل جیسے امتیازات کو ختم کرنے کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُن کا نکاح اپنے ایک آزاد کردہ غلام حضرت زید بن حارثؓ سے کر دیا۔ زید بن حارثؓ کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنا منہ بولا بیٹا بنا رکھا تھا۔ اسلامی نقطہ نظر سے انسانی مساوات کی یہ ایک شاندار مثال تھی۔ لیکن زوجین میں تفاوتِ مزاج اور تضادِ ذوق کی وجہ سے نباہ نہ ہو سکا اور باوجود رسولِ گرامی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کئی کوششوں کے فریقین میں مصالحت نہ ہو سکی اور بیچ کے فاصلے اتنے بڑھ گئے کہ بات طلاق تک جا پہنچی۔

اُس زمانے میں عرب میں منہ بولے بیٹے کو حقیقی بیٹے کا درجہ دیا جاتا تھا اور اس وجہ سے اُس کی بیوہ یا مطلقہ سے نکاح جائز نہیں سمجھا جاتا تھا۔ خداوند متعال نے لوگوں کے اس غیر فطری اور خودساختہ عقیدے کے استیصال کے لیے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنے متبنّیٰ حضرت زیدؓ کی مطلقہ بیوی حضرت زینب بنت جحشؓ سے نکاح کرنے کا حکم صادر فرمایا چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تقریباً اٹھاون برس کی عمر میں شوال ۵ ہجری میں اُن سے نکاح فرمایا۔[1]

---

[1] ابوالاعلیٰ مودودی (متوفی ۱۹۷۹ء)، تفہیم القرآن ۴: ۳۰۸، ۳۰۹

غزوۂ احزاب یا جنگِ خندق

(ذیقعد یا شوال ۵ ہجری)

غزوۂ خندق ۲۸ ذیقعد ۵ ہجری میں[1] اور بروایتے شوال ۵ ہجری میں ہُوا۔[2]
خواجہ محمد لطیف انصاری نے ذیقعد ۵ ہجری کے ساتھ عیسوی تاریخ مارچ اپریل ۶۲۷ء لکھی ہے۔[3] ''روضۃ الاحباب'' میں بھی یہ غزوہ ۵ ہجری میں بیان کیا گیا ہے لیکن یہ بھی مشہور ہے کہ یہ چوتھے سال میں ہُوا۔[4]

اس غزوے میں مدینہ کے اردگرد خندق کھودی گئی تھی اس وجہ سے اسے غزوۂ خندق کہا جاتا ہے۔ اس کو غزوۂ احزاب کا نام بھی دیا جاتا ہے کیونکہ احزاب کے معنی ''گروہ'' کے ہیں اور اس جنگ میں قریش، یہود اور دیگر قبائل متحد ہو کر یعنی گروہ کی صورت میں مسلمانوں کے خلاف نکلے تھے۔ اس غزوے سے پہلے غزوۂ بدر اور غزوۂ اُحد میں قریش نے اپنی ساری طاقت جھونک دی تھی لیکن مسلمانوں کو زیر کرنے کی بجائے نہ صرف شکستِ فاش سے دوچار ہوئے بلکہ اپنے تقریباً تمام سرداروں کو بھی مروا بیٹھے تھے۔ کچھ ایسا ہی حال یہودیوں کا بھی تھا۔ اُنھوں نے جب بھی بغاوت کے لیے سر اُٹھایا منہ کی کھائی اور پھر کبھی تحریری معاہدے کر کے جان بچائی اور کبھی ملک بدر ہو کر۔ پس قریش اور یہود دونوں نے اپنی اپنی جگہ یہ جان لیا تھا کہ ہم اکیلے مسلمانوں کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے لہٰذا ہمیں متحد ہو کر اور اسلام مخالف تمام اندرونی و بیرونی قوتوں کو یکجا کر کے مسلمانوں سے فیصلہ کن جنگ کرنا ہوگی۔

---

[1] علامہ علی نقی نقوی، تاریخ اسلام ص ۲۸۴۔ عبدالباری ایم اے، دعوت دہلی سیرۃ طیبہ نمبر ربیع الاوّل ۱۳۷۹ھ
[2] سید محسن امین عاملی (متوفی ۱۹۵۳ء)، اعیان الشیعہ، ج ۲ ص ۲۲۲
[3] خواجہ محمد لطیف انصاری، اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ، ج ۱ ص ۱۰۹
[4] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۲۱۹ بحوالہ روضۃ الاحباب

اسلام مخالف بیرونی قوتیں وہ تھیں جو کھلم کھلا اسلام کی دشمن تھیں یعنی مشرکینِ مکّہ اور وہ غیر مسلم جو مسلمانوں کے ساتھ کسی معاہدے میں شریک نہیں تھے اور اندرونی قوتیں وہ تھیں جو تحریری معاہدوں کی وجہ سے بظاہر مسلمانوں کی حلیف تھیں لیکن در پردہ حریف تھیں، اُن میں یہود اور دیگر ایسے لوگ شامل تھے جو بظاہر غیر جانبدار تھے یا اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرتے تھے لیکن حقیقت میں منافق تھے۔ چنانچہ اس منصوبے پر عمل پیرا ہونے کے لیے ایک طرف تو سرداران یہود حییّ بن اخطب، سلام بن ابی حقیق، سلام بن مشکم اور کنانہ بن ربیع وغیرہ مکّہ جا پہنچے اور مشرکینِ مکّہ کے ساتھ مل کر مدینہ پر اجتماعی چڑھائی کا منصوبہ بنایا تو دوسری طرف مشرکین کا سردار ابوسفیان تھا جو بہت خوش اور پُر جوش تھا۔ [۱]

علامہ طبرسی کے بقول یہودی بنو کنانہ اور بنو غطفان کے پاس بھی گئے اور کہا کہ مسلمانوں کے خلاف قریش بھی ہمارے ساتھ ہیں لہٰذا تم بھی ہمارا ساتھ دو، اور وہ اس پر تیار ہو گئے۔ [۲]

دشمنانِ اسلام کی پیش قدمی

جب اسلام دشمن تمام عناصر متحد ہو گئے تو مکّہ سے قریش کا لشکر لے کر ابوسفیان نکلا، قبیلہ غطفان کی قیادت عنیہ بن حصین بن فزارہ نے کی، بنی مرہ کو لے کر حارث بن عوف اور قبیلہ اشجع کے ساتھ دبرۃ بن طریف نے پیش قدمی کی۔ یہود کا کوئی لشکر اُن کے ساتھ نہیں تھا کیونکہ اُن کا منصوبہ یہ تھا کہ وہ مدینہ کے اندر سے مسلمانوں پر حملہ آور ہوں گے اور اس طرح مسلمان چکّی کے دو پاٹوں کے درمیان پس کر رہ جائیں گے۔ [۳]

---

[۱] ابن خلدون (متوفی ۱۴۰۶ء)، تاریخ ابن خلدون، ج ۲ ص ۷۴۷۔ علامہ طبرسی، اعلام الوریٰ

[۲] علامہ طبرسی (متوفی ۵۳۲ء)، اعلام الوریٰ

[۳] علامہ علی نقی نقوی، تاریخ اسلام، ص ۲۸۵

لشکرِ کفّار کی تعداد

لشکرِ قریش میں ایک ہزار اُونٹ اور تین سو گھوڑے تھے۔ قبائلِ عرب اسلم، اشجع، ابومرہ، کنانہ، فرازہ اور غطفان بھی بڑی تعداد میں آکر شامل ہوئے تھے۔ اس طرح اُن سب کی مجموعی تعداد دس ہزار ہوگئی تھی۔ [۱]

لشکرِ اسلام کی تعداد

لشکرِ اسلام کی مجموعی تعداد تین ہزار تھی جن میں صرف چھتیس گھوڑے تھے۔

خندق

اُدھر مشرکین نے مدینہ کی طرف کُوچ کیا اِدھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو اس کی خبر ہوگئی اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے جنگ کی حکمت عملی تیار کرنا شروع کی۔ واقدی نے لکھا ہے کہ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ دشمن کا رستہ روکنے کے لیے مدینہ کے گرد خندق کھودی جائے۔ [۲] مشہور مؤرّخ کے اے حمید بھی لکھتے ہیں کہ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ ایران میں ایسے موقعوں پر شہر کے گرد خندق کھودی جاتی ہے تاکہ دشمن اُسے عبور کرکے شہر میں داخل نہ ہوسکے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو یہ تجویز پسند آئی چنانچہ مدینہ کے اردگرد ایک گہری خندق تیار کی گئی۔ [۳] خندق کی کھدائی ماہِ صیام کے آخری ایام میں شروع ہوئی اور رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے دس دس آدمیوں کے ذمے چالیس چالیس گز زمین کھودنا لگائی (یعنی چار گز فی کس)۔

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ عمر رسیدہ ہونے کے باوجود نہایت پرعزم اور قوت ایمانی سے مالا مال تھے اور اکیلے دس آدمیوں کے برابر کام کرتے تھے۔ اُن کی یہ ہمت و جانفشانی اور

---

[۱] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۲۱۹

[۲] ابوعبداللہ محمد بن عمر واقدی (متوفی ۸۲۲ء)، المغازی للواقدی، ص ۴۴۵

[۳] کے اے حمید، تاریخ مسلمانان عالم، ج ص ۷۹

جذبۂ ایمانی دیکھ کر مہاجرین وانصار کے درمیان اُن کے لیے ایک دلچسپ کھینچا تانی شروع ہوگئی تھی۔ ہر جماعت یہ چاہتی تھی کہ سلمان ؓ اُس میں شامل ہوجائیں۔ مہاجرین وانصار کی یہ محبت بھری کشمکش دیکھ کر رسول اللہ نے فرمایا، ''سَلْمَانُ مِنَّا اَھْلَ الْبَیْتِ'' یعنی سلمان میری اہل بیت میں سے ہیں۔[1]

نبی اکرم ﷺ خود بھی مسلمانوں کے ساتھ خندق کھودنے میں مصروف رہتے حال آنکہ بھوک کی وجہ سے شکمِ اقدس پر پتھر بندھا ہُوا ہوتا تھا۔[2] آنحضرت ﷺ کے شکمِ اطہر پر بھوک کی وجہ سے پتھر بندھے ہونے کا سبب مؤرّخین نے یہ لکھا ہے کہ اس واقعے سے مہینوں پہلے مدینہ میں قحط آیا تھا، خرمے کی پوری فصل تباہ ہوگئی تھی اور کفّار کے حملے کی وجہ سے بیرونی رسد کا سلسلہ بھی منقطع ہوگیا تھا اس لیے خوراک کی کمی واقع ہوگئی تھی اور مسلمانوں پر فقرو فاقہ کی کیفیت طاری تھی۔ خندق کی کھدائی کے دوران میں تندو تیز ہوائیں چلتی تھیں اور ابرو باراں بھی تھا، سخت اور پتھریلی زمین کا مسلسل کھودنا بڑے بڑے دلیروں کے کلیجے ہلا دیتا تھا۔[3]

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ہم خندق کھودنے میں مصروف تھے کہ اچانک ایک بہت بڑا اور سخت پتھر نکل آیا جس پر کدال کا وار کوئی اثر نہیں کرتا تھا۔ ہم حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یارسول اللہ ﷺ! ایک پتھریلی چٹان خندق کی کھدائی میں حائل ہوگئی ہے۔ حضور اکرم ﷺ یہ سُن کر کھڑے ہوگئے حال آنکہ بھوک کی وجہ سے شکم اطہر پر پتھر بندھا ہُوا تھا، آپ ﷺ نے اُس چٹان پر ضرب ماری تو وہ ریت کی مانند ریزہ ریزہ ہوگئی۔[4]

---

[1] کے اے حمید، تاریخ مسلمانان عالم، ج ۱ ص ۷۹

[2] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۲۲۸

[3] خواجہ محمد لطیف انصاری، اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ، ج ۱ ص ۱۱۱

[4] صحیح بخاری، حدیث ۴۱۰۴، مسند احمد نسائی، حدیث ۳۱۷۸

جب تک خندق کی کھدائی جاری رہی، رسولِ اعظم ﷺ بنفسِ نفیس اُس کھدائی میں شامل رہے۔ براء بن عازب ؓ سے روایت ہے کہ روزِ احزاب حضور ﷺ نے خندق کو کھودا اور لوگوں نے دیکھا کہ آپ ﷺ خندق کی مٹی کو اُٹھا رہے تھے یہاں تک کہ آپ ﷺ کے بطن اقدس کی تابانی کو اُس مٹی نے ڈھانپ لیا تھا۔[1]

اربابِ سیر کہتے ہیں کہ خندق کی کھدائی کا کام بیس روز تک جاری رہا۔ واقدی نے چوبیس روز اور نووی نے پندرہ دن بیان کیے ہیں جب کہ بعض روایتوں میں ایک پورا مہینہ بھی بیان کیا گیا ہے۔ ''روضۃ الاحباب'' میں ہے کہ چھ دن میں کام مکمل ہو گیا تھا۔[2]

خندق کی حدود

مدینہ منوّرہ، مکّہ سے آنے والے راستے کو چھوڑ کر باقی تمام اطراف سے پہاڑوں اور دشوار گذار راستوں میں گھرا ہُوا تھا۔ قریش کی فوج کو مکّہ کی طرف سے آنا تھا چنانچہ حضرت سلمان ؓ کے مشورے سے اُسی طرف خندق کھودی گئی۔ واقدی کے مطابق خندق کی حدود بذاد سے ذیاب تک اور پھر راتج تک تھیں۔ بذاد بنوسلمہ کی ایک شاخ کا مملوکہ ٹیلا تھا جو مسجد فتح کے مغرب میں تھا، راتج وہ پہاڑی تھی جو کوہ بنی عبید کے پہلو میں بطحان کے مغرب میں واقع تھی۔[3]

لشکرِ کفّار کی آمد

اِدھر خندق کی کھدائی مکمل ہوئی اُدھر کفّار کی فوجیں مدینہ کے قریب پہنچیں اور راہ میں حائل خندق کو دیکھ کر ششدر رہ گئیں۔ عربوں نے اس سے پہلے خندق نہیں دیکھی تھی، وہ پریشانی کے عالم میں خندق پار کرنے کا کوئی طریقہ ڈھونڈتے رہے پھر ناکام ہو کر وہیں خندق کے پاس

---

[1] صحیح بخاری، حدیث ۷ ۲۸۳۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۲۲۱

[2] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۲۲۲ بحوالہ روضۃ الاحباب

[3] کے اے حمید، تاریخ مسلمانان عالم، ج ۱ ص ۹۷

صف آرا ہو گئے۔ اب خندق کے ایک طرف مدینہ کی جانب مسلمان مورچہ بند تھے جب کہ دوسری طرف کفّار کا اتحادی لشکر تھا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ مورچہ بندی بیس دن سے زیادہ جاری رہی، اس دوران میں تیر اندازی اور سنگ باری ہوتی رہی اور باقاعدہ جنگ کی نوبت نہ آئی۔ [۱]

بنوقریظہ کی بغاوت

مؤرّخین لکھتے ہیں کہ غزوۂ خندق کا ایک اہم محرک یہودی قبیلہ بنونُضیر تھا جسے مسلمانوں کے ہاتھوں ملک بدر ہونا پڑا تھا۔ اُن ہی کی کوششوں اور ریشہ دوانیوں کی وجہ سے مشرکینِ مکّہ اور یہود میں یہ اتحاد قائم ہُوا تھا۔ مسلمان اس گٹھ جوڑ سے آگاہ تھے اور اس کا سامنے کرنے کے لیے پوری طرح تیار بھی تھے لیکن یہ نہیں جانتے تھے کہ ایک خطرناک سانپ اُن کی آستین میں بھی چھپا بیٹھا ہے۔ ایک یہودی قبیلہ بنوقریظہ جو مدینہ کے اندر آباد تھا اور بظاہر اپنے دوستی کے معاہدے پر قائم تھا، در پردہ اپنے ہم مذہب قبیلوں کے ساتھ مل چکا تھا۔ اس قبیلے میں ساڑھے سات سو جنگجو موجود تھے۔ منصوبہ یہ تھا کہ جب اتحادی فوجیں مدینہ پہنچ کر سامنے سے حملہ آور ہوں گی تو یہ اندر سے حملہ کر دیں گے۔ لہٰذا ابوسفیان نے مدینہ کے قریب پہنچ کر بنونضیر کے سردار حیی بن اخطب کو یاد دلایا اور کہا کہ مدینہ کے اندر جا کر بنوقریظہ کو منصوبے کے مطابق تیار کرو اور اُن سے کہو کہ وہ (حضرت) محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ساتھ کیا گیا معاہدہ توڑنے کا اعلان کریں۔ [۲]

حیی بن اخطب خفیہ طور پر بنوقریظہ کے سردار کعب بن اسد کے پاس گیا اور اُسے عہد شکنی پر تیار کر لیا۔ کعب بن اسد نے عہد نامے کی تحریر لا کر حیی بن اخطب کو دے دی جسے اُس نے اپنے ہاتھوں سے چاک کر کے بنوقریظہ میں اعلانِ بغاوت کر دیا۔ [۳]

---

[۱] علامہ طبرسی (متوفی ۵۳۲ء)، اعلام الوریٰ

[۲] ابوعبداللہ محمد بن عمر واقدی (متوفی ۸۲۲ء)، المغازی للواقدی، ص ۴۵۴

[۳] ابوعبداللہ محمد بن عمر واقدی (متوفی ۸۲۲ء)، المغازی للواقدی، ص ۴۵۶

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اُس وقت مجاہدینِ اسلام کے ساتھ محاذِ جنگ پر تھے کہ حضرت عمر بن خطابؓ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خیمے میں آئے اور کہا کہ یارسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! مجھے اطلاع ملی ہے کہ بنی قریظہ نے معاہدہ توڑ دیا ہے اور جنگ کے لیے تیار ہو گئے ہیں۔ بقولے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر یہ اطلاع بہت شاق گزری اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کسی کو اس کی تصدیق کے لیے بھیجنا چاہا تو حضرت عمرؓ نے اصرار کیا کہ زبیر کو بھیجئے، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے زبیر کو بھیج دیا۔ زبیر نے آکر بتایا کہ بنوقریظہ لڑائی کے لیے تیار ہیں اور اپنے قلعے کی حفاظت کا سامان کررہے ہیں۔ چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سعد بن معاذ انصاریؓ، سعد بن عبادہؓ اور اسید بن حضیرؓ جیسی ممتاز شخصیات کو بنوقریظہ سے مذاکرات کے لیے روانہ فرمایا۔ ان حضرات کا شمار مدینہ کے قدیم اور معزز افراد میں ہوتا تھا اور یہ روسائے یہود کے ساتھ برابری کے تعلقات بھی رکھتے تھے۔ خصوصاً حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کے تو اُن کے ساتھ بہت قریبی روابط تھے۔

جب مسلمان معززین کا یہ وفد بنوقریظہ کے ہاں پہنچا تو خلافِ توقع اُنھوں نے ان کا استقبال بہت توہین آمیز طریقے سے کیا۔ ان حضرات نے بات چیت شروع کرنا چاہی تو یہودی فحش گالیوں اور بیہودہ کلمات پر اُتر آئے چنانچہ یہ لوگ ناکام و دلبرداشتہ واپس آگئے اور رمزیہ انداز میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو واقعے سے آگاہ کیا۔ اگرچہ اُنھوں نے تمام صورتِ حال نہایت رازداری سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گوش گزار کی تھی لیکن ایسی خبریں کہاں چھپی رہ سکتی ہیں؟ اگلے دن تک یہ بات تمام مسلمانوں کے بیچ گردش کررہی تھی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کئی کمزور دِل اور ناپختہ ایمان رکھنے والے مسلمان خوف و دہشت میں مبتلا ہو کر بوکھلا گئے، اُن کی آنکھیں پھر گئیں، کلیجے منہ کو آنے لگے حتیٰ کہ وہ اللہ عزوجل کی نسبت طرح طرح کے گمان کرنے لگے۔ یہ موقع سخت آزمائش اور تکلیف کا تھا۔ پس ارشادِ پروردگارِ عالم ہُوا:[1]

اِذْ جَآءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ

---

[1] سورۃ الاحزاب، آیت ۱۰ تا ۱۱

الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا۝١٠ هُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَزُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا۝١١
(جب وہ تم پر اُوپر اور نیچے سے چڑھ آئے اور (خوف سے تمھاری) آنکھیں پتھرا گئیں اور کلیجے منہ کو آ گئے اور تم اللہ کی نسبت طرح طرح کے گمان کرنے لگے۔ اُس وقت ایمان والوں کو خوب آزمایا گیا اور اُنھیں خوب جھنجھوڑا گیا۔)

واقدی لکھتے ہیں، ''فکان ابو بکر الصدیق یقول لقد خفنا علی الذراری بالمدینة من بنی قریظه اشد من خوفنا من قریش وغطفان ولقد کنت وفی علی سلع فانظر الی بیوت المدینة فاذا ارایتهم هادئین حمدت الله عزوجل'' [1]

(حضرت ابوبکرؓ نے کہا کہ ہمیں سامنے والے دشمن قریش وغطفان وغیرہ سے زیادہ بنوقریظہ کا خوف لاحق تھا کیوں کہ ہمارے اہل وعیال جو مدینہ میں تھے اُن کے رحم وکرم پر تھے اس لیے میں سلع پہاڑی پر چڑھ کر مدینہ کے مکانوں پر نظر ڈالتا اور جب وہاں سکون پاتا تو خدا کا شکر ادا کرتا۔)

کئی مسلمان خوفزدہ ہو کر ایک دوسرے سے کہنے لگے کہ یہ وقت یہاں رُکنے کا نہیں لہٰذا واپس چلو۔ بنوحارثہ بن الحارث کے اوس بن قیظی نے اپنی قوم کی طرف سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے کہا کہ ہمارے گھر دشمن کی زد میں ہیں آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہمیں اجازت دیں کہ ہم اپنے گھروں کو چلے جائیں۔ [2] قرآن حکیم میں اس کا ذِکر یوں آیا ہے: [3]

وَاِذْ قَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ يٰٓاَهْلَ يَثْرِبَ لَا مُقَامَ لَكُمْ فَارْجِعُوْا ۚ وَيَسْتَاْذِنُ فَرِيْقٌ مِّنْهُمُ النَّبِيَّ يَقُوْلُوْنَ اِنَّ بُيُوْتَنَا عَوْرَةٌ ۛ وَمَا هِيَ بِعَوْرَةٍ ۚ اِنْ يُّرِيْدُوْنَ اِلَّا فِرَارًا۝١٣

(اور وہ وقت یاد کرو جب اُن میں سے ایک گروہ کہنے لگا کہ اے یثرب والو! اب (یہاں) تمھارے ٹھہرنے کا موقع نہیں سو واپس چلو اور اُن میں سے ایک گروہ یہ کہہ کر نبی (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) سے

---

[1] ابوعبداللہ محمد بن عمر واقدی (متوفی ۸۲۲ء)، المغازی للواقدی، ص ۴۶۰

[2] ابوجعفر محمد بن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ھ)، تاریخ طبری، ج ۲ حصّہ اوّل ص ۱۸۸

[3] سورۃ الاحزاب، آیت ۱۳

اجازت مانگ رہا تھا کہ ہمارے گھر خالی (غیر محفوظ) ہیں حال آنکہ وہ خالی (غیر محفوظ) نہیں تھے وہ تو صرف (محاذ سے) بھاگنا چاہتے تھے۔)

بقولے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جواب میں یہ آیت مبارکہ تلاوت فرمائی:[1] ''وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ط وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ○ (اور اپنے پروردگار پر توکل کرو بے شک اللہ تعالیٰ کارسازی کے لیے کافی ہے)۔ مدارج النبوّت میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا،[2] ''حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ'' (ہمارے لیے اللہ کافی ہے اور وہ بڑا اچھا کارساز ہے)۔

بنوقریظہ کی بغاوت کا سدِّ باب

بنوقریظہ کے ساتھ مذاکرات ناکام ہو چکے تھے، تلوار کی زبان میں بھی بات نہیں کی جا سکتی تھی کیونکہ وہ تو چاہتے ہی یہی تھے کہ مسلمانوں کو چکّی کے دونوں پاٹوں میں لاکر پیس دیا جائے لہٰذا آگے کنواں پیچھے کھائی والی اُس صورت حال میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دانش اور تدبر پر دل بے اختیار سبحان اللہ پکار اُٹھتا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسلامی لشکر کو خندق پر چھوڑ کر خود تو کہیں جا نہیں سکتے تھے لہٰذا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت سلمہ بن اسلم اشہلیؓ کو دوسو آدمیوں کے ساتھ اور حضرت زید بن حارثہؓ کو تین سو آدمیوں کے ساتھ مقرر کیا کہ دو جانب سے مدینہ کے اندر صدائے تکبیر بلند کرتے ہوئے جایا کرو تا کہ گھروں میں موجود مسلمانوں کی ڈھارس بندھی رہے اور وہ اپنے آپ کو محفوظ سمجھتے رہیں اور دشمن بھی یہ جان لے کہ ہم غافل نہیں اور نہ کمزور ہی ہیں۔ یہ ایک ایسی تدبیر تھی جس نے مسلمانوں کو بھی حوصلہ دیا اور بنوقریظہ کی ہمت بھی پست کردی اور اُنھیں اندر سے حملہ آور ہونے کی جرأت نہ ہو سکی۔[3]

---

[1] سورۃ الاحزاب، آیت ۳

[2] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۲۲۲

[3] علامہ علی نقی نقوی، تاریخ اسلام، ص ۲۹۳۔ ابوعبداللہ محمد بن عمر واقدی، المغازی للواقدی، ص ۴۶۰

مقابلہ

مدینہ کے اندر سے اُٹھنے والی بنو قریظہ کی شورش کو تو اندر ہی اندر دبا لیا گیا تھا لیکن مشرکین کی فوجیں ہنوز خندق کے دوسری طرف موجود تھیں۔ اُن کے جنگجو اس کوشش میں تھے کہ کسی طرح خندق پار کر کے مدینہ کی اینٹ سے اینٹ بجا دیں مگر اس میں اُنھیں کامیابی نہیں ہو رہی تھی۔ چنانچہ وہ اپنا غم و غصہ تیراندازی اور سنگ باری کر کے نکال رہے تھے اور جواباً مسلمان بھی اُسی طریقے پر عمل پیرا تھے۔ پھر اُن کے کچھ سورما کسی نہ کسی طرح خندق پار کر کے مسلمانوں کے سر پر آ پہنچے جو انفرادی مقابلوں میں جناب علی علیہ السّلام کے ہاتھوں فی النار ہو گئے۔ مشرکین کو بالآخر پسپا ہونا پڑا اور یوں معرکہ خندق کفّار کی شکست و ہزیمت اور مسلمانوں کی فتح و نصرت کا باب تاریخ میں رقم کر گیا۔ مشہور مؤرّخ کے اے حمید (بیرسٹرایٹ لاء لاہور) لکھتے ہیں، ''بیس دن تک دشمنوں نے مدینہ کا محاصرہ رکھا لیکن باوجود انتہائی کوشش کے وہ شہر میں داخل نہ ہو سکے۔ فرداً فرداً لڑائیاں ہوتی رہیں جن میں کبھی کفّار کامیاب ہوتے کبھی مسلمان۔ حضرت علی علیہ السّلام نے مردانگی کے وہ جوہر دکھائے کہ قریش دنگ رہ گئے۔''[1] شاہ عبدالحق محدث دہلوی لکھتے ہیں، ''حضرت علی مرتضیٰ علیہ السّلام نے اس غزوے میں ایسا مقابلہ و مقاتلہ کیا جو عقل و فہم کی حدود سے ماوراء ہے جیسا کہ احادیث میں وارد ہُوا:

لَمُبَارَزَةُ عَلِيِّ ابْنِ اَبِيْ طَالِبٍ يَوْمَ الْخَنْدَقِ اَفْضَلُ مِنْ اَعْمَالِ اُمَّتِيْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ○ (حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السّلام کا خندق کے دن مقابلہ کرنا میری اُمت کے قیامت تک کے اعمال سے افضل ہے)۔ ایسا ہی ''روضۃ الاحباب'' میں بھی مذکور ہے۔''[2]

---

[1] علامہ علی نقی نقوی، تاریخ اسلام ص ۲۹۳ بحوالہ کے اے حمید، تاریخ مسلمانان عالم

[2] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۲۳۳، ۲۳۴ بحوالہ روضۃ الاحباب

تاریخ طبری میں ہے، ''(غزوۂ خندق میں) حضرت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قیام فرمایا اور مشرکین بھی قیام پذیر رہے بیس شب وروز سے زیادہ تقریباً ایک مہینہ، اور اُن لوگوں کے درمیان کوئی جنگ نہیں ہورہی ہے سوائے تیروں اور پتھروں کے پھینکنے کے۔'' اور پھر لکھا ہے، ''رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قیام فرمایا اور دشمن سب کو اپنے گھیرے میں لیے رہے بس اس کے سوا اُن کے درمیان کوئی جنگ نہ تھی۔ [۱]

ابن الوردی لکھتے ہیں، ''مشرکین نے بیس شب وروز سے زیادہ قیام کیا اور رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اُن کے مقابلے پر جمے رہے اور اُن کے درمیان اس عرصہ میں کوئی جنگ نہ ہوئی سوا تیر اندازی کے پھر عمر بن عبدود میدان میں نکلا۔'' [۲] جو حضرت علی علیہ السلام کی تلوار کا لقمہ بن گیا۔

اسماعیل ابوالفدا کا بیان بھی وہی ہے جو ابن الوردی کا ہے۔ [۳] ابن خلدون نے تحریر کیا ہے، ''مسلمان ایک مہینے کے قریب محصور رہے اور کسی جنگ کی نوبت نہیں آئی اور اس سلسلے نے طول کھینچا یہاں تک کہ کچھ شہسوار قریش کے خندق سے اس طرف آ گئے جن میں عکرمہ بن ابی جہل اور عمرو بن عبدود (وغیرہ) تھے۔ [۴] اور عمرو بن عبدود وغیرہ شیرِ خدا حضرت علی علیہ السلام کے ہاتھوں قتل ہو گئے۔

حافظ ذہبی نے اپنی کتاب ''العبر فی خیر من غیر'' میں لکھا ہے، ''اس معرکے میں بس تیر اندازی ہوتی رہی اور قوتِ برداشت کا مقابلہ بیس دن سے زیادہ رہا اور پھر جنگ کرنے کے لیے عمرو بن عبدِ ود نکلا۔ [۵] جسے حضرت علی علیہ السلام نے قتل کر دیا۔

---

[۱] ابوجعفر محمد بن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ھ)، تاریخ طبری، ج ۲ ص ۵۷۶

[۲] ابن الوردی (متوفی ۷۴۹ھ ۱۳۴۹ء) تاریخ ابن الوردی، ج ۱ ص ۱۲۲

[۳] ابوالفدا (متوفی ۱۳۳۱ء)، تاریخ ابوالفدا، ج ۱ ص ۱۴۲

[۴] ابن خلدون (متوفی ۱۴۰۶ء)، تاریخ ابن خلدون، ج ۲ ص ۵۷۷

[۵] حافظ ذہبی، العبر فی خیر من غیر، مطبع کویت، ج ۱ ص ۷

عَمرُ و بن عبدِ ود العامری

عمرو بن عبدِ ود وہ واحد سُورما تھا جس سے قریش کی ساری اُمیدیں وابستہ تھیں کیونکہ اس سے پہلے ہونے والی دو بڑی جنگوں بدر اور اُحد میں اُن کے تمام چوٹی کے سردار اور جنگجو مارے جا چکے تھے۔ عمرو بن عبدِ ود العامری بن ابی قیس، عامر بن لوی بن غالب کی نسل سے تھا۔ وہ جنگِ بدر میں شدید زخمی ہو گیا تھا جس کی وجہ سے اُحد میں شامل نہیں ہو سکا تھا اور اب خندق میں بہت جوش و خروش سے آیا تھا۔ وہ اپنے آپ کو بہت ممتاز سمجھتا تھا اسی لیے اُس نے اپنے سر پر ایک امتیازی پٹی باندھ رکھی تھی۔[۱] وہ بلا کا طاقتور اور بہادر آدمی تھا۔ راتوں کو بھی خندق کے پاس آ کر اپنی دلیری اور طاقت کا مظاہرہ کیا کرتا اور بیچ میں خندق حائل ہونے کے باوجود کئی مسلمان اُسے دیکھ کر دہل جاتے۔ اُن میں ایک طلاطم بپا ہو جاتا کہ عمرو بن عبدِ ود آ گیا اور وہ گھبرائے ہوئے خیمہ رُسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی طرف بھاگتے اور اکثر آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو نیند سے جگا دیتے۔ تب آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو اُن کی ڈھارس بندھانے کے لیے بلا وجہ شبِ تار میں خندق کے پاس تشریف لانے کی زحمت گوارا کرنا پڑتی۔[۲]

مؤرّخین لکھتے ہیں کہ عمرو بن عبدِ ود مسلسل اس کوشش میں تھا کہ کسی طرح خندق پار کرنے کی کوئی صورت نکل آئے۔ وہ خندق کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جاتا اور عقابی نگاہوں سے جائزہ لیتا۔ آخر کار اُس نے ایک ایسی جگہ کا انتخاب کر لیا جسے پار کرنا کسی عام شخص کے لیے تو بظاہر ممکن نہیں تھا مگر اُسے اپنی طاقت، جرأت اور شہسواری پر ایسا ناز تھا کہ اُس نے وہاں سے اپنے گھوڑے کے ذریعے جست لگا کر خندق پار کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ابو جعفر محمد بن جریر طبری لکھتے ہیں کہ عکرمہ بن ابی جہل مخزومی، قبیلہ بنی محارب کا ضرار بن خطاب، ہبیرہ بن

---

[۱] ابو جعفر محمد بن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ھ)، تاریخ طبری (اردو)، ج ۲ ص ۲۱۸

[۲] ابو عبداللہ محمد بن عمر واقدی (متوفی ۸۲۲ء)، المغازی للواقدی

ابی وہب مخزومی اور نوفل بن عبداللہ جیسے پہلوان بھی اُس کے ساتھ ہو لیے تھے۔ پس، جنگ کو اپنے منطقی انجام تک پہنچانے کا فیصلہ کرکے پہلوانوں کا یہ دستہ مسلح ہوکر اپنے گھوڑوں پر نکلا اور بنو کنانہ کے پاس آکر کہا، ''لڑائی کے لیے تیار ہو جاؤ، آج تمھیں معلوم ہوگا کہ جواں مرد کون ہے؟'' پھر وہ اُس جگہ پہنچے جہاں سے اُنھوں نے خندق پار کرنا تھی۔ اُنھوں نے اپنے گھوڑوں کو چابک مارے تو عربی گھوڑے جست لگا کر خندق کے پار پہنچ گئے۔ علی ابن ابی طالب علیہ السلام چند مسلمانوں کے ساتھ مقابلے پر نکلے اور اُنھوں نے خندق کا وہ حصّہ جہاں سے یہ کود کر آئے تھے اپنے قبضے میں لے کر اُن کی واپسی کا راستہ مسدود کر دیا۔ [1]

نامور مؤرّخ اور عالم دین جناب علی نقی نقوی نقن اپنی تالیف تاریخ اسلام میں لکھتے ہیں، ''ظاہری حیثیت سے دیکھا جائے تو بہادری کے جوش میں اُنھوں نے یہ انتہائی حماقت کا کام کیا تھا اس لیے کہ اس طرح وہ گنتی کے آدمی اپنی پوری فوج سے کٹ کر الگ ہو گئے تھے کیونکہ وہاں کوئی تختے تو ایسے موجود نہ تھے جنھیں وہ خندق پر پُل کر طرح رکھ کر اپنی پوری فوج کو اُن پر سے گذار سکتے۔ اس طرح وہ صرف چار پانچ آدمی ہی تھے اور اِدھر مسلمانوں کا پورا لشکر تھا۔ اگر یہ سب مسلمان نہتے ہی دوڑ پڑتے تو دو چار سپاہیوں کو پیس ڈالنے کے لیے ان کی یورش ہی کافی ہو سکتی تھی مگر کیا کیا جائے کہ اس پوری فوج پر اُس اکیلے عمرو بن عبدِ ود کی ہیبت بُری طرح چھائی ہوئی تھی جس میں اُس کی اس حیرت انگیز غیر معمولی جرأت نے (کہ اُس نے خندق کو پار کرنے کی ہمت کی) خاص طور پر اضافہ کر دیا تھا اس لیے پوری مسلم فوج ہکّا بکّا ہو کر یوں دیکھ رہی تھی جیسے سُن ہو گئی ہو۔ اُس وقت اُن کا جو عالم تھا اُس کی مرقع کشی کے لیے تاریخ کے یہ الفاظ کافی ہیں، ''تمام اصحاب یوں بے حس و حرکت تھے جیسے اُن کے سروں پر طائر بیٹھے ہوئے ہوں۔'' [2]

---

[1] ابوجعفر محمد بن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ھ)، تاریخ طبری (اردو)، ج ۲ ص ۲۱۷، ۲۱۸

[2] علامہ علی نقی، تاریخ اسلام ص ۲۹۹ بحوالہ حسین بن محمد دیار بکری (متوفی ۸۹۲ھ)، تاریخ خمیس، ج ۱ ص ۴۸۶

شیرِ خدا کی جنگ

مندرجہ بالا تمام مؤرّخین کی روایات کا بنظرِ غائر جائزہ لینے کے بعد یہی کہا جا سکتا ہے کہ معرکۂ خندق صرف ایک فردِ واحد کے کارنامے کا ہی نام ہے جسے اسد اللہ کہتے ہیں۔ یہ جنگ علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے کارنامے سے شروع ہوئی اور اُسی پر ختم ہوگئی۔

مؤرّخین لکھتے ہیں کہ جب عمرو بن عبدِ ود اپنے ساتھی پہلوانوں کے ساتھ خندق پار کر کے آ گیا تو اُس نے مسلمانوں کو للکارا۔ اُس کی للکار سُن کر مسلمان سہم گئے۔ حضرت علی علیہ السلام اُس وقت نبی اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پہلو میں موجود تھے، اُس کی للکار سُنی تو فوراً کہا، ''یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! میں اس کا مقابلہ کروں گا۔'' رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ذُومعنی انداز میں فرمایا، ''علی! بیٹھ جاؤ، کیا تم جانتے نہیں کہ وہ عمرو بن عبدِ ود ہے؟'' نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے یہ الفاظ قابلِ غور ہیں، کیا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مقصد علی علیہ السلام کو عمرو بن عبدِ ود سے جنگ کرنے سے باز رکھنا تھا؟ یا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ سمجھتے تھے کہ نوجوان علی علیہ السلام اُس طاقتور پہلوان کو زیر نہیں کر سکیں گے؟ نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا کیونکہ علی علیہ السلام نے آغوشِ رسالت میں پرورش پائی تھی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی گود میں پلے بڑھے ہوئے اپنے بھائی کو خوب اچھی طرح جانتے تھے اور اُس کا اندازِ شجاعت اور فنِ حرب بارہا ملاحظہ فرما چکے تھے۔ بدر اور اُحد میں زورِ بازوِ حیدر کا مظاہرہ تو ابھی کل کی بات تھی۔ پھر وہ کیا وجہ تھی جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علی علیہ السلام سے فرمایا کہ بیٹھ جاؤ، کیا تم نہیں جانتے کہ وہ عمرو بن عبدِ ود ہے؟

محققین کہتے ہیں کہ اس انداز میں علی علیہ السلام کو رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بیٹھنے کو کہنا اس لیے نہیں تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم علی علیہ السلام کو اُس کے بارے میں متنبّہ کرنا چاہتے تھے بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس طرح دوسرے مسلمانوں کو دعوتِ فکر و عمل دینا چاہتے تھے۔ ظاہر ہے، علی علیہ السلام میدان میں آتے تو اُس کا خاتمہ کر دیتے پھر عمرو کے مارے جانے کے بعد کوئی یہ بھی تو کہہ سکتا

تھا کہ علی (علیہ السلام) نے جلد بازی سے کام لیا عمرو کے مقابلے میں جانے کا ارادہ تو میرا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک بار نہیں، تین بار ایسا کیا، ہمارا خیال ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسلمانوں کو بھرپور طریقے سے آزما رہے تھے۔

علامہ علی نقی نقوی لکھتے ہیں کہ نبی اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دوسرے مسلمانوں کو بھی موقع دینا چاہتے تھے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ بھی معلوم تھا کہ عمرو بن عبدِ ود سے متعلق ''جہاندیدہ'' اور ''تجربہ کار'' اصحاب کے کیا تاثرات ہیں اور کیسے کیسے مشاہدات دُہرائے جا رہے ہیں جس سے تمام فوجِ اسلام کے لیے وہ ایک بہت بڑا ''ہوّا'' بن گیا ہے۔ ہوسکتا تھا اُس وقت کسی کو یہ گمان بھی ہو کہ علی علیہ السلام کمسن ہیں اور اس کمسنی کی بنا پر عمرو بن عبدِ ود کی شخصیت سے واقف نہیں ہیں لہٰذا انھوں نے نوجوانی کے الہڑ پن میں بنا سوچے سمجھے یہ بات کہہ دی کہ میں اُس سے مقابلہ کروں گا۔ پس اُن تمام حالی تصورات اور امکانی خیالات کے پیشِ نظر پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے معنی خیز انداز میں علی علیہ السلام سے فرمایا کہ بیٹھ جاؤ، کیا تم جانتے نہیں کہ وہ عمرو بن عبدِ ود ہے؟[1]

مسلمانوں پر چھائے ہوئے گہرے سکوت سے عمرو کا حوصلہ بڑھا اور للکار کر کہنے لگا، ''کہاں ہے وہ تمھاری جنت، جس سے متعلق تم کہتے ہو کہ تمھارا شہید اُس میں داخل ہوگا، اب کسی کو میری طرف بھیجتے کیوں نہیں؟'' (تاکہ میں اُسے اُس جنّت میں پہنچاؤں)

علی علیہ السلام اُس کی للکار سُن کر پھر اُٹھے لیکن نبی اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دوبارہ ارشاد فرمایا، ''علی! بیٹھ جاؤ، جانتے نہیں کہ وہ عمرو بن عبدِ ود ہے؟'' مسلمانوں کے لشکر میں پھر سناٹا چھا گیا۔

عمرو بن عبدِ ود نے تیسری مرتبہ پھر مبارَزت طلب کی۔ علی علیہ السلام بے قراری سے پھر اُٹھے، رسولِ گرامی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پھر وہی جملہ ارشاد فرمایا تو علی علیہ السلام سے نہ رہا گیا، بے ساختہ کہا، ''وہ عمرو ہے تو ہُوا کرے'' (مجھے اُس سے کیا؟) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہی چاہتے تھے یعنی تین مرتبہ

---

[1] علامہ علی نقی نقوی، تاریخ اسلام، ص ۳۰۰

علی علیہ السلام کو روک کر دوسروں کو موقع دیا اور جب کوئی نہ آگے بڑھا تو مردِ میدان حضرت علی علیہ السلام کو اجازت دے دی۔ ''تاریخ خمیس'' میں ہے، ''جو مقصد رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اُس توقف سے تھا وہ حاصل ہو چکا تھا اب پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُنھیں اجازت دی۔''[۱]

رسولِ گرامی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علی علیہ السلام کو صرف اذنِ جہاد ہی نہیں دیا بلکہ اپنے دستِ مبارک سے جنگ کے لیے تیار بھی فرمایا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علی علیہ السلام کو اپنی تلوار عطا کی، اپنی زِرّہ پہنائی اور اپنا عمامہ اُن کے سر پر رکھ کر دُعائے خیر فرمائی۔ ''تاریخ خمیس'' میں ہے، ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب علی علیہ السلام کو اجازت مرحمت فرمائی تو اُنھیں اپنی تلوار ذوالفقار دی اور اپنی خاص زِرّہ پہنائی اور اپنا عمامہ اُن کے سر پر رکھا اور فرمایا میرے اللہ! اُس کے مقابلے میں اِس کی مدد فرما۔'' ایک روایت میں ہے کہ اپنا عمامہ آسمان کی طرف بلند کیا اور کہا، ''میرے اللہ! تُو نے روزِ بدر عبیدہ کو مجھ سے لے لیا اور روزِ اُحد حمزہ کو مجھ سے لے لیا، اب یہ ایک علی ہے جو میرا بھائی اور میرے چچا کا فرزند ہے، اب تُو مجھے (اِس) وارث کے بغیر تنہا نہ چھوڑنا کیونکہ تُو خود بہترین وارث ہے۔''[۲]

قرآن حکیم کے یہ کلمات '' رَبِّ لَا تَذَرۡنِیۡ فَرۡدًا وَّاَنۡتَ خَیۡرُ الۡوٰرِثِیۡنَ ○'' حضرت زکریا علیہ السلام سے منسوب ہیں، جیسا کہ سورۃ الانبیا میں ارشاد ہوتا ہے:[۳]

''وَزَکَرِیَّاۤ اِذۡ نَادٰی رَبَّہٗ رَبِّ لَا تَذَرۡنِیۡ فَرۡدًا وَّاَنۡتَ خَیۡرُ الۡوٰرِثِیۡنَ ﴿۸۹﴾ فَاسۡتَجَبۡنَا لَہٗ ۫ وَ وَہَبۡنَا لَہٗ یَحۡیٰی وَاَصۡلَحۡنَا لَہٗ زَوۡجَہٗ ؕ اِنَّہُمۡ کَانُوۡا یُسٰرِعُوۡنَ فِی الۡخَیۡرٰتِ وَیَدۡعُوۡنَنَا رَغَبًا وَّرَہَبًا ؕ وَکَانُوۡا لَنَا خٰشِعِیۡنَ ﴿۹۰﴾ (اور زکریا (علیہ السلام) کا (ذِکر) جب اُنھوں نے پکارا اے میرے پروردگار! مجھے (وارث کے بغیر) اکیلا نہ چھوڑ جب کہ تُو خود بہترین وارث ہے۔ ہم نے

---

[۱] حسین بن محمد دیار بکری (متوفی ۸۹۲ ہجری ۱۵۷۴ء)، تاریخ خمیس، ج ا ص ۴۸۶

[۲] حسین بن محمد دیار بکری (متوفی ۸۹۲ ہجری ۱۵۷۴ء)، تاریخ خمیس، ج ا ص ۴۷۷

[۳] سورۃ الانبیاء، آیت ۸۹، ۹۰

اُن کی دُعا قبول کی اور اُنھیں یحییٰ (جیسا بیٹا) عطا کیا اور اُن کی بیوی کو اُن کے لیے تندرست کر دیا، یہ لوگ نیک کاموں میں جلدی کرتے تھے اور ہم کو شوق و خوف (اور اُمید و بیم) کے ساتھ پکارتے تھے اور وہ ہمارے لیے (عجز و نیاز سے) جھکے ہوئے تھے۔)

اللہ کے نبی حضرت زکریا علیہ السلام بہت ضعیف تھے اور اولاد بھی نہیں تھی اس لیے خود کو لاوارث سمجھتے تھے۔ پھر اللہ کے حضور دُعا گو ہوئے کہ میرے اللہ مجھے وارث کے بغیر تنہا نہ چھوڑ تو اللہ نے اُن کی دُعا قبول فرمائی اور اُنھیں حضرت یحییٰ علیہ السلام کی صورت میں وارث (بیٹا) عطا فرمایا۔

اور اب رسولِ اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے رب کے حضور وہی کلمات عرض کر رہے ہیں۔ ''رَبِّ لَا تَذَرْنِیْ فَرْدًا وَّاَنْتَ خَیْرُ الْوٰرِثِیْنَ○'' یعنی اے میرے پروردگار! مجھے وارث کے بغیر اکیلا نہ چھوڑ جب کہ تُو خود بہترین وارث ہے۔ تو نبی اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اِن کلمات سے اور اپنا عمامہ مبارک حضرت علی علیہ السلام کے سر پر باندھنے سے ایک طرف تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنا وارث صرف اور صرف علی ابن ابی طالب علیہ السلام ہی کو قرار دیا اور باقی تمام مسلمانوں اور صحابہ کرامؓ میں سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وارث کوئی اور نہیں تھا اور دوسری طرف یہ پتا چلتا ہے کہ نبی گرامی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے اکلوتے وارث کو راہِ خدا میں روانہ کرنے کے بعد اپنا حامی و مددگار صرف خدائے یکتا کو ہی سمجھ رہے تھے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زِرّہ اور عمامہ زیب تن کر کے اور ذوالفقار کو ہاتھ میں لے کر حضرت علی مرتضیٰ علیہ السلام نے قدم بڑھایا۔ طبری نے لکھا ہے کہ علی بن ابی طالب علیہ السلام آگے بڑھے تو کچھ اور مسلمان فوجی بھی آپ کے ساتھ ہو لیے۔ آپ نے اُن لوگوں کو اُس تنگ راستے پر کھڑا کر دیا جہاں سے عمرو بن عبدِود اور اُس کے ساتھی گھوڑے دوڑاتے ہوئے آئے تھے۔[1]

جناب امیر المومنین علیہ السلام عمرو کے رُوبرو آئے تو وہ اپنے مدِمقابل ایک نوعمر کو

---

[1] ابوجعفر محمد بن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ھ)، تاریخ طبری (اردو)، ج ۲ ص ۲۱۷، ۲۱۸

دیکھ کر سخت متعجب ہُوا۔ پس حیرانی سے پوچھا،''اے نوجوان! تم کون ہو؟''

عمرو کی حیرانی بجا تھی، کہاں تو یہ عالم تھا کہ تین مرتبہ مبارزت طلب کرنے کے باوجود کوئی سامنے نہیں آیا تھا اور کہاں یہ حال کہ مکّہ کے نام نہاد سُورما اور نا قابلِ تسخیر سمجھے جانے والے دیو ہیکل پہلوان کے مقابلے پر ایک نوجوان؟

شیرِ خدا علی ابن ابی طالب علیہ السلام نے اُس کی متعجب آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پُر جلال لہجے میں جواب دیا،''میں علی ہوں۔''

عمرو نے پوچھا،''کیا عبد مناف کی نسل سے؟''

کہا،''ہاں! میں علی ابن ابی طالب (علیہ السلام) ہوں۔''

وہ کہنے لگا،''بھتیجے! تمھارے چچاؤں میں سے جو تم سے زیادہ بڑا ہو اُسے میرے مقابلے پر بھیجو مجھے تمھارا خون بہانے میں ناگواری محسوس ہوتی ہے۔'' عمرو کا حضرت علی علیہ السلام کو''بھتیجے'' کہہ کر مخاطب کرنا اور بڑوں کو مقابلے پر بلانا یہ ثابت کرتا ہے کہ وہ آپ کو ایک بچّہ سمجھ رہا تھا۔

آپ نے سرد لہجے میں فرمایا،''بخدا! مجھے تیرا خون بہانے میں کوئی ناگواری محسوس نہیں ہوگی۔''

ایسا خشک جواب سُن کر وہ تلملا اُٹھا اور تلوار کھینچ لی جو آگ کا شعلہ معلوم ہوتی تھی۔[1]

مؤرّخین لکھتے ہیں کہ اُس نے تلوار نکالی اور غصے میں اپنے گھوڑے کے پیروں پر ماری تو اُس کے چاروں پاؤں کٹ گئے، پھر وہ آپ کی طرف بڑھا۔[2]

حضرت علی علیہ السلام نے اُس سے فرمایا کہ تم نے عہد کر رکھا ہے کہ تمھارا مقابل تمھارے سامنے کوئی سی دو (اور بروایتے تین) خواہشات پیش کرے گا تو تم اُن میں سے ایک ضرور پوری کرو گے۔''

اُس نے کہا،''بے شک ایسا ہی ہے۔''

---

[1] حسین بن محمد دیار بکری (متوفی ۸۹۲ ہجری ۱۵۷۴ء)، تاریخ خمیس، ج ۱ ص ۴۸۴

[2] علامہ علی نقی نقوی، تاریخ اسلام ص ۳۰۳ بحوالہ ابن الوردی

ابوالفدا (متوفی ۱۳۳۱ء)، تاریخ ابوالفدا، ج ۱ ص ۱۸۰

آپ نے فرمایا، ''میری پہلی خواہش یہ ہے کہ تم اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لے آؤ۔''
عمرو کہنے لگا، ''مجھے اس کی کوئی ضرورت نہیں، دوسری خواہش بیان کرو۔''
دیار بکری روایت کرتے ہیں کہ علی علیہ السلام نے فرمایا، ''دوسری یہ ہے تم واپس چلے جاؤ اور اپنے گھر میں جا بیٹھو۔''
اُس نے کہا، ''بھلا یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ عرب کی عورتیں مجھ پر طعنہ زنی کریں گی کہ میں میدان چھوڑ کر بھاگ آیا۔''
آپ نے کہا، ''پھر آگے بڑھو اور مجھ سے مقابلہ کرو۔''
تاریخ خمیس میں جو مکالمے درج ہیں اُن کے مطابق اس مقام پر اُس نے علی علیہ السلام سے کہا تھا کہ تمھیں قتل کرنا مجھے پسند نہیں، تو علی علیہ السلام نے کہا، ''لیکن تمھیں قتل کرنا مجھے پسند ہے۔'' یہ سُن کر وہ جوش میں آیا اور اپنے گھوڑے سے کود پڑا۔ اُس نے تلوار سے گھوڑے کے پاؤں قطع کیے پھر اُس کے مُنہ پر وار کیا اور آخر میں حضرت علی علیہ السلام کی طرف بڑھا۔[1]
طبری نے لکھا ہے، ''علی علیہ السلام نے اُس سے کہا، ''اے عمرو! تم ہمیشہ یہ کہا کرتے تھے کہ اگر قریش کا کوئی شخص میرے سامنے دو باتیں پیش کرے گا تو میں اُن میں سے ایک ضرور مانوں گا۔'' اُس نے کہا، ''ہاں میرا یہی عہد ہے۔'' علی ابن ابی طالب علیہ السلام نے اُس سے کہا، ''اچھا تو پھر میں تم کو اللہ عزوجل، اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اسلام کی دعوت دیتا ہوں۔'' اُس نے کہا، ''میں نہیں مانتا مجھے اس کی ضرورت نہیں۔'' علی علیہ السلام نے کہا، ''تو پھر میں تم سے کہتا ہوں کہ گھوڑے سے نیچے آؤ۔'' اُس نے کہا، ''اے میرے بھتیجے یہ کیوں؟ بخدا میں نہیں چاہتا کہ تم کو قتل کروں۔'' علی علیہ السلام نے کہا، ''بخدا میں تو چاہتا ہوں کہ تم کو ضرور قتل کروں۔'' اس جملے کو سُن کر اُسے جوش آ گیا، وہ گھوڑے سے کود پڑا، اُس کو ذبح کر دیا یا اُس کے منہ پر تلوار ماری اور پھر علی علیہ السلام کے مقابل آ گیا۔''[2]

---

[1] حسین بن محمد دیار بکری (متوفی ۸۹۲ ہجری ۱۵۷۴ء)، تاریخ خمیس، ج ا ص ۴۸۷

[2] ابوجعفر محمد بن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ھ)، تاریخ طبری (اردو)، ج ۲ حصہ اوّل ص ۲۱۸

دونوں اطراف کی فوجوں نے دیکھا کہ میدانِ جنگ سے گرد و غبار بُلند ہُوا، لوہے آپس میں ٹکرانے کا شور پیدا ہوا، ڈھول کے کچھ اور بادل آسمان کی طرف اُٹھے، کچھ نظر نہیں آرہا تھا کہ یکا یک اُس گرد میں سے تکبیر کی صدا بلند ہوئی اور غبار آہستہ آہستہ چھٹنے لگا۔ لوگوں نے دیکھا کہ فاتحِ بدر و اُحد ایک اور جنگ فتح کر چکا تھا۔ حیدر کرار علیہ السلام نے عمرو بن عبدِ ود کا سر تن سے جُدا کر دیا تھا۔

ابن الوردی کے مطابق ''دونوں نے باہم جنگ کی اور جولانی کرتے رہے، دونوں پر غبار چھا گیا اور مسلمانوں نے تکبیر کی آواز سُنی تو سمجھے کہ علی علیہ السلام نے اُسے قتل کر دیا ہے اور غبار ہٹا تو یہ نظر آیا کہ علی ابن ابی طالب علیہ السلام اُس کے سینے پر سوار اُس کا سر تن سے جُدا کر رہے تھے۔''[1] ابن خلدون کہتے ہیں، ''علی ابن ابی طالب علیہ السلام نے عمرو بن عبدِ ود کو قتل کر دیا۔''[2] علامہ طبرسی لکھتے ہیں، ''حضرت علی علیہ السلام نے اُس کے مقابلہ میں نکل کر اُسے قتل کر دیا۔''[3] شیخ حسین بن محمد حسن دیار بکری لکھتے ہیں، ''سابق گفتگو ختم ہونے کے بعد اُس نے حضرت علی علیہ السلام کی جانب رُخ کیا تو آپ سِپر لیے ہوئے اُس کے مقابلے پر آئے مگر اُس نے تلوار کا ایسا وار کیا جو سِپر کو کاٹتی ہوئی آپ کے سر تک پہنچ گئی اور آپ زخمی ہو گئے۔ پھر آپ نے اُس پر وار کیا تو آپ کی تلوار اُس کے کاندھے پر پڑی جس سے وہ گر گیا اور غبار بلند ہُوا۔ پھر رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے تکبیر سنی تو سمجھ گئے کہ حضرت علی علیہ السلام نے اُس کو قتل کر دیا ہے۔''[4]

تاریخ گواہ ہے کہ علی علیہ السلام کے مقابلے میں کبھی کوئی نہیں ٹھہر سکا، علی علیہ السلام کی ایک ہی ضرب مقابل کا قِصّہ تمام کر دیا کرتی تھی۔ اس کی تائید آپ کی ضرب کی اُس خصوصیت

---

[1] ابن الوردی (متوفی ۷۴۹ھ)، ج ۲ ص ۱۲۲۔ ابوالفدا (متوفی ۱۳۳۱ء)، تاریخ ابوالفدا، ج ۱ ص ۱۴۲

[2] ابن خلدون (متوفی ۱۴۰۶ء)، تاریخ ابن خلدون، ج ۲ ص ۵۷۷

[3] علامہ علی نقی نقوی، تاریخ اسلام، ص ۳۰۲ بحوالہ علامہ طبرسی (متوفی ۵۳۲ء)، اعلام الوریٰ

[4] حسین بن محمد دیار بکری (متوفی ۸۹۲ ہجری ۱۵۷۴ء)، تاریخ خمیس، ج ۱ ص ۴۸۴

سے ہوتی ہے جو اکثر مؤرّخین نے لکھی ہے کہ آپ کی تلوار کی ضربیں یکتا ہُوا کرتی تھیں، جب آپ سر پر وار کرتے تو لمبائی میں (یعنی اُوپر سے نیچے) کاٹ دیتے اور جب پہلو پر وار کرتے تو عرض میں دو ٹکڑے کر دیتے تھے۔[1]

عمرو بن عبدِ وداب تک کے مقابلوں میں وہ واحد فرد تھا جو علی علیہ السلام کے سامنے کچھ دیر ٹکا۔ مقابلہ کیا جبھی دھُول کے بادل پیدا ہوئے اور وہ بھی ایسے کہ دیکھنے والوں کو لڑائی کا منظر نظر نہیں آ رہا تھا، بس صدائے تکبیر سے اندازہ لگا یا کہ علی علیہ السلام نے عمرو کا کام تمام کر دیا ہے۔

عربوں میں رواج تھا کہ جنگوں میں جب کوئی کسی کو قتل کرتا تو اُس کے قیمتی لباس یعنی زِرّہ وغیرہ پر اپنا حق سمجھتے ہوئے اُسے اُتار کر اپنے قبضے میں لے لیتا۔ محمد و آل محمد علیہم السلام نے کبھی اس رواج کو نہیں اپنایا اور اسے اپنی شان کے منافی سمجھتے ہوئے ہمیشہ اس عمل سے اجتناب فرمایا۔ عمرو بن عبدِ ود اپنی شخصیت کی مناسبت سے نہایت قیمتی زِرّہ پہنے ہوئے تھا لیکن حضرت علی علیہ السلام نے اُسے قتل کرنے کے بعد اُس کی زِرّہ کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہ کیا اور اُسے یونہی چھوڑ کر چلے آئے۔

تاریخ میں ہے کہ جنگ کے بعد اُس کی بہن اُس کی نعش پر پہنچی تو اُس کے جسم پر لباس اور قیمتی زِرّہ موجود پا کر حیران رہ گئی اور کہنی لگی کہ لگتا ہے اسے کسی شریف و کریم شخص نے قتل کیا ہے۔ پھر اُس نے قاتل کا نام پوچھا تو لوگوں نے بتایا کہ اسے علی ابن ابی طالب علیہ السلام نے قتل کیا ہے، یہ سُن کر بولی:

لو کان قاتل عمرو غیر قاتله　　لکنت ابکی علیه آخر الابد
لکن قاتله من لا یعاب به　　من کان یدعی قدیما بیضة البلد[2]

---

[1] علامہ علی نقی نقوی، تاریخ اسلام، ص ۳۰۵

[2] حسین بن محمد دیار بکری (متوفی ۸۹۲ ہجری ۱۵۷۴ء)، تاریخ خمیس ج ۱ ص ۴۸۸

(اگراس قاتل کے علاہ عمرو کا قاتل کوئی اور ہوتا تو میں ابد تک رویا کرتی مگر اس کا قاتل تو وہ ہے جس کے ہاتھوں مرنا کوئی عیب نہیں، کیونکہ وہ تو ہمیشہ سے شہر کا ممتاز آدمی سمجھا جاتا رہا ہے۔)

بعض مؤرخین نے کچھ اضافے کے ساتھ یہ اشعار عمرو بن عبدِود کی ماں سے منسوب کیے ہیں۔ [۱]

عمرو بن عبدِود کے ساتھی

بالائی صفحات پر ذکر کیا جا چکا ہے کہ عمرو بن عبدِود کے ساتھ عکرمہ بن ابوجہل مخزومی، قبیلہ بنی محارب کا ضرار بن خطاب، ہبیرہ بن ابو وہب مخزومی اور نوفل بن عبداللہ جیسے پہلوان بھی اُس کے ساتھ ہو لیے تھے۔ اُنھوں نے علی علیہ السلام کے ہاتھوں اپنے سب سے بڑے پہلوان کا یہ انجام دیکھا تو راہِ فرار اختیار کرنے میں ہی عافیت سمجھی اور خندق کے اُس تنگ حصّے کو جہاں سے وہ آئے تھے گھوڑوں کے ذریعے پھلانگ کر واپس پہنچ گئے۔ [۲]

ابن خلدون کی اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ خندق کے اُس حصّے پر علی علیہ السلام نے جن لوگوں کو مامور کیا تھا وہ اُن بھاگتے ہوئے لوگوں کو روکنے میں کامیاب نہیں ہو سکے یا اُنھوں نے روکنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ علی علیہ السلام نے خود بھی اُن کا پیچھا نہیں کیا جیسا کہ تاریخ کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ آپ بھاگنے والوں کا تعاقب کرنا اپنی شان کے خلاف سمجھتے تھے۔

علامہ دیار بکری لکھتے ہیں کہ عمرو کے قتل کے بعد ضرار بن خطاب اور ہبیرہ بن ابی وہب نے مل کر حضرت علی علیہ السلام پر حملہ کر دیا۔ جب آپ اُن دونوں کی طرف متوجہ ہوئے تو ضرار نے بغور آپ کے چہرے کو دیکھا اور (دونوں نے) یکدم فرار کیا۔ [۳]

---

[۱] شیخ علی بن محمد ابن احمد، مالکی (ابن صباغ) "الفصول المہمّہ فی معرفۃ احوال الائمہ، طبع ایران، ص ۵۰

[۲] ابن خلدون (متوفی ۱۴۰۶ء)، تاریخ ابن خلدون، ج ۲ ص ۵۷۵

[۳] علامہ علی نقی نقوی، تاریخ اسلام، ص ۳۰۸

علی علیہ السلام کے ہاتھوں ایک اور پہلوان کا قتل

ابنِ خلدون نے تو لکھ دیا کہ عمرو کے باقی ساتھی فرار ہو کر خندق کے پار واپس پہنچ گئے لیکن طبری کے بقول عمرو کے ساتھ دو اور آدمی بھی قتل ہوئے تھے۔ اُن میں سے ایک منبہ بن عثمان بن عبید بن سباق بن عبدِ دار تھا جسے ایک تیر لگا تھا جس سے وہ زخمی ہُوا لیکن جانبر نہ ہو سکا اور مکّہ پہنچ کر ہلاک ہو گیا اور دوسرا بنی مخزوم کا نوفل بن عبداللہ بن مغیرہ تھا۔ نوفل بن عبداللہ واپسی پر خندق پار کرتے ہوئے اُس میں گر گیا تھا یا بقولے اُس میں کود پڑا تھا۔[۱] اتنی بلندی سے گرنے کی وجہ سے وہ زخمی ہو گیا۔ مسلمانوں نے اُسے خندق میں پڑے دیکھا تو اُس پر پتھر برسانے لگے۔ زمانۂ قدیم میں رواج تھا، جو آج بھی جنگلوں اور بیابانوں میں رہنے والے چند قبیلوں میں پایا جاتا ہے، کہ جانوروں کا شکار کرنے کے لیے زمین میں ایک بہت بڑا گڑھا کھود دیتے ہیں جس میں سے نکلنا جانور کے لیے ممکن نہیں ہوتا تھا۔ جب کوئی جانور اتفاق سے اُس میں جا گرتا تو لوگ اُسے پتھر مار مار کر مار دیا کرتے تھے۔ اُن جانوروں کی طرح مارے جانے پر نوفل نے احتجاج کرتے ہوئے کہا، ''اے قومِ عرب کے سپوتو! قتل ہی کرنا ہے تو اس سے بہتر طریقے سے کرو۔'' طبری نے لکھا ہے کہ پھر علی علیہ السلام خندق میں اُترے اور اُسے تلوار سے قتل کیا۔[۲]

مشرکین کی خفت

عمرو بن عبدِ ود اور اُس کے ساتھیوں کے قتل اور فرار سے مشرکین کے لشکر پر سخت مایوسی، بے چینی اور جھنجلاہٹ طاری ہو گئی۔ علی علیہ السلام کے ہاتھوں اُن کا غرور خاک میں مل چکا تھا اور ناپاک ارادوں پر پانی پھر گیا تھا۔ اپنی خفت مٹانے کی غرض سے یا پھر اس خوف سے کہ کہیں

[۱] ابو جعفر محمد بن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ھ)، تاریخ طبری (اردو)، ج ۲ حصّہ اوّل، ص ۲۱۸

[۲] ابو جعفر محمد بن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ھ)، تاریخ طبری (اردو)، ج ۲ حصّہ اوّل، ص ۲۱۸

مسلمان خندق عبور کرکے اُن کے سر پر نہ پہنچ جائیں، اُنھوں نے اجتماعی تیراندازی شروع کردی۔ تیروں کی بوچھاڑ ٹڈی دَل کی طرح لشکرِ اسلام کی طرف اُمڈی چلی آرہی تھی۔

ایک کافر حبان بن قیس بن العرقہ نے حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کا نشانہ لے کر تیر چلایا جواُن کی کہنی کے پاس ''اکحل'' نامی رگ میں پیوست ہوگیا۔ اس رگ کو ''عِرقُ الحیوٰۃ'' اور ''ہفت اندام'' بھی کہا جاتا ہے۔ یہ کہنیوں کے جوڑ میں ہوتی ہے۔ ہاتھ میں اس رگ کا نام ''اکحل'' اور پشت میں ''ابہر'' ہے۔ عِرق النساء جو ایک مرض کا نام ہے اُس کی وجہ تسمیہ بھی یہی ہے۔ [1] اگر یہ رگ کٹ جائے تو خون بند نہیں ہوتا حتیٰ کہ تمام جسم کا خون بہہ جاتا ہے اور انسان کی موت واقع ہوجاتی ہے۔ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے سمجھ لیا کہ میرا آخری وقت آپہنچا ہے اور وہ پریشان ہوگئے۔ سعد رضی اللہ عنہ ایک سچّے مسلمان اور کامل مومن تھے، اُنھیں اپنی موت کا ڈر نہیں تھا، غم یہ تھا کہ ابھی جنگ جاری ہے اور نتیجہ کوئی نہیں نکلا۔ وہ چاہتے تھے کہ میں جنگ کے اختتام تک زندہ رہوں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی معیت میں راہِ خدا میں لڑتا رہوں جب تک کہ اللہ کا وعدہ پورا نہیں ہوجاتا اور فتح ونصرت حاصل نہیں ہوجاتی۔ پس اُنھوں نے پُرنم آنکھوں سے آسمان کی طرف دیکھا اور بارگاہِ الٰہی میں فریاد کی:

''پروردگار! مشرکین سے جنگ اگر باقی ہے تو مجھے اُن سے مقابلے کے لیے زندہ رکھ اور اگر جنگ ختم ہوگئی ہے تو پھر اس زخم کو میری شہادت کا ذریعہ بنادے مگر مجھے اُس وقت تک دُنیا سے نہ اُٹھانا جب تک کہ بنوقریظہ کا انجام اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لوں۔'' اُن کی دُعا قبول ہوگئی اور خون بہنا بند ہوگیا۔ [2]

''بنوقریظہ کی بغاوت'' کے باب میں ہم بیان کرچکے ہیں کہ جب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو

---

[1] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۲۲۴

[2] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۲۲۴

بنوقریظہ کی بغاوت کی خبر ملی تو آپ ﷺ نے ایک وفد کو اُن کی طرف روانہ کیا تھا۔ اُس وفد میں حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔ یہودیوں نے بات چیت کرنے کی بجائے وفد کو فحش گالیاں دیں اور بدکلامی کرتے ہوئے واپسی پر مجبور کردیا تھا۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو اُن کے اس برتاؤ پر بہت رنج تھا اور چاہتے تھے کہ اُنھیں اس کی سزا ملے اسی لیے اپنی دُعا میں کہا کہ پروردگار مجھے اُس وقت تک دُنیا سے نہ اُٹھانا جب تک کہ بنوقریظہ کا انجام اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لوں۔

اختتامِ جنگ

اربابِ سیر بیان کرتے ہیں کہ کفّار نے متفق ہوکر خندق کی ہر جانب یکبارگی جنگ (یعنی تیراندازی) شروع کردی جو دن رات جاری رہی۔ [1] تیراندازی مسلسل جاری تھی جو رُکنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ ادھر مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد خوفزدہ اور ہراساں تھی۔ اُن کے خوف وہراس کا یہ عالم تھا کہ بعض لوگ رسول اللہ ﷺ اور اللہ عزوجل کی شان میں گستاخی کرتے ہوئے کہنے لگے کہ اللہ اور اُس کے رسول ﷺ نے ہمیں دھوکا دیا اور اپنا وعدہ پورا نہیں کیا۔ اس کا ذِکر قران پاک نے ان الفاظ میں کیا ہے: [2]

وَاِذْ يَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ مَّا وَعَدَنَا اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ اِلَّا غُرُوْرًا ﴿۱۲﴾ (اور جب منافق اور وہ لوگ جن کے دلوں میں بیماری تھی کہنے لگے کہ اللہ (سبحانہ وتعالیٰ) اور رسول (ﷺ) نے ہم سے (فتح کا) جو وعدہ کیا تھا وہ دھوکے کے سوا کچھ نہیں تھا۔)

منافقوں کی ایسی گفتگو سُن کر نبی اکرم ﷺ کو سخت کوفت ہوئی اور آپ ﷺ نے اپنے خالق و مددگار کی بارگاہ میں دُعا فرمائی، ''اے میرے اللہ! تُو قرآن نازل کرنے والا ہے اور جلد حساب لینے والا ہے اِن قبیلوں کو شکست دے اور اِن کے قدم لڑکھڑا دے اور اِن پر ہماری مدد فرما۔''

---

[1] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۲۲۴

[2] سورۃ الاحزاب، آیت ۱۲

حضرت جابر بن عبداللہ انصاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خندق کی جنگ کے آخری تین دنوں میں ظہر وعصر (کی نمازوں) کے درمیان مسجد فتح میں مسلسل دُعا مانگی۔ پس، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دُعا قبول ہوئی اور حق تعالیٰ شانہٗ نے ایسی آندھی اور زلزلہ بھیجا کہ کفّار کا لشکر تہس نہس ہو گیا، اُن کے خیمے اُکھڑ گئے، چہرے خاک آلودہ ہو گئے، سنگریزوں کی بارش ہونے لگی اور وہ حواس باختہ ہو گئے۔ بروایتے خداوند متعال نے فرشتوں کی ایک جماعت بھیجی جنہوں نے اُن کے خیموں کی طنابیں کاٹ کر آگ لگا دی اور اُن کو ایسا خوفزدہ کیا کہ وہ فرار پر مجبور ہو گئے۔ سخت سرد اور تاریک رات تھی، رسولِ معظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُس ٹیلے پر جہاں بعد میں مسجد فتح تعمیر ہوئی نماز پڑھی اور پھر مسلمانوں سے مخاطب ہوئے۔ محمد بن جریر طبری لکھتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ کو آواز دی اور فرمایا یا حذیفہ! تم دشمن کے ہاں جاؤ اور دیکھ کر آؤ کہ وہ کیا کر رہے ہیں اور جب تک میرے پاس نہ آجاؤ کسی سے کوئی بات نہ کرنا۔[۱]

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کافروں کی طرف چلے گئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پھر نماز میں مصروف ہو گئے۔ نماز کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بہت سوز وگداز کے ساتھ فتح ونصرت کی دُعا مانگی۔ حذیفہ رضی اللہ عنہ نے آکر بتایا کہ آگ سرد پڑی ہے، ایک سخت آندھی جس میں سنگریزے ہیں پوری فوج کو گھیرے میں لیے ہوئے ہے، تمام خیمے اُکھڑ چکے ہیں اور چھولداریاں زمین پر آپڑی ہیں، عالم یہ ہے کہ وہ ڈھالیں منہ پر لیے ہوئے سنگریزوں سے بچاؤ کی کوشش کر رہے ہیں۔'' حذیفہ رضی اللہ عنہ نے کہا سنگریزوں کے اُن کی ڈھالوں سے ٹکرانے کی آوازیں ابھی تک میرے کانوں میں گونج رہی ہیں۔[۲] اس کا ذِکر قرآن کریم میں اللہ جل جلالہ نے یوں فرمایا ہے:[۳]

---

[۱] ابوجعفر محمد بن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ھ)، تاریخ طبری (اردو)، ج ۲ حصہ اوّل، ص ۲۲۲

[۲] علامہ علی نقی نقوی، تاریخ اسلام ص ۱۳-۳۱۳۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۲۲۶

[۳] سورۃ الاحزاب، آیت ۹

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوا اذۡكُرُوۡا نِعۡمَةَ اللّٰهِ عَلَيۡكُمۡ اِذۡ جَآءَتۡكُمۡ جُنُوۡدٌ فَاَرۡسَلۡنَا عَلَيۡهِمۡ رِيۡحًا وَّجُنُوۡدًا لَّمۡ تَرَوۡهَا ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعۡمَلُوۡنَ بَصِيۡرًا ۚ﴿۹﴾

(اے ایمان والو! اللہ کے اُس احسان کو یاد کرو جو اُس نے تم پر کیا ہے جب (کفّار کے) لشکر تم پر چڑھ آئے اور ہم نے (تمھاری مدد کے لیے) اُن پر ہوا (آندھی) بھیجی اور (فرشتوں کے) ایسے لشکر بھیجے جن کو تم نے نہیں دیکھا اور جو کچھ تم کر رہے تھے۔ اللہ اُسے خوب دیکھ رہا تھا۔)

کفّار کا فرار

کفّار عذابِ الٰہی کی تاب نہ لا سکے پس اُن کے پِتّے پانی ہونے لگے اور اُنھوں نے فرار میں عافیت سمجھی۔ ابوسفیان اپنی سواری کے پاس آیا اور پکارا ''النجا النجا'' یعنی بھاگ کر اپنی جان بچاؤ، بھاگ کر اپنی جان بچاؤ۔ یہی صدائے فرار حارث بن عوف نے بھی بلند کی اور تمام فوجیں پسپا ہو کر فرار ہونے لگیں۔[۱] پس ارشادِ خداوند ذوالجلال ہُوا:[۲]

وَرَدَّ اللّٰهُ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا بِغَيۡظِهِمۡ لَمۡ يَنَالُوۡا خَيۡرًا ؕ وَكَفَى اللّٰهُ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ الۡقِتَالَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ قَوِيًّا عَزِيۡزًا ۚ﴿۲۵﴾

(اور اللہ نے کافروں کو غم و غصہ کی حالت میں (بے نیل مُرام) لوٹا یا کہ وہ کوئی فائدہ حاصل نہ کر سکے اور اللہ نے مؤمنوں کو جنگ (کی زحمت) سے بچا لیا اور اللہ بڑا طاقتور (اور) غالب ہے۔)

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّاٰلِ مُحَمَّدٍ○

---

[۱] علامہ طبرسی (متوفی ۵۴۳ء)، اعلام الوریٰ

[۲] سورۃ الاحزاب، آیت ۲۵

غزوۂ بنوقریظہ

(ذیقعد ۵ ہجری/ مارچ ۶۲۷ء)

یہ غزوہ، غزوۂ خندق کے فوراً بعد ہی ذیقعد ۵ ہجری کو واقع ہُوا، بعض مؤرّخین اِس کا مہینہ ذی الحجہ ۵ ہجری لکھتے ہیں[۱] لیکن تاریخ کی مستند کتب ذیقعد ہی بتاتی ہیں۔[۲]

بنوقریظہ یہودیوں کا ایک قبیلہ تھا جو بنونضیر کی طرح بہت بڑا اور طاقتور تھا، اُن ہی کی نسبت سے اِس کو غزوۂ بنوقریظہ کہا جاتا ہے۔ بنوقریظہ کی عہد شکنی اور بغاوت کا کچھ ذِکر گزشتہ صفحات پر غزوۂ خندق کے باب میں ہو چکا ہے۔ جنگِ خندق کے نازک موقع پر اُن کی اُس عہد شکنی کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور مسلمانوں کی پریشانی میں اضافہ ہو گیا تھا۔ مشرکین کے لشکر خندق میں شکست کھا کر واپس ہوئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے مدینہ پہنچ کر بحکمِ الٰہی مسلمانوں کو آرام کرنے کا موقع بھی نہ دیا اور اُسی دن بنوقریظہ کے قلعے کی طرف کُوچ کا حکم صادر فرما دیا، اور سبھی روانہ ہو گئے۔[۳]

روایت ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم غزوۂ خندق سے واپس اپنے رحمت کدے پر تشریف لائے ہی تھے کہ جبرائیل علیہ السلام حاضر ہوئے اور کہا، ''حق تعالیٰ کا حکم ہے کہ فوراً بنی قریظہ کی طرف کوچ کریں اور اُنھیں مہلت نہ دیں۔'' جبرائیل علیہ السلام نے یہ بھی عرض کیا کہ میں نے اور میرے ساتھی فرشتوں نے ابھی جسموں سے ہتھیار نہیں اُتارے، خدا کی قسم! میں جا کر اُن کے قلعوں میں تہلکہ مچاتا ہوں، اُنھیں پامال کرتا ہوں اور ایسا زلزلہ لاتا ہوں جیسا مرغی کے انڈے کو پتھر مارنے پر اُس میں آتا ہے۔[۴] جبرائیل علیہ السلام کا یہ عرض کرنا کہ میں نے اور میرے ساتھی

---

[۱] مولوی عبدالباری، دعوت دہلی، سیرت طیبہ، ۱۲ ربیع الاول ۱۳۹۷ھ، ص ۱۸۳

[۲] ابوالفدا (متوفی ۱۳۳۱ء) تاریخ ابوالفدا، ج ۱ ص ۱۴۳

سید محسن امین عاملی (متوفی ۱۹۵۳ء)، اعیان الشیعہ، ج ۲ ص ۲۳۹

[۳] شذرات الذہب فی اخبار من ذہب لابن العماد الحنبلی، ج ۱ ص ۱۱

[۴] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۲۲۸ بحوالہ صحیح بخاری

فرشتوں نے ابھی جسموں سے ہتھیار نہیں اُتارے، غزوۂ خندق کے تناظر میں تھا یعنی خندق کے معرکے میں وہ نازل ہوئے تھے اور اس وقت اُسی حالت میں تھے جس میں خندق کے میدان میں تھے۔ تاریخ طبری میں حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ غزوۂ خندق سے واپسی پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ہتھیار کھول دیے، دوسرے مسلمانوں نے بھی ہتھیار کھول دیے تھے کہ جبرائیل علیہ السلام آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے پاس حاضر ہوئے اور کہا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ہتھیار رکھ دیے مگر ملائکہ نے اب تک ہتھیار نہیں رکھے، حکمِ الٰہی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم دشمن کے مقابلے پر جائیں اور اُن سے لڑیں۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اپنی زِرّہ منگوا کر پہنی اور تمام مسلمانوں کے ساتھ روانہ ہو گئے۔ [1]

''مدارج النبوّت'' میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی عادت شریفہ تھی کہ جب کسی غزوے یا سفر سے تشریف لاتے تو پہلے سیّدۃُ نساء العالمین حضرت فاطمہ علیہا السلام کے گھر تشریف لاتے اور اُن کو بوسہ دیتے۔ چنانچہ غزوۂ خندق سے واپسی پر بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم حضرت فاطمۃ الزہراء علیہا السلام کے گھر تشریف فرما تھے کہ اچانک ایک شخص نے گھر کے باہر سے سلام عرض کیا، حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم باہر چلے گئے پھر جب واپس تشریف لائے تو فرمایا کہ یہ جبرائیل علیہ السلام تھے اور اُنھوں نے مجھے اللہ کا حکم پہنچایا ہے کہ میں فوراً بنو قریظہ کی طرف متوجہ ہو جاؤں۔ کہا جاتا ہے کہ جبرائیل علیہ السلام، صحابیٔ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم حضرت دحیۃ کلبی رضی اللہ عنہ کے حُلیے میں آئے تھے۔ [2] اس کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو حکم دیا، ''مدینہ میں اعلان کرو کہ اے خدا کے شہسوارو! سوار ہو جاؤ اور یہ بھی کہو کہ جو خدا کے حکم کا فرمانبردار ہے اُسے چاہیے کہ نمازِ عصر بنو قریظہ میں پہنچنے سے پہلے نہ پڑھے۔'' (یعنی نمازِ عصر تک بیٹھے نہ رہیں، فوراً کُوچ کریں اور یہ نماز منزل پر پہنچ کر ادا کریں۔) آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ابن اُمّ کلثومؓ کو مدینہ کا عامل مقرر فرمایا، لشکر کا علم حضرت علی مرتضیٰ علیہ السلام کے سپرد کیا اور اُن کو مقدمۃ الجیش پر مقرر فرمایا پھر تین ہزار مجاہدینِ اسلام

---

[1] ابو جعفر محمد بن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ھ)، تاریخ طبری (اردو)، ج ۲ حصہ اوّل، ص ۲۲۵

[2] شیخ عبد الحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۲۲۸

کے ساتھ بنوقریظہ کی طرف پیش قدمی فرمائی۔[1] راستے میں بنی نجار کے دستے کو دیکھا جو گھوڑوں پر سوار مستعد کھڑا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا منتظر تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُن سے دریافت فرمایا کہ تمھیں یوں مسلح ہو کر انتظار میں کھڑے رہنے کو کس نے کہا تھا؟ اُنھوں نے جواب دیا کہ دحیۃ کلبیؓ کہہ گئے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ وہ جبرائیل تھے جو (ہم سے) پہلے روانہ ہوئے تھے۔[2]

طبری نے لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علی ابن ابی طالب علیہ السلام کو اپنا علم دے کر خود سے پہلے بنوقریظہ کی طرف روانہ کر دیا تھا۔[3] حضرت علی علیہ السلام، بنی نجار، بنی عبدالاشہل اور مہاجرین کی جماعتوں کو لیے بنوقریظہ کے قلعوں کے سامنے پہنچے تو اُنھوں نے قلعے کے اُوپر سے آپ کو دیکھ کر گالیاں بکنا شروع کر دیں اور نہ صرف آپ کی بلکہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان میں بھی طرح طرح کے رکیک جملے کہے۔ اس جاہلانہ حرکت پر آپ خاموش رہے اور پیچھے تشریف لائے جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صحابہ کرامؓ کے حلقے میں تشریف لا رہے تھے۔ آپ نے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! اگر آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) آگے تشریف نہ لے جائیں تو کیا حرج ہے؟ ان شاء اللہ وہ خود رسوا ہو کر رہیں گے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سمجھ گئے کہ وہ لوگ بدزبانی پر اُتر آئیں ہیں۔ علامہ طبرسی کا بیان ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وہیں قیام فرمایا لیکن دیگر موٴرّخین لکھتے ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُن کی یاوہ گوئی کی کوئی پروا نہیں کی اور قلعے کے سامنے تشریف لے گئے۔[4] حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم وہاں شام ڈھلے پہنچے تھے۔ مجاہدین نے وہاں پہنچتے ہی محاصرہ کر لیا جو پندرہ دن، یا پچیس دن رہا۔[5] جب محاصرہ طویل ہُوا تو حق تعالیٰ نے یہودیوں

---

[1] ابن الوردی (متوفی ۱۳۴۹ء)، تاریخ ابن الوردی، ج ا ص ۱۲۲۔ طبری، تاریخ طبری، ج ۲ ص ۲۲۴
ابوالفدا (متوفی ۱۳۳۱ء)، تاریخ ابوالفدا، ج ا ص ۱۴۲۔ عبدالحق محدث دہلوی، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۳۹

[2] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۲۲۸

[3] ابوجعفر محمد بن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ھ)، تاریخ طبری (اردو)، ج ۲ حصہ اوّل ص ۲۲۴

[4] علامہ علی نقی نقوی، تاریخ اسلام ص ۳۱۵ بحوالہ علامہ طبرسی (متوفی ۵۳۲ء)، اعلام الوریٰ

[5] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۲۲۸، بحوالہ ابن سعد و ابن اسحٰق

کے دِلوں پر ایسا رعب وخوف ڈالا کہ اُنھوں نے جنگ کا سلسلہ موقوف کر دیا اور اپنے ایک آدمی نباش بن قیس کے ذریعے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت میں درخواست پیش کی کہ ہم اس شرط پر ہتھیار ڈالنے کو تیار ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہمیں چھوڑ دیں تا کہ ہم اپنے اہل وعیال، مال واسباب اور ہتھیاروں کے ساتھ کہیں اور چلے جائیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اُن کی پیشکش کو بحکمِ خدا مسترد کر دیا۔ وہ عرض پرداز ہوئے کہ ہم اپنے مال واسباب اور اسلحے سے بھی دستبردار ہوتے ہیں ہمیں اجازت دیں کہ بنونضیر کی طرح اپنے اہلِ خانہ ہی کو لے کر نکل جائیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے بحکمِ الٰہی اُن کی یہ پیشکش بھی ٹھکرا دی اور فرمایا کہ غیر مشروط طور پر ہتھیار ڈالو، میں جو چاہوں گا وہ فیصلہ کروں گا۔[1] آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے اس حکم پر بنوقریظہ ششدر رہ گئے۔ اُن کا سردار کعب بن اسد تھا اور اُس کا دوست حیی بن اخطب اُس وقت اُس کا مہمان تھا (یہ وہی حیی بن اخطب ہے جس نے کعب بن اسد کے کہنے پر پر غزوۂ خندق کے موقع پر معاہدے کی تحریر کو پھاڑا تھا)، دونوں نے اپنی قوم کو مشورہ دیا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) پر ایمان لے آؤ کیونکہ یہ وہی ہیں جن کے اوصاف تورات میں بیان کیے گئے ہیں اور اگر تم ان پر ایمان لے آتے ہو تو تمھاری جان اور مال محفوظ رہے گا۔ یہودیوں نے کہا کہ ہم اپنا دِین نہیں چھوڑ سکتے اور تورات پر کسی اور کتاب کو ترجیح نہیں دے سکتے۔

کعب نے کہا کہ تمھارے پاس تین راستے ہیں ان میں سے کسی ایک کا انتخاب کرلو:

ایک یہ کہ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) پر ایمان لے آؤ جیسا کہ میں نے پہلے کہا۔

دوسرا یہ کہ ہم اپنے بیوی بچّوں کو اپنے ہاتھوں قتل کر دیں اور پھر قلعے سے باہر نکل کر مسلمانوں سے مقابلہ کریں۔ اگر مارے گئے تو ہمارے پیچھے مسلمانوں کے ہاتھوں ذلیل ورسوا ہونے کو کوئی نہ ہوگا اور کامیاب ہو گئے تو نئی عورتیں بھی حاصل کرلیں گے اور بچّے بھی پیدا کرلیں گے۔

تیسرا یہ کہ آج کی رات مسلمانوں پر شب خون ماریں اور پھر جو ہوگا دیکھا جائے گا۔

بنوقریظہ نے کعب کے تینوں مشوروں کو مسترد کر دیا تو اُس نے کہا کہ پیدائش سے لے کر عمر بھر تم

---

[1] ابوعبداللہ محمد بن عمر واقدی (متوفی ۸۲۲ء)، المغازی للواقدی، ج ۲ ص ۵۰۱

میں سے کوئی شخص ایک شب میں بھی دُور اندیش ثابت نہیں ہُوا۔[1] پھر ایک روز محاصرے کی طوالت سے گھبرا کر شکست خوردہ حالت میں وہ قلعے سے باہر آ گئے اور کہا کہ ہمارے متعلق سعد بن معاذ (رضی اللہ عنہ) جو فیصلہ کریں گے وہ ہمیں منظور ہے۔ علامہ طبرسی لکھتے ہیں، ''رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے پچیس دن تک اُن کا محاصرہ قائم رکھا یہاں تک کہ اُن لوگوں نے سعد بن معاذ (رضی اللہ عنہ) کے فیصلے پر انحصار کر کے ہتھیار ڈال دیے۔''[2] حضرت سعد (رضی اللہ عنہ) خندق کے غزوے میں زخمی ہونے کی وجہ سے اس غزوے میں شریک نہیں ہو سکے تھے اور پیچھے رہ گئے تھے چنانچہ اُنھیں لانے کے لیے ایک شخص کو روانہ کیا گیا۔

حضرت سعد بن معاذ (رضی اللہ عنہ) کی نامزدگی کی وجہ

حضرت سعد بن معاذ (رضی اللہ عنہ) کی بنوقریظہ کے معاملے میں بطور ثالث نامزدگی کی ایک وجہ تو بنوقریظہ کی اپنی پیشکش تھی کیوں کہ حضرت سعدؓ اُن کے بہت اچھے دوست اور حلیف تھے اور وہ اُن پر بہت اعتماد کرتے تھے۔ دوسری وجہ مورخین یہ بیان کرتے ہیں کہ مدینہ میں سب سے پہلے یہودیوں کے قبیلے بنوقینقاع نے غداری کی تھی جو قبیلہ خزرج کے حلیف تھے اور اُس وقت کا بڑا منافق عبداللہ بن اُبی قبیلہ خزرج کا ایک اہم فرد تھا اس لیے جب بنوقینقاع نے ہتھیار ڈالے تو اُس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے بڑی پُرزور سفارش کی کہ بنوقینقاع کے ساتھ نرمی برتی جائے، وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے آگے گڑگڑانے لگ گیا تھا اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اُن کو یہ رعایت دے دی کہ وہ سلامتی کے ساتھ مدینہ سے باہر چلے جائیں۔ بالفاظ دیگر خزرج والوں کی سفارش پر اُن کے حلیف یہودی قبیلہ بنوقینقاع کو رعایت مل گئی تھی۔ بنوقریظہ مدینے کے دوسرے بڑے قبیلے اوس کا دوست تھا۔ اُن کا معاملہ درپیش آیا تو خزرج کی دیکھا دیکھی اوس والے اپنے حلیفوں کی

---

[1] ابوجعفر محمد بن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ھ)، تاریخ طبری (اردو)، ج ۲ حصّہ اوّل ص ۲۲۵، ۲۲۶

[2] علامہ علی نقی نقوی، تاریخ اسلام ص ۳۱۷، ۳۱۸ بحوالہ علامہ طبرسی (متوفی ۵۳۲ء)، اعلام الوریٰ

حمایت میں اُٹھ کھڑے ہوئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہنے لگے کہ جس طرح خزرج کے دوست قبیلے قینقاع کو عبداللہ بن اُبی کی سفارش پر بخش دیا گیا تھا اُسی طرح ہمارے حلیف بنی قریظہ پر بھی کرم فرمائیں۔ یہودی پہلے ہی کہہ چکے تھے کہ ہمارے متعلق سعد بن معاذ (رضی اللہ عنہ) جو فیصلہ کریں گے وہ ہمیں منظور ہے پس، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا،''کیا تم اس پر تیار ہو کہ اِن کا معاملہ سعد بن معاذ پر چھوڑ دیا جائے؟'' سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کیونکہ قبیلہ اوس کے سردار تھے اس لیے وہ لوگ بخوشی اس پر تیار ہو گئے۔[1]

حضرت سعد رضی اللہ عنہ آئے تو اوس کے لوگ اُن کی طرف بھاگے اور کہا کہ نبی اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بنو قریظہ کی قسمت کا فیصلہ آپ پر چھوڑا ہے۔ یہ آپ کے حلیف بھی ہیں اور ان کی ساری اُمیدیں اب آپ سے وابستہ ہیں لہٰذا آپ اِن پر شفقت کریں تاکہ یہ قتل ہونے سے بچ جائیں۔ حضرت سعد رضی اللہ عنہ خاموش رہے۔ اوس کے لوگ اُن کی منت سماجت کرنے لگے اور جب اُن کا اصرار بہت بڑھ گیا تو حضرت سعد رضی اللہ عنہ کہنے لگے،''یہ وقت ایسا نہیں کہ خدا کے دشمنوں کی سفارش کی جائے۔'' اوسی مایوس ہو گئے اور سمجھ گئے کہ بنو قریظہ قتل ہی کیے جائیں گے۔[2]

حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم پر بڑے احترام کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر کیا گیا۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُن سے فرمایا،''اے سعد! ان کے بارے میں حکم دو۔'' حضرت سعد رضی اللہ عنہ نے کہا،''حکم تو صرف خدا اور اُس کا رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی دے سکتے ہیں۔'' آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا،''بے شک، (لیکن) تمھیں حق تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ ان کا فیصلہ تم کرو۔''[3]

ہمارا خیال ہے کہ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کو یہ مقام و مرتبہ غزوۂ خندق میں اُن کے

---

[1] علامہ علی نقی نقوی، تاریخ اسلام ص ۳۱۷، ۳۱۸ بحوالہ علامہ طبرسی (متوفی ۵۳۲ء)، اعلام الوریٰ

[2] ابن الوردی (متوفی ۷۴۹ھ ۱۳۴۹ء)، تاریخ ابن الوردی، ج ۱ ص ۱۱۲
ابوجعفر محمد بن جریر طبری، (متوفی ۳۱۰ھ)، تاریخ طبری، طبع جدید، ج ۲ ص ۵۸۷

[3] ابن الوردی (متوفی ۷۴۹ھ ۱۳۴۹ء)، تاریخ ابن الوردی، ج ۱ ص ۱۱۲

ساتھ بنو قریظہ کے توہین آمیز سلوک کے بعد اُن کی مانگی گئی دُعا کی قبولیت کی وجہ سے ملا تھا۔ تیر کا مہلک زخم آنے کے بعد اُنھوں نے دُعا کی تھی کہ پروردگار! مشرکینِ قریش سے جنگ اگر باقی ہے تو مجھے اُن سے مقابلے کے لیے زندہ رکھ اور اگر ختم ہو چکی ہے تو پھر اس زخم کو میری شہادت کا ذریعہ بنا دے مگر مجھے اُس وقت تک دُنیا سے نہ اُٹھانا جب تک کہ بنو قریظہ کا انجام اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لوں۔'' چنانچہ اُن کی دُعا قبول ہو گئی تھی اور خون بہنا بند ہو گیا تھا۔ [۱]

اوس کے لوگوں نے ایک بار پھر بنو قریظہ کے لیے حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کی منت سماجت شروع کر دی، اس پر اُنھوں نے کہا، ''تم سے اللہ تعالیٰ کا عہد و میثاق یہ ہے کہ میں جو حکم کروں تم سب اُسے تسلیم کرو۔'' سب نے کہا، ''ہم تسلیم کریں گے۔''

اربابِ سیر نے یہاں بڑی عجیب ولطیف اور گہری بات لکھی ہے کہ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعظیم و توقیر اور ادب واحترام کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو براہِ راست مخاطب کرنے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانب رُخ کر کے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو متوجہ کرنے سے اجتناب کیا اور یوں کہا، ''جو یہاں موجود ہیں کیا وہ میرے حکم پر راضی ہیں؟'' [۲]
حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، ''حکم وہی ہے جو تم کرو گے۔'' پس، حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے حکم دیا، ''بنی قریظہ کے مردوں کو قتل کر دیا جائے، ان کی عورتوں اور بچّوں کو باندیاں اور غلام بنا لیا جائے اور ان کے ساز و سامان اور اموال کو مسلمانوں میں تقسیم کر دیا جائے۔''
رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، ''اے سعد! تم نے ان کے بارے میں وہ حکم دیا ہے جو حق تعالیٰ نے ساتوں آسمانوں کے اُوپر سے کیا تھا۔'' [۳]

---

[۱] ابن الوردی (متوفی ۷۴۹ھ ۱۳۴۹ء)، تاریخ ابن الوردی، ج ۱ ص ۱۱۲

[۲] ابو جعفر محمد بن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ھ)، تاریخ طبری (اردو)، ج ۲ حصّہ اوّل، ص ۲۲۸
شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۲۳۲

[۳] ابو جعفر محمد بن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ھ)، تاریخ طبری (اردو)، ج ۲ حصّہ اوّل، ص ۲۲۸
شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۲۳۲

بنوقریظہ کا انجام

حضرت سعد رضی اللہ عنہ کے فیصلے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم دیا کہ بنوقریظہ کا تمام مال ومتاع اور اسلحہ جمع کرلو اور اُنھیں گرفتار کرکے مدینہ لے چلو۔ اُن کے قلعے سے برآمد ہونے والے سامان میں پندرہ سو (۱۵۰۰) تلواریں، تین سو (۳۰۰) زرّہیں، دو ہزار (۲۰۰۰) نیزے اور پانچ سو (۵۰۰) یا بروایتے پندرہ سو (۱۵۰۰) مختلف اقسام کی ڈھالیں تھیں، اس کے علاوہ شراب کا بہت بڑا ذخیرہ بھی تھا جسے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم سے بہا دیا گیا۔[۱] اسلحے کی اتنی بڑی مقدار سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک بڑی جنگ کے لیے تیار تھے۔

مدینہ پہنچ کر مرد قیدیوں کو اُسامہ بن زید کے مکان میں بھیج دیا گیا اور عورتوں اور بچّوں کو ایک خاتون بنتِ حارث کے مکان میں پہنچا دیا گیا، پھر رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم پر قیدیوں کے لیے دونوں جگہ کھجوروں کے ٹوکرے بھجوائے گئے جو اُنھوں نے سیر ہوکر کھائے۔[۲]

اگلی صبح رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم پر جا بجا گڑھے کھودے گئے پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کچھ اصحاب کے ساتھ ایک جگہ تشریف فرما ہوئے جہاں بنی قریظہ کے لوگوں کو لایا جاتا اور اُن کی گردنیں قلم کردی جاتیں۔ واقدی کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے طرزِ عمل سے بالکل نمایاں تھا کہ وہ اسے ایک ناخوشگوار فریضہ سمجھ رہے تھے جسے مجبوراً اُن جرائم کی شدت کی بنا پر ادا کیا جارہا تھا جن کا ارتکاب بنوقریظہ نے کیا تھا اور اس فریضے کی ادائیگی میں کوئی انتقام یا دشمنی کا جذبہ قطعاً نہیں تھا چنانچہ جو لوگ قتل کیے جارہے تھے اُن کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے ترحم کے جذبات بھی کارفرما تھے اس لیے دوپہر کے وقت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اب گرمی زیادہ ہوگئی ہے انھیں سائے میں لے جاؤ اور لیٹنے کا موقع دو اور ٹھنڈا پانی پلاؤ تاکہ انھیں سکون ملے اور باقی ماندہ لوگوں کو دوسرے وقت قتل کرنا، ایسا نہ ہو کہ سورج کی گرمی اور ہتھیار کی گرمی دونوں کو ان پر

---

[۱] ابوعبداللہ محمد بن عمر واقدی (متوفی ۸۲۲ء)، واقدی، ج ۲ ص ۵۰۹۔ مدارج النبوت ج ۲ ص ۲۳۱

[۲] ابوعبداللہ محمد بن عمر واقدی (متوفی ۸۲۲ء)، واقدی ج ۲ ص ۵۱۲

ایک ساتھ مسلط کردو۔ یہ سُن کر اصحاب اُنھیں لے گئے، آرام دہ جگہوں پر رکھا اور کھانا پانی پہنچایا۔ جب ٹھنڈا وقت ہُوا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پھر تشریف لائے اور باقی افراد کو قتل کیا گیا۔[1]

اسی دوران میں بنونضیر کے سردار حیی بن اخطب کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے پیش کیا گیا۔ وہ ملعون آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے انتہائی بغض وعناد رکھتا تھا۔ جس وقت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہجرت فرما کر مدینہ میں رونق افروز ہوئے تھے تو وہ صبح وشام آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قریب موجود رہتا اور منافقت برتا کرتا۔ اُس کے بھائی یاسر بن اخطب نے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں اُس سے پوچھا کہ کیا یہ وہی مقدس ہستی ہیں جن کے اوصاف ہم تورات میں پڑھتے ہیں؟ اُس نے تمسخر سے کہا ''ہو ہو'' یعنی یہ ہیں تو وہی لیکن میرے دل میں ان کے لیے عداوت کے سوا کچھ نہیں۔ جب اُسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے پیش کیا گیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، ''اے دشمنِ خدا! آخر کار حق تعالیٰ نے تمھیں میرا اسیر بنا دیا، تم پر ذلت وخواری مسلط کردی اور مجھے تم پر غالب کر کے حاکم بنایا۔'' وہ شقی القلب اب بھی خودسری اور گستاخی سے باز نہ آیا اور کہنے لگا، ''میں خود کو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی عداوت کی وجہ سے ملامت نہیں کروں گا مگر جس کو اللہ رسوا کرے اُسے کوئی عزت نہیں ملتی، میں نے اپنی عزت تلاش کی اور خدا نے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو ظفر مند کیا۔'' شاید وہ کچھ اور بھی کہتا لیکن حیدر کرار علی علیہ السلام نے ذوالفقار کھینچی اور اُس گستاخ کا سر تن سے جدا کر دیا۔

اُس کے بعد کعب بن اسد کو لایا گیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُس سے فرمایا، ''اے کعب! ایمان لے آؤ، تم تو اچھی طرح جانتے ہو کہ میں رسولِ برحق ہوں۔'' کعب نے کہا، ''میں آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی تصدیق اور اطاعت کرتا لیکن مجھے شرم آتی ہے کہ لوگ کہیں گے عاجز ہو کر اور جان کے خوف سے ایمان لے آیا، پس میں دینِ یہود پر ہوں اور اُسی پر مروں گا۔'' آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم پر حضرت علی مرتضیٰ علیہ السلام نے اُسے بھی جہنم واصل کر دیا۔

ارباب سیر کہتے ہیں اُس دن حضرت علی علیہ السلام اور حضرت زبیرؓ، رات تک بنوقریظہ کے قتل میں مصروف رہے جن کی مجموعی تعداد چار سو تھی۔ بعض نے یہ تعداد چھ سو، سات سو اور نو سو

---

[1] ابوعبداللہ محمد بن عمر واقدی (متوفی ۸۲۲ء)، واقدی ج ۲ ص ۵۱۴

بھی لکھی ہے لیکن مؤرّخین کی اکثریت چار سو والی روایت پر متفق ہے۔ کچھ قیدیوں کو آزاد کر دیا گیا، بعض کو ہِبہ (کسی کو دے دینا) کر دیا گیا اور اُن کا مال و اسباب مسلمانوں میں تقسیم کر دیا گیا۔[۱] واقدی کے مطابق مقتولین کی تعداد ساڑھے سات سو تھی۔ عورتوں اور بچّوں کو کنیزوں اور غلاموں کی حیثیت سے فروخت کر دیا گیا جن کی تعداد ایک ہزار تھی، اُن کے بارے میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تاکید فرمائی کہ کسی ماں سے اُس کے بچّے کو اُس وقت تک جدا نہ کیا جائے جب تک وہ سنِ بلوغت کو نہ پہنچ جائے۔[۲]

علامہ علی نقی نقوی نے ''تاریخ اسلام'' میں میرے دل کی بات لکھی ہے، فرماتے ہیں، ''دل کہتا ہے اگر وہ (بنوقریظہ) اپنے آپ کو خدا اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے رحم و کرم پر چھوڑتے تو اُنھیں اتنے تباہ کن انجام کا سامنا شاید نہ کرنا پڑتا، مگر اُنھوں نے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلقِ عظیم پر بے اعتمادی سے کام لیتے ہوئے اپنے ذاتی تعلقات پر بھروسا کیا اور سعد بن معاذؓ کو ثالث بنا دیا جس کے بعد فیصلہ کی ذمہ داری خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر بالکل نہ رہی۔ اُنھیں سعد بن معاذؓ کے ذاتی تعلقات پر بھروسا تھا جو اُنھوں نے اُن کا نام ثالثی کے لیے پیش کیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سعدؓ کے خلوصِ ایمانی پر اعتماد تھا جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُن کی اس پیشکش کو قبول فرما لیا۔''[۳]

سطحی نظر سے دیکھا جائے تو یہ فیصلہ مناسب معلوم نہیں ہوتا لیکن شریعت، قانون اور عدل و انصاف کی رُو سے دیکھا جائے تو یہ فیصلہ بالکل درست ہے۔ جیسا کہ اُوپر ذِکر کیا جا چکا ہے کہ فیصلے کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت سعد بن معاذؓ سے فرمایا، ''اے سعد! تم نے ان کے بارے میں وہ حکم دیا ہے جو حق تعالیٰ نے ساتوں آسمانوں کے اُوپر سے کیا تھا۔''[۴]

---

[۱] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۲۲۷

[۲] ابو عبداللہ محمد بن عمر واقدی (متوفی ۸۲۲ء)، واقدی، ج ۲ ص ۵۱۸، ۵۲۳، ۵۲۴

[۳] علامہ علی نقی نقوی، تاریخ اسلام، ص ۳۱۹

[۴] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۲۲۷

مولانا شبلی نعمانی لکھتے ہیں کہ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ نے جو فیصلہ کیا وہ تورات کے مطابق تھا، تورات کتاب تشنیہ اصحاح ۲۰ فقرہ ۱۰ میں ہے، ''جب کسی شہر پر حملہ کرنے کے لیے تُو جائے تو پہلے صلح کا پیغام دے۔ اگر وہ صلح کرلیں اور تیرے لیے دروازے کھول دیں تو جتنے لوگ وہاں موجود ہوں سب تیرے غلام ہوجائیں گے لیکن اگر صلح نہ کریں تو اُن کا محاصرہ کراور جب تیرا خدا تجھ کو اُن پر قبضہ دلا دے تو جس قدر مرد ہوں سب کو قتل کردے۔ باقی بچّے، عورتیں، جانور اور جو چیزیں شہر میں موجود ہوں سب تیرے لیے مالِ غنیمت ہوں گی۔''[۱]

ڈاکٹر عبدالعلیم لکھتے ہیں، '' دراصل بنوقینقاع اور بنونضیر (بنوقریظہ سے پہلے بغاوت کرنے والے یہودی قبیلے) کے ساتھ جو سلوک کیا گیا تھا وہ انصاف نہیں تھا بلکہ اس میں رحم کی کارفرمائی نظر آتی ہے اس لیے کہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم جیسا رحیم انسان اُس (رحم کی کارفرمائی) کا ذمہ دار ہے۔ ہاں بنوقریظہ کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا گیا اور سختی کے ساتھ وہ سزا دی گئی جس کے وہ مستحق تھے۔ اگر کسی کو اس میں بے جا شدت نظر آتی ہے تو اُس کے ذمہ دار رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نہیں بلکہ سعد بن معاذ رض ہیں جو بنوقریظہ کے دوست تھے اور جنھیں خود اُنھوں نے نامزد کیا تھا۔ یورپی مؤرّخ لین پول لکھتا ہے کہ سزا سخت تھی لیکن یہ فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ اُن لوگوں کا جرم حکومت سے کھلم کھلا بغاوت تھی اور وہ بھی محاصرے کے زمانے میں۔ جو لوگ یہ پڑھ چکے ہیں کہ ولنگٹن کی فوج کے راستے کا پتا غداروں اور ڈاکوؤں کی اُن لاشوں سے چلتا تھا جو اِدھر اُدھر درختوں پر لٹکتی ہوتی تھیں تو اُنھیں تو کم از کم ایک غدار قبیلے کے قتل کیے جانے پر متعجب نہیں ہونا چاہیے۔''[۲]

حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کی شہادت

جب بنوقریظہ کے یہود اپنے انجام کو پہنچ گئے تو حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کا زخم پھر سے کھل گیا اور خون بہنے لگا یہاں تک کہ وہ اللہ کو پیارے ہوگئے۔ روایت ہے کہ اُن کی رِحلت

---

[۱] مولانا شبلی نعمانی (متوفی ۱۹۱۴ء)، سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم، حصہ اوّل ص ۴۳۵

[۲] ڈاکٹر عبدالعلیم، سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور مستشرقین، ص ۶۷

کے وقت حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اُن کے سرہانے تشریف فرما تھے اور اُن کے سر کو اپنے زانوئے اقدس پر رکھے ہوئے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دُعا فرمائی، ''یا اللہ! سعد کو اپنی رحمتوں سے ڈھانپ لے، اس نے تیرے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی صداقت کی تائید کی اور اسلام کے جو حقوق اس پر عائد تھے ادا کیے اور تُو اس کی رُوح کو بہترین طریقے سے کہ جس طرح تُو اپنے پیاروں کی روحوں کو قبض کرتا ہے قبض فرما۔'' رسولِ معظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے الفاظ حضرت سعد رضی اللہ عنہ کی سماعت تک پہنچے تو آنکھیں کھولیں اور عرض کیا، ''اَلسَّلَامُ عَلَیْكَ یَا رَسُوْلَ اللہ'' پھر کہا، ''میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اللہ کے رسول ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خوب تبلیغِ رسالت کا حق ادا فرمایا۔'' پھر اُنھوں نے اپنے سر کو رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زانوئے مبارک سے اُٹھایا اور معذرت خواہی کرتے ہوئے رخصت کی اجازت طلب کی۔

منقول ہے کہ حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ سفرِ آخر پر روانہ ہوئے تو جبرائیل علیہ السلام بارگاہِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابی کی رُوح کے استقبال کے لیے آسمانوں کے دروازے کھولے گئے ہیں۔

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کی تجہیز و تکفین کے لیے تشریف لے گئے۔ سعد رضی اللہ عنہ طویل القامت اور تنومند تھے لیکن اُن کا جنازہ بہت ہلکا تھا جس پر لوگوں نے حیرت کا اظہار کیا تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ سعد کے جنازے کو فرشتوں نے اُٹھا رکھا تھا اس وجہ سے ہلکا لگتا تھا اور فرمایا کہ اُس کے جنازے میں ستر ہزار فرشتے موجود تھے۔[1]

حضرت ابولبانہ رضی اللہ عنہ کی پشیمانی

غزوۂ بنوقریظہ کے حوالے سے حضرت ابولبانہ رفاعہ بن عبدالمنذر اوسی رضی اللہ عنہ کا ایک واقعہ تاریخ میں بہت مشہور ہے۔ ابولبانہ رضی اللہ عنہ، بنوقریظہ کے حلیف اور دوست تھے اس لیے محاصرے کے دوران میں نبی اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُنھیں مذاکرات کے لیے بنوقریظہ کی طرف روانہ

---

[1] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۲۳۴

کیا۔ وہ قلعے میں پہنچے تو یہودیوں نے اُن کا پرتپاک استقبال کیا۔ اُن کی عورتیں اور بچّے اُن کے سامنے محاصرے کی وجہ سے ہونے والی پریشانی کی شکایت کر کے گریہ وزاری کرنے لگے۔ حضرت ابولبابہ اُن کی حالتِ زار سے بہت متاثر ہوئے چنانچہ بات چیت کے دوران میں جب اُنھوں نے پوچھا کہ ہم ہتھیار ڈال کر قلعے سے باہر آجائیں تو ہمارے ساتھ کیا سلوک کیا جائے گا؟ ابولبابہ نے اپنے حلق پر ہاتھ پھیر کر اشارہ کیا کہ تم قتل کر دیے جاؤ گے۔ معاً اُنھیں خیال آیا کہ میں نے یہ کیا کر دیا؟ یہ تو قومی اور فوجی نکتہ نگاہ سے غداری اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے حق میں سراسر خیانت ہے چنانچہ استغفار پڑھنے لگے اور اپنی غلطی پر نادم و گریہ کناں ہوئے۔ پھر بغیر اپنے ساتھیوں سے ملے یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے، مسجد نبوی پہنچے اور ایک ستون کے ساتھ خود کو باندھ لیا۔ (مسجد نبوی میں ''اسطوانہ ابولبانہ'' کے نام سے موسوم ستون آج بھی موجود ہے) ستون کے ساتھ بندھ جانے کے بعد ابولبانہ رضی اللہ عنہ کہتے تھے کہ میں یہاں سے اُس وقت تک نہ جاؤں گا جب تک کہ میری توبہ قبول نہ ہو اور حق تعالیٰ میرے اس گناہ کو بخش نہ دے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو خبر ہوئی تو فرمایا کہ اگر وہ میرے پاس آجاتے تو میں اُن کے لیے دُعائے مغفرت کرتا۔ پس قرآن حکم میں ارشادِ حق تعالیٰ ہُوا:[1]

وَلَوْ اَنَّهُمْ اِذْ ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ جَآءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَهُمُ الرَّسُوْلُ لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ﴿٦٤﴾ (اور اگر یہ لوگ جب انھوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا تھا، آپ (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کے پاس آجاتے اور اللہ تعالیٰ سے استغفار کرتے اور رسول (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) بھی ان کے لیے استغفار کرتے تو یقیناً یہ لوگ اللہ تعالیٰ کو معاف کرنے والا مہربان پاتے۔)

چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ اب تو ابولبانہ نے بارگاہِ الٰہی میں حاضر ہو کر خود کو باندھ لیا ہے اس لیے میں اُس وقت تک اُسے نہیں کھول سکتا جب تک کہ حق تعالیٰ اُس کی توبہ نہ قبول فرمائے اور اُس کے گناہ کو بخش نہ دے۔

---

[1] سورۃ النساء، آیت ٦٤

حضرت ابولبانہ رضی اللہ عنہ کی بیٹی مسجد میں آتی اور اُنھیں کچھ کھلا پلا جاتی، نماز کے وقت یا قضائے حاجت کے لیے اُن کو کھولا جاتا اس کے بعد وہ پھر خود کو بھاری زنجیر سے باندھ لیتے۔ پندرہ دن اسی طرح گذر گئے، اُن کی سماعت جاتی رہی اور قریب تھا کہ بینائی بھی رخصت ہو جاتی کہ توبہ کی قبولیت کی نوید وحیِ الٰہی کی صورت میں آئی۔ روایت ہے کہ جناب سرورِ انبیا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اُمّ المومنین حضرت اُمّ سلمہؓ کے گھر تشریف فرما تھے، سحری کا وقت تھا کہ حضرت اُمّ سلمہؓ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تبسم فرماتے دیکھا۔ اُنھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس کی وجہ دریافت کی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ ابولبانہ کی توبہ قبول ہو گئی ہے اور اُن کو بخش دیا گیا ہے۔ حضرت اُمّ سلمہؓ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! اگر آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اجازت مرحمت فرمائیں تو میں جا کر اُنھیں یہ بشارت دے دوں؟ فرمایا، ''اگر تمھاری خواہش ہے تو جا کر اُنھیں یہ نوید سنا دو۔'' اس کے بعد بی بی اپنے حجرے کے دروازے پر کھڑی ہوئیں اور کہا، ''اے ابولبانہ! تمھارے لیے خوشخبری ہے کہ تمھاری توبہ قبول ہو گئی ہے۔'' (اربابِ سیر لکھتے ہیں کہ یہ واقعہ آیتِ حجاب کے نازل ہونے سے پہلے کا ہے) یہ سننا تھا کہ مسجد میں موجود لوگ حضرت ابولبانہ رضی اللہ عنہ کو کھولنے کے لیے دوڑے مگر اُنھوں نے کہا کہ ''تم'' مجھے مت کھولو۔ میری آرزو ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود اپنے دستِ مبارک سے مجھے آزاد فرمائیں۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسجد میں تشریف لائے تو اپنے دستِ مبارک سے اُن کو بندشوں سے آزاد فرمایا۔[۱]

شیخ عبدالحق محدث دہلوی لکھتے ہیں کہ مؤلف ''المواھبُ اللدنیہ'' و مؤلف ''دلائل النبوۃ'' بیہقی اور محمد بن اسحٰق، حضرت ابولبانہ رضی اللہ عنہ کا مندرجہ بالا واقعہ غزوۂ بنو قریظہ کے حوالے سے بیان کرتے ہیں جب کہ بقولِ ابن مسیّب اور بروایتِ ابن عباس رضی اللہ عنہ اُن کا اس طرح بندھنا غزوۂ تبوک میں اُن کے پیچھے رہ جانے کی بنا پر تھا۔[۲]

---

[۱] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۲۲۷

[۲] عبدالحق محدث دہلوی، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۲۲۷ بحوالہ المواہب اللدنیہ، دلائل النبوۃ

حجاب کا حکم

(یکم ذیقعد ۵ ہجری/ ۲۴ مارچ ۶۲۷ء)

زمانۂ جاہلیت کے عربوں میں پردے کا کوئی رواج نہیں تھا اور ایک دوسرے کے گھروں میں آزادانہ آنے جانے پر کوئی قدغن نہیں تھی بلکہ اسے باہمی محبت و یگانگت پر محمول کیا جاتا تھا۔ آپس میں جان پہچان رکھنے والے لوگ ایک دوسرے کے گھروں میں بلا جھجک آتے جاتے تھے اس طرح گھریلو پردہ داری اور خلوت کا کوئی تصور نہیں تھا۔ خواتین گھروں میں اکیلی ہوں اور غیر مردوں کی آمد و رفت ایک معمول ہو تو ایسی آزادی بے راہروی کا سبب بن سکتی ہے چنانچہ نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ایسی ممکنہ بے راہروی کا سدِ باب کر دیا اور فرمایا کہ ایک دوسرے کے گھروں میں بغیر اجازت یوں آزادانہ مت داخل ہُوا کرو اور اگر ان گھروں میں کسی آدمی کو نہ پاؤ تو بھی نہ آیا جایا کرو اور اگر تم سے کہا جائے کہ لوٹ جاؤ تو واپس چلے جایا کرو کیونکہ یہ طریقہ بہت پاکیزہ ہے۔ پس، ارشادِ خداوند متعال ہُوا:[۱]

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَدْخُلُوْا بُیُوْتًا غَیْرَ بُیُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا وَ تُسَلِّمُوْا عَلٰۤى اَهْلِهَاؕ ذٰلِكُمْ خَیْرٌ لَّكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ۝۲۷ فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فِیْهَاۤ اَحَدًا فَلَا تَدْخُلُوْهَا حَتّٰى یُؤْذَنَ لَكُمْۚ وَ اِنْ قِیْلَ لَكُمُ ارْجِعُوْا فَارْجِعُوْا هُوَ اَزْكٰى لَكُمْؕ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِیْمٌ۝۲۸

(اے ایمان والو! اپنے گھروں کے سوا دُوسروں کے گھروں میں داخل نہ ہُوا کرو جب تک کہ اجازت نہ لے لو اور گھر والوں پر سلام نہ کر لو، یہی تمھارے لیے بہتر ہے تاکہ نصیحت حاصل کرو۔

---

[۱] سورۃ النور، آیت ۲۷، ۲۸

پھر اگر اُن (گھروں) میں کسی (آدمی) کو نہ پاؤ تو اُن میں داخل نہ ہوا کرو جب تک کہ تمھیں اجازت نہ مل جائے اور اگر تم سے کہا جائے کہ واپس چلے جاؤ تو واپس چلے جایا کرو، یہ (طریقہ) تمھارے لیے زیادہ پاکیزہ ہے اور تم جو کچھ کرتے ہو اللہ اُسے خوب جانتا ہے۔)

ایک طرف تو نبی گرامی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لوگوں کے ایک دوسرے کے گھروں میں آزادانہ داخلے پر پابندی لگا کر اس کا ایک بہترین طریقہ بھی وضع فرمادیا تو دوسری طرف مردوں کو حکم دیا کہ تاک جھانک کی عادت ٹھیک نہیں اس لیے اپنی نظریں نیچی رکھا کرو، بدکاری سے بچو کیونکہ یہ پاکیزہ اور بہترین طریقہ ہے۔ چنانچہ ارشادِ الٰہی ہوتا ہے:[1]

قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ؕ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا يَصْنَعُوْنَ۝۳۰

(اے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! آپ مؤمن مردوں سے کہہ دیجیے کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں یہ (طریقہ) اُن کے لیے زیادہ پاکیزگی کا باعث ہے۔ بے شک لوگ جو کچھ کیا کرتے ہیں اللہ اُس سے خوب واقف ہے۔)

معلّمِ اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جہاں مردوں کو آدابِ معاشرت سکھائے وہاں عورتوں کو بھی تنبیہ فرمادی کہ تم بھی اپنی نگاہیں نیچی رکھا کرو، برائی سے اجتناب کیا کرو اور اپنی آرائش و زیبائش کو ظاہر نہ کیا کرو یعنی پردہ کیا کرو۔ اور ساتھ ہی اس کی وضاحت بھی فرمادی کہ تمھیں کن لوگوں سے پردہ کرنا ہے اور کن لوگوں کے سامنے اس کی ضرورت نہیں۔ پس اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے فرمادیا:[2]

وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ ۖ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا لِبُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ

---

[1] سورۃ النور، آیت ۳۰

[2] سورۃ النور، آیت ۳۱

اٰبَآئِهِنَّ اَوْ اٰبَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اَبْنَآئِهِنَّ اَوْ اَبْنَآءِ بُعُوْلَتِهِنَّ اَوْ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِیْٓ اِخْوَانِهِنَّ اَوْ بَنِیْٓ اَخَوٰتِهِنَّ اَوْ نِسَآئِهِنَّ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَیْمَانُهُنَّ اَوِ التّٰبِعِیْنَ غَیْرِ اُولِی الْاِرْبَةِ مِنَ الرِّجَالِ اَوِ الطِّفْلِ الَّذِیْنَ لَمْ یَظْهَرُوْا عَلٰی عَوْرٰتِ النِّسَآءِ ۪ وَلَا یَضْرِبْنَ بِاَرْجُلِهِنَّ لِیُعْلَمَ مَا یُخْفِیْنَ مِنْ زِیْنَتِهِنَّ ؕ وَتُوْبُوْٓا اِلَی اللّٰهِ جَمِیْعًا اَیُّهَ الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۳۱﴾

(اور (اے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم !) مؤمن عورتوں سے کہہ دیجئے کہ وہ اپنی نگاہیں نیچی رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں اور اپنی زینت و آرائش کو ظاہر نہ کریں سوائے اس کے جو خود بخود ظاہر ہو جائے اور چاہیے کہ وہ اپنی اوڑھنیاں اپنے گریبانوں پر ڈالے رہیں اور اپنی زیبائش و آرائش ظاہر نہ کیا کریں سوائے اپنے شوہروں کے یا اپنے باپ داداؤں کے یا اپنے شوہروں کے باپ داداؤں کے یا اپنے بیٹوں کے یا اپنے شوہروں کے بیٹوں کے یا اپنے بھائیوں کے یا اپنے بھتیجوں کے یا اپنے بھانجوں کے یا اپنی (ہم مذہب) عورتوں کے یا اپنے غلاموں یا لونڈیوں یا نوکروں چاکروں کے جو جنسی خواہش نہ رکھتے ہوں (جنسی خواہش نہ رکھنے والے غلاموں اور لونڈیوں سے مراد غالباً خواجہ سرا نوکر چاکر ہیں) یا اُن بچّوں کے جو ابھی عورتوں کی پوشیدہ باتوں سے واقف نہیں، اور وہ اپنے پاؤں (زمین پر) اس طرح نہ مارا کریں کہ جس سے ان کی وہ زیبائش و آرائش معلوم ہو جائے جسے وہ چھپائے ہوئے ہوں، اے اہل ایمان! تم سب مل کر اللہ کی بارگاہ میں توبہ کرو تاکہ تم فلاح پاؤ۔)

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تمام انسانوں کے لیے نورِ ہدایت ہیں پس آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جہاں عام خواتین و حضرات کو معاشرتی زندگی کے قوائد و ضوابط سکھائے وہاں اپنی ازواج سے بھی فرمادیا کہ تم عام خواتین کی طرح نہیں ہو بلکہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بیویاں ہونے کے ناطے تمھارا درجہ خاص ہے اس لیے عام عورتوں کے لب و لہجے اور طور طریقوں کو اپنانے سے گریز کرو اور حجاب اوڑھا کرو۔

چنانچہ ارشادِ پروردگارِ عالم ہوتا ہے:[1]

يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ اِنِ اتَّقَيْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِيْ فِيْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ وَّقُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ﴿۳۲﴾

(اے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بیویو! تم (عام) عورتوں کی طرح نہیں ہو اگر تم پرہیزگاری اختیار کرو، پس تم ایسے نرم لہجے میں بات نہ کرو کہ جس کے دل میں کوئی بیماری ہے وہ طمع کرنے لگے اور قاعدے کے مطابق (باوقار طریقے سے) بات کیا کرو۔)

اس آیتِ کریمہ سے ظاہر ہے کہ خواتین کا نرم یعنی شیریں لہجے میں بات کرنا بُرے لوگوں کے دلوں میں اُن کے لیے طمع و لالچ اور برائی کا رجحان پیدا کرتا ہے پس عورتوں کو اپنا لہجہ سپاٹ یا سخت رکھنے کی تاکید کی گئی ہے۔

اور پھر ارشادِ باری تعالیٰ ہُوا:[2]

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ وَبَنٰتِكَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِيْنَ يُدْنِيْنَ عَلَيْهِنَّ مِنْ جَلَابِيْبِهِنَّ ؕ ذٰلِكَ اَدْنٰٓى اَنْ يُّعْرَفْنَ فَلَا يُؤْذَيْنَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۵۹﴾

(اے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! اپنی بیویوں، بیٹیوں اور (عام) اہلِ ایمان کی عورتوں سے کہہ دیجیے کہ وہ (باہر نکلتے وقت) اپنے اُوپر چادر (بطور حجاب) لٹکا لیا کریں یہ طریقہ قریب تر ہے کہ وہ پہچان لی جائیں اور ستائی نہ جائیں اور اللہ بڑا بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔)

اَللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّاٰلِ مُحَمَّدٍ○

---

[1] سورۃ الاحزاب، آیت ۳۲

[2] سورۃ الاحزاب، آیت ۵۹

سنہ ۶ ہجری

سریۂ محمد بن مسلمہؓ یا سریۂ نجد

(۱۰ محرّم ۶ ہجری/ یکم جون ۶۲۷ء)

اس مہم میں نجد کے بنی حنفیہ کا سردار ثمامہ بن اُثال گرفتار کر کے مدینہ لایا گیا۔ جناب رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے تین دن بعد اُسے آزاد کر دیا۔ اُس عرصے میں وہ مسلمانوں کو باجماعت نماز پڑھتے دیکھتا اور اُن کے اور خاص طور پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے طرزِ عمل کا مطالعہ کرتا رہا اور اس قدر متاثر ہُوا کہ آزاد ہوتے ہی اسلام قبول کر لیا۔ ثمامہ نجد کا سردار تھا، اُس کا علاقہ غلّے کا بہت بڑا مرکز تھا جہاں سے مکّہ میں بھی اناج جاتا تھا، اُس نے اہلِ مکّہ کے مشرک ہونے کے سبب اُن کو غلّے کی ترسیل بند کر دی جس کی وجہ سے وہاں اناج کا قحط پڑ گیا۔ قریش نے مجبور ہو کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے شکایت کی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اُن کی درخواست کو قبول فرماتے ہوئے ثمامہ کو اناج کی ترسیل بحال کرنے کا حکم دیا چنانچہ اُن کو غلّے کی فراہمی دوبارہ شروع کر دی گئی۔[۱]

غزوۂ بنولحیان

(یکم ربیع الاوّل ۶ ہجری/ ۲۱ جولائی ۶۲۷ء)

یہ غزوہ ربیع الاوّل میں اور ابن اسحٰق کے مطابق جمادی الاوّل ۶ ہجری میں اور بروایتے ۵ ہجری میں ہُوا۔ مؤرّخین کے مطابق اس کا مقصد شہدائے رجیع کا انتقام لینا تھا چنانچہ نبی اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم دوسو (۲۰۰) مجاہدین کو لے کر بنی لحیان کی سرکوبی کے لیے تشریف لے گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پہلے اُس جگہ جہاں سریۂ رجیع کے مسلمانوں کو شہید و اسیر کیا گیا تھا پہنچے اور شہدا کے لیے دُعائے مغفرت فرمائی۔ اس دوران میں بنولحیان کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی آمد کی خبر ہوئی تو وہ فرار ہو کر پہاڑوں میں رُوپوش ہو گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم وہاں ایک دو روز قیام فرمانے کے بعد واپس تشریف لے آئے۔[۲]

---

[۱] ڈاکٹر نصیر احمد ناصر، کتاب: پیغمبر اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم، ص ۵۷۲ بحوالہ زاد المعاد، سیرۃ ابن ہشام، استیعاب

[۲] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۲۴۱

غزوۂ ذی قرد یا غزوۂ غابہ
(ربیع الاوّل ۶ ہجری)

مدینہ طیّبہ سے ایک منزل دُور شام کے راستے میں ایک چشمہ تھا جسے ذی قرد کہا جاتا تھا اور غابہ ایک جنگل کا نام تھا جہاں مسلمانوں کے اُونٹ چرا کرتے تھے۔ (آج کل اس علاقے کو الخلیل کہا جاتا ہے، یہ حرمِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے چھ کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔) یہ غزوہ ربیع الاوّل ۶ ہجری میں [1] یا ذی الحج ۶ ہجری یا محرم ۷ ہجری میں [2] غابہ کے جنگل سے شروع ہُوا اور ذی قرد کے چشمے تک جا پہنچا اسی وجہ سے یہ دونوں ناموں سے موسوم ہے۔

نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے اُونٹ بھی غابہ میں چرا کرتے تھے۔ عتبہ بن حصین فزاری [3] یا عبدالرحمٰن بن عُیینہ [4] اپنے گروہ کے ساتھ غابہ کی چراگاہ پر حملہ آور ہُوا، چرواہوں کو شہید کر دیا جن میں ایک حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کا بیٹا بھی تھا اور اُونٹوں کو ہنکا کر لے گیا۔ اتفاقاً حضرت سلمہؓ بن الاکوع حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے خدمتگار حضرت رباحؓ کے ساتھ اُدھر جا نکلے۔ اُنھوں نے رباحؓ کو اطلاع پہنچانے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت میں روانہ کر دیا اور خود لٹیروں کے تعاقب میں نکل گئے۔ حضرت سلمہؓ ماہر تیرانداز تھے اُنھوں نے خوب دلیری کے ساتھ لٹیروں کا پیچھا کیا اور اُن میں سے کئی اپنے تیروں کے ذریعے گرا لیے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو خبر ملی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پانچ سو اور بروایتے سات سو صحابہؓ کے ساتھ جن میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ اور حضرت مقداد رضی اللہ عنہ بھی تھے، اُن کی سرکوبی کو روانہ ہوئے اور بہت جلد سلمہؓ بن الاکوع سے جا ملے۔ سلمہؓ کہتے ہیں کہ عبدالرحمٰن مارا گیا اور ہم باقی کافروں کا تعاقب کرتے ہوئے اُس گھاٹی میں داخل ہو گئے جہاں پانی کا چشمہ ذی قرد تھا۔ اس غزوے میں مشرکین کے چند آدمی ہلاک ہوئے باقی

---

[1] سید محسن امین عاملی (متوفی ۱۹۵۳ء)، اعیان الشیعہ، ج ۲ ص ۲۴۵

[2] مولوی عبدالباری ایم اے، دعوت دہلی سیرۃ طیبہ نمبر ۱۶ ستمبر ۱۹۵۹ء

[3] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۲۴۳

[4] ڈاکٹر نصیر احمد ناصر، کتاب: پیغمبر اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم، ص ۵۷۳

بھاگ گئے اور کچھ نا قے اُن سے چھڑا لیے گئے۔ [1]

سریۂ غمر یا سریۂ عکاشہ بن محصن رضی اللہ عنہ

اس سریے میں حضرت عکاشہ بن محصن رضی اللہ عنہ کو ربیع الآخر ۶ ہجری (اگست/ستمبر ۶۲۷ء) میں غمر کی طرف روانہ کیا گیا اس وجہ سے اسے سریۂ غمر یا سریۂ عکاشہ کہا جاتا ہے۔ [2]

سریۂ ذی القصہ یا سریۂ بنو ثعلبہ

(ربیع الآخر ۶ ہجری/ اگست ستمبر ۶۲۷ء)

ذی القصہ میں بنی ثعلبہ اور بنی غوال نے شورش برپا کر رکھی تھی۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے حکم پر محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ دس مجاہدین کے ساتھ ربیع الآخر ۶ ہجری میں اُن کی سرکوبی کو روانہ ہوئے۔ اس مہم میں محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ شدید زخمی ہوئے جب کہ باقی تمام مجاہدین نے جامِ شہادت نوش کیا۔ [3] وہ رات کا وقت تھا اور تقریباً سو آدمی مقابلے پر نکل آئے تھے۔ دونوں طرف سے تیراندازی ہوئی آخر کار کفّار نے یکبارگی حملہ کیا جس میں تمام مسلمان شہید ہوگئے صرف حضرت محمد بن مسلمہ رضی اللہ عنہ بچے جو زخمی ہو کر گر پڑے تھے، اُنھیں ایک مسلمان اُٹھا کر مدینہ لایا تھا۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ کو چالیس مجاہدین کے ساتھ اُن کی سرکوبی کے لیے روانہ فرمایا۔ [4]

سریۂ جموم

(ربیع الآخر ۶ ہجری/ اگست ستمبر ۶۲۷ء)

مدینہ سے چار کوس کے فاصلے پر بطن نخلہ کے قریب جموم کی بستی میں قبیلہ بنو سلیم رہتا

---

[1] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۲۴۴

[2] ڈاکٹر نصیر احمد ناصر، کتاب: پیغمبر اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم، ص ۵۷۳

[3] ڈاکٹر نصیر احمد ناصر، کتاب: پیغمبر اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم، ص ۵۷۳

[4] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۲۴۱، ۲۴۲

تھا۔ اُن کی شورش کو فرو کرنے کے لیے ربیع الآخر ۶ ہجری (اگست/ستمبر ۶۲۷ء) میں حضرت زید بن حارثہؓ کو بھیجا گیا لیکن لڑائی کی نوبت نہ آئی۔ [1]

سریۂ وادی القریٰ

(رجب ۶ ہجری/نومبر دسمبر ۶۲۷ء)

اس جماعت میں بارہ مجاہدین تھے جن کے قائد حضرت زید بن حارثہؓ تھے۔ رجب ۶ ہجری (نومبر/دسمبر ۶۲۷ء) میں بنی فزارہ نے وادی القریٰ میں اُن پر حملہ کیا جس کے نتیجے میں نو مجاہد شہید اور ایک زخمی ہُوا۔ [2]

سریۂ علی مرتضیٰ علیہ السلام یا سریۂ فدک

(شعبان ۶ ہجری/جنوری ۶۲۸ء)

شعبان ۶ ہجری (جنوری ۶۲۸ء) میں بنی سعد بکر نے یہود کی مدد کے لیے فدک کے قریب ایک لشکر جمع کیا جس کی سرکوبی کے لیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے حضرت مولا علی علیہ السلام کی کمان میں دوسو مجاہدین کا ایک دستہ روانہ کیا۔ امیر المومنین علی علیہ السلام نے اس تیزی سے اُن کو جالیا کہ وہ اس غیر متوقع اور اچانک حملے سے حواس باختہ ہوکر بھاگ گئے۔ [3]

''مدارج النبوّت'' میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی کا بیان ہے کہ حضرت علی علیہ السلام نے فدک اور خیبر کے درمیان اُن پر اچانک حملہ کر دیا۔ بنوسعد نے شکست کھائی اور اُن کے پانچ سو اُونٹ اور ایک ہزار بکریاں مسلمانوں کے قبضہ میں آئیں۔ اس کے بعد علی المرتضیٰ علیہ السلام اپنے ساتھیوں کے ساتھ بغیر کوئی نقصان اُٹھائے مدینہ طیبہ واپس آ گئے۔ [4]

---

[1] ڈاکٹر نصیر احمد ناصر، کتاب: پیغمبر اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ص ۵۷۳

[2] ڈاکٹر نصیر احمد ناصر، کتاب: پیغمبر اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ص ۵۷۴

[3] ڈاکٹر نصیر احمد ناصر، کتاب: پیغمبر اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ص ۵۷۳

[4] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۲۴۸

حدیبیہ کا معرکہ

(یکم ذیقعد ۶ ہجری/ ۱۲ مارچ ۶۲۸ء)

مقامِ حدیبیہ

حدیبیہ ایک کنویں کا اور بقولے ایک درخت کا نام تھا اور وہ جگہ جہاں پر وہ کنواں یا درخت واقع تھا حدیبیہ کے نام سے موسوم ہوگئی۔ حدیبیہ مکّہ مکرمہ سے نو میل کے فاصلے پر ہے اور مقامِ حِل وحَرم ہے یعنی اس کا کچھ حصّہ حدودِ حرم میں ہے اور کچھ حدودِ حرم سے باہر۔ وہ خاص جگہ جہاں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قیام فرمایا تھا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانۂ مبارک میں تو متعین ومعلوم تھی لیکن بعد میں مبہم ومجہول ہوگئی اور لوگ اُس جگہ کو پانے اور اُس کی زیارت کرنے سے محروم ہوگئے۔[1]

حدیبیہ کے واقعے کو متعدد مؤرّخین نے ''معاہدۂ حدیبیہ'' کے عنوان سے لکھا ہے لیکن چند اہلِ نظر نے اسے بھی ایک معرکہ قرار دیا ہے۔ سطحی نظر سے دیکھا جائے تو یہ ایک معاہدہ ہی تھا لیکن تحریکِ اسلام کے تناظُر میں دیکھا جائے تو بدر واُحد کی طرح یہ بھی ایک معرکہ ہی تھا اگرچہ اس میں جنگ وجدال اور قتل وغارت گری کی نوبت نہیں آئی مگر صبر وثبات اور ایمان واستقامت کا ایک کڑا امتحان ضرور تھا جس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جاں نثاروں کو گذرنا پڑا۔

دورِ حاضر کے محققین ومبصرین جس طرح یہ کہتے ہیں کہ آنے والے وقتوں میں جنگیں میدانِ جنگ میں نہیں بلکہ میز پر (مذاکرات کی صورت میں) ہُوا کریں گی، اُسی طرح ہمارے نزدیک یہ بھی ایک ایسی جنگ تھی جو میدانِ جنگ میں شمشیر وسناں کے ذریعے نہیں بلکہ مذاکرات کی صورت میں قلم کے ذریعے ہوئی اور نبی معظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دُوراندیشی، حکمتِ عملی اور تدبر ودانش کی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی لازوال فتح وکامرانی پر منتج ہوئی۔

---

[1] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۲۵۴

اربابِ سِیر بیان کرتے ہیں کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک خواب دیکھا کہ خانہ کعبہ کی چابی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دستِ مبارک میں ہے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے صحابہؓ کے ساتھ مکّہ معظّمہ کی زیارت اور عمرہ کے لیے تشریف لے گئے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب یہ خواب صحابہ کرامؓ سے بیان فرمایا تو وہ بہت خوش ہوئے اور سمجھے کہ اس خواب کی تعبیر اسی سال ظہور پذیر ہوگی لیکن جب حالات نے ایک اور رُخ اختیار کرلیا تو بعض نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے سوال اُٹھادیا چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ میں نے یہ کب کہا تھا کہ یہ (عمرہ) اِسی سال ہوگا (یہ تو تمھاری اپنی تعبیر اور تمھارا اپنا خیال تھا)۔[۱]

بروایتے یکم ذیقعد ۶ ہجری بروز دوشنبہ (پیر)،[۲] رسولِ اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عمرے کا ارادہ کیا اور صحابہؓ سے فرمایا کہ تم بھی مستعد و تیار ہوجاؤ۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عبداللہ بن اُمّ مکتوم کو مدینہ منوّرہ کا انتظام وانصرام سونپا اور صحابہؓ کے ساتھ مدینہ سے باہر تشریف لائے۔ اکثر صحابہؓ نے تلوار کے سوا کوئی اور اسلحہ ساتھ نہیں لیا تھا کیونکہ تلوار کو عرب میں مسافر کا ہتھیار کہا جاتا تھا یعنی دورانِ سفر میں تلوار ساتھ رکھنا عربوں کے رواج میں شامل تھا اور وہ اسے کسی حالت میں بھی اپنے جسم سے الگ نہیں کرتے تھے۔[۳] کچھ صحابہ نے اپنے جسموں پر پورے ہتھیار سجا لیے تھے لیکن حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُسے جائز قرار نہ دیا۔[۴] آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے ساتھ قربانی کے اُونٹ بھی لیے جو تعداد میں ستر (۷۰) تھے۔ قریش کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی روانگی کی خبر ہوئی تو سب نے متفقہ فیصلہ کیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مکّہ میں داخل نہ ہونے دیا جائے چنانچہ اُنھوں نے قرب و جوار کے قبیلوں کو بھی ساتھ ملالیا اور جنگ کے لیے تیار ہوکر مکّہ سے باہر آگئے۔ قریش

---

[۱] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۲۵۶

[۲] حسین بن محمد دیار بکری (متوفی ۸۹۲ ہجری ۱۵۷۴ء)، تاریخ خمیس، ج ۲ ص ۶۶

[۳] خواجہ محمد لطیف، اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ، ج ۱ ص ۱۲۰

[۴] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۲۵۶

نے جدّہ کے راستے پر واقع موضع بلدہ میں پڑاؤ ڈالا اور ایک ہراول دستہ ترتیب دیا جس میں خالد بن ولید اور عکرمہ بن ابوجہل شامل تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو لشکرِ کفّار کی آمد کی خبر ہوئی تو فرمایا کہ خالد بن ولید قریش کے لشکر کا ہراول دستہ لیے مقامِ غمیم پر بیٹھا ہے اس لیے تم داہنے راستے سے نکل چلو۔ اربابِ سِیر کہتے ہیں کہ مسلمانوں نے جو راستہ اختیار کیا وہ نہایت دشوار گزار اور سخت ترین تھا۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے راستے کی صعوبتیں ملاحظہ فرمائیں تو صحابہؓ کی دلجوئی کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ جنّت کے دروازوں میں سے ایک دروازہ ہے۔ سفر کے اختتام پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے حدیبیہ کے میدان میں ایک کنویں پر نزول فرمایا۔ ہوسکتا ہے کہ اُسی کنویں کا نام حدیبیہ ہو جس کی نسبت سے وہ جگہ حدیبیہ کے نام سے مشہور ہوگئی۔ اُس میں پانی بہت کم تھا لوگوں نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے شکایت کی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ایک تیر کنویں میں چلایا، کنواں پانی سے بھر گیا اور لوگ خوب سیراب ہوئے۔ بروایتے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے وضو کرکے کُلّی کے پانی کو کنویں میں ڈال دیا، کنویں میں پانی بھر آیا اور لوگ اچھی طرح سیراب ہوئے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے وضو کرکے دستِ مبارک کو پانی کے پیالے میں ڈالا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی اُنگلیوں سے چشموں کی طرح پانی جاری ہوگیا جسے پندرہ سو آدمیوں نے پیا اور کہا کہ اگر ایک لاکھ بھی ہوتے تو وہ پانی ہم سب کے لیے کافی ہوتا۔ پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے دُعا فرمائی جس سے بارش ہوئی اور جل تھل ایک ہوگیا۔[1] ''مدارج النبوت'' میں ہے کہ اس منزل میں پانی کی کمی تھی اس لیے یہاں ایسے کئی معجزے ظہور میں آئے۔ میرا خیال میں ممکن ہے کہ یہ تینوں معجزے اس سفر میں الگ الگ موقعوں یا الگ الگ مقامات پر ظہور پذیر ہوئے ہوں یا پھر یہ بھی ہوسکتا ہے کہ حدیبیہ کے ایک ہی معجزے کو مختلف راویوں نے مختلف طریقوں سے بیان کیا ہو کیونکہ قرین قیاس یہی ہے کہ جب پڑاؤ ڈالا جا چکا تھا اور ایک کنویں سے

---

[1] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت ج ۲ ص ۲۵۶

اتنا پانی جاری ہوگیا تھا جس سے سب لوگ خوب اچھی طرح سیراب ہوئے تو پھر آس پاس کسی اور مقام پر پانی کی تلاش کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ (واللہ اعلم)

قریشِ مکّہ کو جب معلوم ہُوا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم حرمتِ کعبہ کا خیال کرتے ہوئے جنگ وجدال کا کوئی ارادہ نہیں رکھتے تو اپنی جہالت، حماقت اور بدفطرت کی بنا پر تمرد وسرکشی پر اُتر آئے اور ڈرانے دھمکانے کی کوشش کرنے لگے۔ سب سے پہلے اُنھوں نے بذیل بن ورقا خزاعی کو چند لوگوں کے ساتھ بھیجا۔ بدیل نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے کہا کہ قریش اور دیگر قبائلِ عرب متحد ہوکر حدیبیہ کے کنوؤں کے آس پاس جمع ہو چکے ہیں تاکہ آپ لوگوں کو خانہ کعبہ کی زیارت سے روک سکیں لہٰذا آپ (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) واپس چلے جائیں ورنہ وہ جنگ کریں گے۔ نبی اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ ہم جنگ وجدل کے لیے نہیں آئے ہمارا مقصد زیارتِ کعبہ اور عمرہ ادا کرنا ہے۔ قریش جنگ کرنا چاہتے ہیں لیکن یہ اُن کے حق میں بہتر نہیں، ہاں! اگر وہ چاہیں تو ہم ایک مدت معین کر لیتے ہیں جس میں ہمارے اور اُن کے درمیان جنگ نہیں ہوگی۔ جنگ کے واسطے وہ مجھے دیگر مشرکین کے لیے چھوڑ دیں، اگر میں مغلوب ہوگیا تو اُن کی دِلی مراد پوری ہوجائے گی اور اگر غالب آ گیا تو وہ بھی اُن کی طرح میری پیروی کرلیں یا صلح کی معینہ مدت تک جنگ وجدال سے دُور رہیں اور میری اس پیشکش کے باوجود بھی اگر وہ لڑائی پر مُصر ہیں تو پھر میں اُن سے جہاد کروں گا اور بے شک اللہ اپنے دِین کی نصرت فرمائے گا۔ بذیل نے واپس جا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی باتیں قریش کو بتائیں لیکن اُنھوں نے ایک نہ مانی۔ اُن میں سے ایک معزز شخص عروہ بن مسعود ثقفی نے قریش کی ہٹ دھرمی دیکھی تو کہا کہ اگر تم مجھ پر خیانت وعداوت کا گمان نہیں کرتے تو مجھے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کے پاس جا کر بات چیت کرنے اور اُن کا عندیہ معلوم کرنے کا موقع دو۔ پس عروہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے (وہ اُس وقت تک ایمان نہیں لائے تھے لیکن بعد میں مسلمان ہوگئے تھے)۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اُن سے بھی تقریباً وہی

کچھ کہا جو بذیل سے فرمایا تھا۔ عروہ بن مسعود نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے ہونے والی بات چیت قریش کو بتائی اور جنگ سے باز رہنے کا مشورہ دیا لیکن وہ اپنی ضد پر قائم رہے اور کہنے لگے کہ ہمیں ایسی نصیحتیں مت کرو، ہم محمد (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) اور اُن کے ساتھیوں کو مکّہ میں داخل ہونے دیں گے نہ کعبہ کی زیارت کرنے دیں گے۔ ہاں اگر وہ اس وقت واپس چلے جائیں تو اگلے سال ہم اُنھیں نہیں روکیں گے۔ عروہ کے بعد قبیلہ احابیش کا ایک آدمی حلیس بھی قریش سے اجازت لے کر رسولِ حلیم وکریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی بارگاہ میں پہنچا۔ وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی شخصیت سے بہت متاثر ہُوا اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی گفتگو سُن کر اور قربانی کے جانوروں کو دیکھ کر سمجھ گیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم جنگ وقتال کا ارادہ نہیں رکھتے بلکہ حقیقتاً زیارتِ کعبہ کی غرض سے آئے ہیں۔ اُس کی آنکھوں میں پانی بھر آیا اور وہ کہنے لگا، ''اُس قوم کو سزاوار نہیں کہ اِن کو خانہ کعبہ کی زیارت وطواف سے روکا جائے، ربِ کعبہ کی قسم! قریش ہلاک ہوجائیں گے۔'' وہ فوراً واپس لوٹ گیا اور قریش سے کہا کہ میں نے محمد (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) اور اُن کے ساتھیوں کو دیکھا ہے، وہ تو قربانی کے اُونٹ لے کر خانہ کعبہ کی زیارت کے لیے آئے ہیں اس لیے اُنھیں روکنا مناسب نہیں۔ احابیش قبیلے کے لوگ قربانی کے جانوروں کی بہت تعظیم کیا کرتے تھے۔ بروایتے، جب وہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے ملاقات کے لیے آیا تو اُن جانوروں کو دیکھ کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے ملے بغیر ہی واپس لوٹ گیا اور قریش سے کہا میں نے دیکھا ہے کہ وہ قربانی کے اُونٹ لے کر خانہ کعبہ کی زیارت کو آئے ہیں اس لیے اُنھیں مت روکو۔ قریش نے حلیس کے مشورے کو درخورِ اِعتنا نہ سمجھا اور انتہائی شقاوت سے کہنے لگے کہ اے حلیس! تُو دیہاتی آدمی ہے تُو ملکی وسیاسی اُمور نہیں جانتا۔ حلیس نے طیش میں آکر کہا قسم ہے اُس خدا کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے، اگر تم محمد (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کو کعبہ کے طواف سے روکو گے تو میں اور احابیش کے تمام لوگ تم سے الگ ہوجائیں گے۔ حلیس کی دھمکی کام کرگئی اور قریش جھاگ کی طرح بیٹھ گئے، عذرخواہی کرتے ہوئے کہنے لگے اے حلیس! ان باتوں کو جانے دو، ہم اپنی شرائط پر محمد (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کے ساتھ صلح کرلیں گے۔ مؤرّخین لکھتے ہیں کہ قریش نے جب

اپنوں میں سے کسی کی بات نہ مانی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے چاہا کہ اپنی طرف سے کسی کو مذاکرات کے لیے بھیجیں۔ پس آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بنی خزاعہ کے ایک شخص حراش بن اُمیہ کعبی کو بھیجا کہ وہ قریش کو باور کرائیں کہ ہم جنگ کے لیے نہیں بلکہ بیت اللہ کی زیارت کے لیے آئے ہیں۔ حراش اُن کے پاس پہنچے تو وہ اُنھیں قتل کرنے پر تُل گئے۔ حراش کے قبیلے کے لوگ جو مکّہ میں تھے اُنھیں بچانے دوڑے اور کسی نہ کسی طرح چھڑا کر واپس حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف روانہ کیا۔ [۱]

پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عمر بن خطابؓ سے فرمایا کہ تم مکّہ جا کر قریش کو سمجھاؤ کہ ہم جنگ کے لیے نہیں بلکہ عمرہ کرنے کے لیے آئے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے کہا کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جانتے ہیں کہ قریش میرے سخت دشمن ہیں اُنھوں نے مجھ پر قابو پالیا تو یقیناً مجھے زندہ نہ چھوڑیں گے اور وہاں بنی عدی میں سے ایسا کوئی نہیں جو میری حمایت وحفاظت کر سکے اس لیے اگر آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) حضرت عثمان بن عفانؓ کو بھیجیں تو مناسب ہوگا کیونکہ وہ قریش کے قریبی عزیز ہیں اور مکّہ میں اُن کے عزیز واقارب بھی بہت ہیں۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عثمان بن عفانؓ کو مکّہ کی طرف روانہ کیا تاکہ ابوسفیان اور قریش کے دیگر اربابِ اختیار کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مافی الضمیر سمجھائیں۔ [۲]

حضرت عثمانؓ دس مہاجرین کے ساتھ مکّہ روانہ ہوئے اور وہاں پہنچ کر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا پیغام پہنچایا مگر کفّار اپنی ضد پر اَڑے رہے کہ اس کا کوئی امکان نہیں کہ ہم محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو مکّہ آنے اور خانہ کعبہ کی زیارت کرنے دیں۔ ''مدارج النبوّت'' میں ہے کہ حضرت عثمانؓ نے واپسی کا ارادہ کیا تو قریش نے کہا کہ اگر تم چاہو تو طوافِ کعبہ کرلو۔ حضرت عثمانؓ نے کہا کہ میں اس

---

[۱] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت ج ۲ ص ۲۵۸ تا ۲۶۲

[۲] ابن الوردی (متوفی ۷۴۹ھ ۱۳۴۹ء)، تاریخ ابن الوردی، طبع مصر، ج ۱ ص ۱۲۵

شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت ج ۲ ص ۲۶۲

علامہ علی نقی نقوی، تاریخ اسلام، ص ۳۳۸

وقت تک طواف نہیں کروں گا جب تک رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نہ کریں۔ مشرکین نے اس بات پر برہم ہو کر حضرت عثمانؓ کو زبردستی مکّہ میں روک لیا اور قید کر لیا۔ اِدھر لشکرِ اسلام میں یہ خبر پھیل گئی کہ مکّہ والوں نے حضرت عثمانؓ کو اُن کے دس ساتھیوں سمیت شہید کر دیا ہے۔ [١]

بیعتِ رضوان

ہجرت کے بعد سے اب تک اگرچہ مسلمانوں کی قوت میں اضافہ ہو چکا تھا تاہم وہ اپنے آبائی وطن مکّہ جانے سے قاصر تھے۔ وطن کی کشش اور بیت اللہ کی زیارت کی تڑپ اُنھیں ہر لحظہ بیقرار اور پریشان رکھتی تھی۔ رویائے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سُن کر اُن کی بیقراری میں اضافہ ہو گیا تھا اور وہ چاہتے تھے کہ کسی طرح اُڑ کر مکّہ جا پہنچیں۔ آغازِ سفر سے لیکر قیامِ حدیبیہ تک گزرنے والے ہر لمحہ نے اُن کی بیقراری کو مہمیز کیا تھا اور شوقِ سفر کو بڑھا دیا تھا چنانچہ حدیبیہ پہنچ کر جب اُنھیں معلوم ہُوا کہ قریش کا لشکر سدِّ راہ ہو گیا ہے تو اُن کا جوش و خروش حد سے تجاوز کر گیا۔ پس اکثر مسلمان جنگ پر مُصر ہو گئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مطالبہ کرنے لگے کہ حملہ کر دیجیے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اُحد میں مسلمانوں کی بیوفائی کا ایک تلخ تجربہ ہو چکا تھا جس کی وجہ سے اب ضروری سمجھا گیا کہ ان لوگوں سے اس شرط پر بیعت کی تجدید کرائی جائے کہ میدانِ جنگ سے فرار نہیں ہوں گے۔ [٢] تاریخِ طبری میں سلمہ بن الاکوع سے مروی ہے کہ ہم حدیبیہ سے پلٹ رہے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے منادی نے ندا دی ''لوگو! بیعت کے لیے آؤ روح القدس آئے ہیں۔'' ندا کو سُن کر ہم تیزی سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف چلے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اُس وقت ایک خاردار درخت کے نیچے تشریف فرما تھے۔ ہم نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیعت کی۔'' [٣]

---

[١] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ١٦٤٢ء)، مدارج النبوت ج ٢ ص ٢٦٣۔ ابن لوردی (متوفی ١٣٤٩ء)، تاریخ ابن الوردی، طبع مصر، ج ١ ص ١٢٥۔ کے اے حمید، تاریخ مسلمانان عالم ج ١ ص ٨٠

[٢] علامہ علی نقی نقوی، تاریخ اسلام ص ٣٤٠

[٣] ابی جعفر محمد بن جریر طبری (متوفی ٣١٠ھ)، تاریخ طبری (اُردو)، ج ٢ ص ٢٥٣، ٢٥٤

اس بیعت کو بعض مؤرّخین نے لکھا ہے کہ یہ ''موت'' پر لی گئی۔ جیسا کہ کے اے حمید لکھتے ہیں، ''ایک درخت کے نیچے چودہ سو(۱۴۰۰) آدمیوں نے بیعت کی کہ اگر ضرورت پڑی تو اسلام پر جان دینے کے لیے تیار ہیں۔''[۱] ابن الوردی اور ابوالفدا بیان کرتے ہیں، ''کہا جاتا ہے کہ پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اُن سے موت پر بیعت لی جب کہ حضرت جابر بن عبداللہ انصاری رضی اللہ عنہ کہا کرتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ہم سے اس بات پر بیعت لی کہ ہم بھاگیں گے نہیں۔[۲] قدیم ترین مؤرّخ واقدی کے الفاظ ہیں، ''حضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اُن سے بیعت لی اِس پر کہ وہ فرار نہیں کریں گے اور کسی نے یوں کہا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اُن سے موت پر بیعت لی۔''[۳] عبدالحق محدث دہلوی لکھتے ہیں، ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ایک درخت سے پشتِ مبارک لگا کر صحابہ کرامؓ سے ثابت قدم رہنے پر بیعت لی کہ اگر جنگ ہوئی تو منہ نہ پھیریں گے۔''[۴] علامہ طبرسی فرماتے ہیں، ''اُن سب نے درخت کے نیچے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے بیعت کی اس بات پر کہ وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو چھوڑ کر فرار نہیں کریں گے۔''[۵] مندرجہ بالا مؤرّخین کے بیانات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے صحابہ کرامؓ سے اس پر بیعت لی کہ اگر جنگ ہوتی ہے تو وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ساتھ دیں گے، مرتے دم تک لڑیں گے اور میدانِ جنگ سے فرار نہیں ہوں گے۔ پس، اس بیعت کو ''بیعتِ رضوان'' کہا جاتا ہے۔

جب قریش نے اس بیعت کی خبر سنی تو اُن میں خوف و ہراس پھیل گیا کہ رسولِ خدا (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) جنگ کے لیے تیار ہو گئے ہیں۔ اس پر وہ پریشان ہوئے اور صلح پر آمادہ ہو گئے۔

---

[۱] علامہ علی نقی نقوی، تاریخ اسلام ص ۳۴۰ بحوالہ: کے اے حمید، مسلمانانِ عالم

[۲] ابن الوردی (متوفی ۷۴۹ھ)، تاریخ ابن الوردی، ج ۱ ص ۱۲۵

ابوالفدا (متوفی ۱۳۳۱ء)، تاریخ ابوالفدا

[۳] ابوعبداللہ محمد بن عمر واقدی (متوفی ۸۲۲ء)، کتاب المغازی ج ۲ ص ۶۰۳

[۴] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت ج ۲ ص ۲۶۳

[۵] علامہ طبرسی (متوفی ۱۱۵۳ء)، اعلام الوریٰ

اُنھوں نے اپنے خطیب سہیل بن عمرو کو صلح کی شرائط طے کرنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت میں روانہ کیا۔[1] قریش کے نمائندے سہیل بن عمرو نے قریش کے جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے کہا، ''آپ (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کا یوں آزادانہ مکّہ میں داخل ہونا ہم برداشت نہیں کرسکتے، اس طرح ہماری توہین ہوتی ہے کیونکہ لوگ یہی سمجھیں گے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) اپنی طاقت کے بل بوتے پر آئے ہیں۔ لہٰذا اس مرتبہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) بغیر زیارت کے لوٹ جائیں اور آئندہ سال عمرے کے لیے آئیں اور جب آئیں تو اپنی تلواریں نیام میں رکھیں۔ ہم تین دن کے لیے مکّہ خالی کردیں گے تاکہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) اپنی عبادات جس طرح چاہیں انجام دیں۔'' اس سے اُن کا مقصد یہ تھا کہ اطرافِ عرب میں یہی مشہور ہو کہ مسلمان اپنی طاقت کے بل بوتے پر نہیں آئے بلکہ قریشِ مکّہ نے خود اُن کو اجازت دی ہے۔ سہیل نے مزید کہا، ''دس سال تک ہمارے اور آپ (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کے درمیان صُلح رہے گی، جنگ وجدال نہیں ہوگا، دونوں اطراف کے شہری امن وسلامتی سے رہیں گے اور ایک دوسرے کے مقابل آئیں گے نہ ایک دوسرے کو نقصان پہنچائیں گے اور اگر ہمارا کوئی شخص آپ (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کی طرف جائے گا تو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) اُسے واپس کرنے کے پابند ہوں گے لیکن آپ (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کا جو آدمی ہماری طرف آئے گا ہم اُسے واپس نہیں کریں گے۔'' (ابوداؤد، مستدرک اور المواہبُ اللدنیہ میں صُلح کی مدت چار سال منقول ہے لیکن معروف مدت دس سال ہی ہے۔) اس گفتگو کے دوران میں سہیل کے بیٹے ابوجندل کلمہ شہادت پڑھتے ہوئے مسلمانوں کے درمیان پہنچ گئے۔ ابوجندل پہلے ہی مسلمان ہو چکے تھے اور اس ''جرم'' کی پاداش میں اپنے باپ سہیل بن عمرو کی قید میں تھے جو اب کسی طرح بھاگ کر بارگاہِ رسالت میں پہنچ گئے تھے۔ سہیل کہنے لگا میرے بیٹے کو میرے سپرد کردیں

---

[1] ابن الوردی (متوفی ۷۴۹ھ ۱۳۴۹ء)، تاریخ ابن الوردی، ج ۱ ص ۱۲۵
ابوالفدا (متوفی ۱۳۳۱ء)، تاریخ ابوالفدا، ج ۱ ص ۱۴۶
شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۲۶۳

کیونکہ یہ بات معاہدے میں طے پا چکی ہے کہ ہمارا کوئی شخص آپ کے پاس آئے گا تو آپ اُسے واپس کر دیں گے۔ بقولے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ یہ شخص معاہدہ تحریر ہونے سے پہلے آیا ہے اور یہ شرط تو معاہدہ تحریر ہونے کے بعد آنے والوں پر لاگو ہوگی۔ (واضح ہو کہ معاہدہ ابھی ہُوا نہیں تھا بلکہ فریقین کے مابین بات چیت چل رہی تھی) سہیل ہٹ دھرمی پر اُتر آیا اور کہنے لگا کہ اگر ایسا ہے تو پھر ہمارے اور آپ (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کے درمیان مُصالحت نہیں ہو سکتی۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ اس کو میری خاطر مستثنیٰ کر دو اور نرمی اور آسانی پیدا کرو، مگر وہ نہ مانا۔ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے بار بار کہنے کے باوجود بھی وہ آمادہ نہ ہُوا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ابوجندل کو اُس کے سپرد کر دیا اور فرمایا کہ اسے ایذا نہ دینا۔ ابوجندل نے کہا مسلمانو! مجھے مشرکوں کے سپرد نہ کرو، میں ایمان لا کر تمھاری پناہ میں آیا ہوں، تمھیں معلوم نہیں ان کافروں نے مجھ پر کیسے کیسے ظلم وستم کیے ہیں۔'' رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ابوجندل سے فرمایا ''اے ابوجندل! صبر کرو، دل کو مطمئن وشاد رکھو اور اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم پر بھروسہ کرو۔ وہ تمھارے لیے کشادگی اور آزادی پیدا فرمائے گا، بے شک صبر کشادگی کی کنجی ہے۔''

قریش کی شرائط بظاہر مسلمانوں کے مفاد اور وقار کے منافی تھیں لیکن حقیقت میں وہ ایسی نہ تھیں بلکہ اُن میں کافروں کی شکست اور مسلمانوں کی نصرت کے عوامل پنہاں تھے جنھیں صرف رسولِ حکیم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی دُور رَس نگاہیں ہی دیکھ رہی تھیں۔ جب کہ کچھ مسلمان ایسے بھی تھے جو صرف الفاظ پر غور کر رہے تھے، اُن کی سطحی نظریں رسولِ گرامی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی حکمت و دُور اندیشی کو نہ بھانپ سکیں اور وہ اس معاہدے پر اعتراض کرنے لگے حتیٰ کہ رسولِ معظم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ساتھ اُن کا رویّہ گستاخانہ ہوگیا اور وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی رسالت پر سوال اُٹھانے لگے۔[۱]

---

[۱] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۲۶۶، ۲۶۷

صحیح بخاری، ج ۲ کتاب الجہاد۔ حسین بن محمد دیار بکری (متوفی ۸۹۲ ہجری ۱۵۷۴ء) تاریخ خمیس، ج ۲ ص ۳۲

تمام شرائط جب زبانی طور پر طے پا چکیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے معاہدے کو ضبطِ تحریر میں لانے کے لیے امیر المومنین حضرت علی المرتضیٰ علیہ السلام کو مقرر کیا۔ [1] آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، یا علی! لکھو:

''بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ'' سہیل کہنے لگا کہ ''الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ'' کیا ہے؟ یہ ہم نہیں جانتے اس لیے لکھیں، ''بِسۡمِكَ اللّٰهُمَّ'' جیسا کہ عام طور پر لکھا جاتا ہے۔ مسلمانوں نے اس پر احتجاج کیا لیکن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تحمل اور بُردباری کا مظاہرہ کرتے ہوئے حضرت علی علیہ السلام سے فرمایا کہ اے علی! ''بِسۡمِكَ اللّٰهُمَّ'' لکھو۔ حضرت علی علیہ السلام نے ایسا ہی لکھا پھر نبی اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، لکھو، ''هٰذَا مَاقَاضٰى بِهٖ مُحَمَّدٌ رَّسُوۡلُ اللّٰهِ'' (اللہ کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو فیصلہ کیا ہے وہ یہ ہے)۔ علی علیہ السلام نے لکھ دیا۔ سہیل پھر بھڑک اُٹھا اور کہا، ''ہم آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو رسول اللہ نہیں مانتے، اگر مانتے ہوتے تو پھر آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو خدا کے گھر کی زیارت سے روکتے ہی کیوں؟ اس لیے ''مُحَمَّدٌ رَّسُوۡلُ اللّٰهِ'' کی بجائے ''مُحَمَّدِ بۡنِ عَبۡدُ اللّٰهِ'' لکھیے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نہایت صبر اور سکون سے فرمایا، '' میں اللہ کا رسول بھی ہوں اور محمد ابن عبداللہ بھی۔ پھر علی علیہ السلام سے فرمایا، ''اے علی! اس تحریر میں سے ''مُحَمَّدٌ رَّسُوۡلُ اللّٰهِ'' کاٹ دو اور ''مُحَمَّدِ بۡنِ عَبۡدُ اللّٰهِ'' لکھو۔ حضرت علی المرتضیٰ نے عرض کیا، ''یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! میں ایسا ہرگز نہیں کر سکتا کہ وصفِ رسالت کو محو کر دوں (یعنی رسول اللہ کے الفاظ مٹادوں)۔'' روایت ہے کہ علی علیہ السلام نے قلم کو رکھ دیا اور ہاتھ تلوار پر لے گئے۔ [2]

نبی معظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے مردِ مجاہد کے جلال، جاں نثار بھائی کے جذبات اور ''بابِ علم'' کی دُور اندیشی اور حکمت و دانائی سے بخوبی واقف تھے اس لیے اُن کے ہاتھ سے تحریر لے کر

---

[1] کے اے حمید، تاریخ مسلمانانِ عالم، ج ۱ ص ۸۱۔ محمد حمید اللہ، الوثائق السیاسیۃ، طبع مصر۔
رسولِ اکرم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی سیاسی زندگی، ص ۱۲۶۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۲۶۵

[2] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۲۶۶

''رسول اللہ'' کے الفاظ کو خود محو کیا اور اُن کی جگہ ''ابنِ عبداللہ'' لکھ دیا۔

محققین کہتے ہیں کہ اس میں علی علیہ السلام کی حکمت یہ تھی کہ علی علیہ السلام ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی نبوّت کی پہلی گواہی دینے والے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے وزیر اور جانشین تھے۔ اُنھوں نے اپنے ہاتھ سے ''رسول اللہ'' کے الفاظ اس لیے نہیں مٹائے کہ منافقین کو یہ کہنے کا موقع نہ مل جائے کہ جب علی نے ہی ''رسول اللہ'' لکھ کر مٹا دیا تو پھر رسالت پر ہمارے شک کرنے پر اعتراض کیسا؟ ''مدارج النبوّت'' میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی لکھتے ہیں،'' حضرت علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہٗ کا لفظِ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) محو کرنے سے انکار از بابِ ترکِ امتثال (حکم عدولی کیوجہ سے) نہیں تھا جو مستلزم ترکِ ادب ہے (جو ترک ادب کی وجہ سے قابلِ سزا ہے) بلکہ عین امتثال و ادب (فرمانبرداری اور تعظیم) ہے جو انتہائی عشق و محبت پر دلالت کرتا ہے۔[۱]

مذکور ہے کہ اُس موقع پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام سے فرمایا،'' اے علی (علیہ السلام)! تمھیں بھی ایسا ہی معاملہ آگے درپیش ہوگا۔ بیان کرتے ہیں کہ جب قضیہ صفین میں صلح قرار پائی تو صلح نامہ لکھا گیا کہ یہ کتابت امیر المومنین علی علیہ السلام کی مصالحت معاویہ بن ابوسفیان کے ساتھ ہے۔ معاویہ بن ابوسفیان نے کہا لفظ ''امیر المومنین'' کاٹ دو اور لکھو علی بن ابی طالب۔ اگر میں ان کو امیر المومنین مانتا تو ان کے ساتھ جنگ نہ کرتا اور ان کی پیروی واطاعت کرتا۔ اس پر علی المرتضیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے سچ فرمایا تھا۔[۲]

صلح نامہ کی کتابت کے دوران میں قریش کا نمائندہ سہیل بن عمرو بار بار جھگڑا کرتا اور تحریر میں رکاوٹ ڈالتا لیکن رسول حلیم و کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہر بار درگزر فرماتے اور صبر و تحمل کے ساتھ اُس کی بات کو تسلیم کرتے ہوئے صلح کی کاروائی کو آگے بڑھاتے۔ بالآخر صلح نامہ مکمل ہوگیا۔ اس صلح نامے کو معاہدۂ حدیبیہ یا صلح نامۂ حدیبیہ کے ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔

---

[۱] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۲۶۶

[۲] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۲۶۶

صلح نامہ حدیبیہ کے نِکات [1]

۱۔ اے اللہ تیرے نام سے۔

۲۔ یہ وہ معاہدہ ہے جو محمد بن عبد اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور سہیل بن عمرو کے درمیان طے پایا۔

۳۔ دونوں کے درمیان اس بات پر صلح ہوئی ہے کہ دس سال تک جنگ بندی رہے گی اور اس عرصہ میں دونوں اطراف کے لوگ ایک دوسرے کے مقابل نہیں آئیں گے اور امن سے رہیں گے۔

۴۔ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا جو ساتھی حج یا عمرہ یا تجارت کی غرض سے مکّہ آئے گا اُسے جان و مال کی امان دی جائے گی اور قریش کا جو شخص تجارت کے لیے مصر یا شام (بروایتے عراق یا شام) جاتے ہوئے مدینہ سے گزرے گا تو اُسے مسلمانوں کی طرف سے جان و مال کی امان حاصل ہوگی۔

۵۔ قریش کا جو شخص اپنے ولی کی اجازت کے بغیر محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاس آئے گا تو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اُسے واپس قریش کے حوالے کر دیں گے اور اگر محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا کوئی ساتھی قریش کے پاس جائے گا تو وہ اُسے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو واپس نہیں کریں گے۔

۶۔ فریقین کے سینے بند رہیں گے (یعنی دِلوں میں کوئی غداری یا نفاق داخل نہیں ہوگا)، نہ تو خفیہ طور پر کسی دوسرے کو مدد دی جائے گی اور نہ ہی علانیہ خلافِ عہد دغا بازی کی جائے گی۔

۷۔ جو محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے معاہدے اور ذمہ داری میں داخل ہونا چاہتا ہے وہ بھی ایسا کر سکے گا اور اسی طرح جو قریش کے معاہدے اور ذمہ داری میں داخل ہونا چاہتا ہے وہ بھی ایسا کر سکے گا۔

۸۔ مسلمان اس سال یہاں سے واپس چلے جائیں گے اور مکّہ میں نہیں آئیں گے البتہ اگلے سال قریش مکّہ سے باہر چلے جائیں گے اور مسلمان وہاں تین راتیں ٹھہر سکیں گے۔ مسلمانوں کے پاس صرف ''سوار کا ہتھیار'' یعنی تلوار ہوگی جو میان میں ہوگی اور اس کے سوا کوئی اور ہتھیار نہ ہوگا۔

۹۔ قربانی کے جانور وہیں رہیں گے جہاں وہ پائے گئے ہیں (یعنی حدیبیہ میں)، اُنھیں وہیں ذبح کر دیا جائے گا اور مکّہ میں نہیں لایا جائے گا اور صراحت کی جاتی ہے کہ دونوں فریقین کے حقوق اور واجبات برابر ہوں گے۔

---

[1] ڈاکٹر نصیر احمد ناصر، کتاب: پیغمبر اعظم و آخر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، ص ۵۸۰

معاہدے کی تکمیل کے بعد بھی کئی مسلمانوں کی برہمی نکتہ عروج پر تھی حتیٰ کہ جب رسولِ گرامی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اُٹھو قربانیاں کرو اور سر کے بال منڈوا کر واپس چلو تو مسلمانوں کی اکثریت خاموش رہی اور حکم کی تعمیل کے لیے نہ اُٹھی اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُن سے بے اعتنائی اختیار فرما کے خود جا کر قربانی کی اور بال منڈوائے تو کچھ لوگوں نے بال منڈوائے اور اکثر نے بد دلی سے تھوڑے تھوڑے ترشوائے اور اُن کے رنج والم کا یہ عالم تھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ اُن میں سے ایک دوسرے کو قتل کر رہا ہے۔[1] حدیبیہ میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قیام کا دورانیہ بیس روز تھا۔ قربانی کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم واپس مدینہ تشریف لے گئے۔[2]

معاہدہ حدیبیہ پر تبصرہ

معاہدہ حدیبیہ کے نکات اُن لوگوں کو دعوتِ فکر دیتے ہیں جن کا کہنا ہے کہ اسلام تلوار کے زور پر پھیلا۔ اس معاہدے کی تمام شرائط ایسی ہیں جو تلوار کے بل بوتے پر حکومت کرنے والوں کے لیے کسی بھی صورت میں قابلِ قبول نہیں ہو سکتیں مگر رسولِ حلیم و کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُن کو قبول فرما کر تمام عالم پر ثابت کر دیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم امن کے سفیر اور عالمین کے لیے رحمت ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مقصدِ حیات زمانے کو نورِ ایمان سے منور فرمانا ہے نہ کہ لوگوں کا خون بہا کر کسی ریاست کی بنیادوں کو مستحکم کرنا۔ اس معاہدے کی کتابت کے دوران میں قریش کے نمائندے سہیل بن عمرو کا سخت رویّہ، بات بات پر جھگڑا کھڑا کر دینا اور اپنی مرضی کے مطابق معاہدے میں الفاظ کو تبدیل کروانا اس کا غماز ہے کہ وہ یہ بات اچھی طرح جانتا تھا کہ صلح پسند نبی اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جنگ نہیں کرنا چاہتے اور امن کو لڑائی پر ترجیح دیتے ہیں اور پھر ہُوا بھی یہی، رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے باوجود کئی مسلمانوں کی سخت مخالفت اور ناراضی کے وہ شرائط بھی قبول فرما لیں جو

---

[1] علامہ علی نقی نقوی، تاریخ اسلام ص ۵۹۔۳ بحوالہ تاریخ طبری، ج ۲ طبع جدید مصر ۱۳۶۱ھ ص ۶۳۷

[2] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۲۷۱

بادی النظر میں باعثِ ہزیمت سمجھی جارہی تھیں لیکن درحقیقت فروغِ امن کا ذریعہ تھیں۔ آنے والے وقت نے یہ ثابت بھی کردیا کہ بعض مسلمان صلح کی جن شرائط کو اپنی شکست اورتوہین کا باعث سمجھتے ہوئے سخت نالاں اورافسردہ و مضمحل تھے، وہی اسلام کی ترقی اورفروغ کا زینہ بنیں، عرب کی فضائیں مسلمانوں کے لیے خوشگوار اور پُرسکون ہوئیں اورنورحق کی شعائیں چہارسُو پھیلنے لگیں۔ جومسلمان مشرکین کے پاس جاتے اوراُنھیں معاہدے کی شرط کے مطابق واپس نہ آنے دیا جاتا وہ وہاں اپنی زبان اوراخلاق واطوار سے نشرواشاعتِ اسلام کا وسیلہ بنتے اورقریش کے جولوگ مسلمانوں میں آکر واپس جاتے وہ مسلمانوں کے حُسنِ سلوک اوراوصاف وکردار کو بیان کرکے تبلیغ کا ذریعہ بنتے۔ [1] بروایتے اُس ایک سال کی مدت میں مسلمانوں کی تعداد میں جو اضافہ ہُوا وہ اس سے پہلے کی پوری مدت میں بھی نہیں ہُوا تھا۔ حضرت امام جعفرصادق علیہ السلام کا فرمان ہے، ’’معاہدے کی مدت ابھی ختم نہیں ہوئی تھی مگر یوں لگتا تھا کہ اسلام تمام اہلِ مکّہ پر چھاجائے گا۔‘‘[2] یہی وہ زمانہ تھا جب قریش کے مشہورومعروف سردار خالد بن ولید اورعمروبن عاص بھی دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے۔[3]

حضرت اُمّ حبیبہؓ سے نکاح

(ذی الحجہ ۶ ہجری/ اپریل مئی ۶۲۸ء)

حضرت اُمّ حبیبہ کے بیوہ ہوجانے کے بعد نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بروایتے ذی الحجہ ۶ ہجری/ اپریل مئی ۶۲۸ء میں اُن سے نکاح فرما کر اپنے سایۂ رحمت میں لیا۔ (اس کی تفصیل کتاب ہذا کے حصّہ اوّل میں دی جاچکی ہے۔ باب ازواجِ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، ص ۱۵۵)

---

[1] خواجہ محمد لطیف، اسلام اورمسلمانوں کی تاریخ، ج ا ص ۱۲۹

[2] علامہ علی نقی نقوی، تاریخ اسلام، ص ۳۶۰

[3] کے اے حمید، تاریخ مسلمانان عالم، ج ا

سنہ ۷ ہجری

مکتوباتِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

(یکم محرم ۷ ہجری/ ۶۲۸ء)

نبی آخروا عظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی ایک قوم یا ملک کے نبی نہیں تھے بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تمام بنی نوع انسان کے لیے پیغمبر بنا کر مبعوث کیا گیا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ظہور چونکہ عرب کی سرزمین پر ہُوا اس لیے کارِ رسالت کا آغاز بھی یہیں سے فرمایا۔ عرب میں مشرکین اور یہود و نصاریٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نہ صرف سخت مخالفت کی اور طرح طرح کی اذیتیں دیں بلکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو راہِ حق سے ہٹانے کے لیے قاتلانہ حملے بھی کیے اور کئی جنگیں بھی لڑیں لیکن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پائے استقلال میں لغزش نہ آئی۔ یہ اللہ کی نصرت تھی اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جُہدِ مسلسل کا اعجاز کہ عرب کی اُن شوریدہ سر قوتوں کو بالآخر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے سرنگوں ہونا پڑا۔ اس کی پہلی بڑی مثال میثاقِ مدینہ اور دوسری معاہدۂ حدیبیہ ہے۔ میثاقِ مدینہ کے تحت یہودیوں نے ایک طرح سے اسلام کو بطور ایک ملت و مذہب تسلیم کرتے ہوئے ہتھیار ڈال دیے تھے تو معاہدۂ حدیبیہ میں سب سے بڑے دشمن قریش نے بھی دس سال کے لیے جنگ نہ کرنے اور مسلمانوں کی مکّہ میں آمدورفت پر آمادہ ہو کر گھٹنے ٹیک دیے تھے اور صرف اتنا ہی نہیں بلکہ اُن کے کئی لوگ جن میں سرکردہ افراد اور قبیلے کے سردار بھی شامل تھے دائرۂ اسلام میں داخل ہونے لگے۔ پس، جب شمعِ رسالت کی ضوفشانیاں ظلمتِ عرب کا جگر چاک کرنے لگیں تو رسولِ گرامی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عرب کی سرحدوں سے باہر کی دُنیا کو بھی نورِ اسلام کی تابانیوں سے منوّر کرنے کا ارادہ فرمایا۔

اُس زمانے میں دُنیا میں شاہی نظام رائج تھا اور اقوامِ عالم اُن ہی مذاہب کی پیروی کرتی تھیں جن کو اُن کے فرمانروا اختیار کرتے تھے چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دُنیا کے مختلف کونوں میں اپنے نامہ بر بھیج کر سربراہانِ مملکت کو دعوتِ اسلام دی۔ بروایتے یکم محرّم ۷

ہجری (۱۱ مئی ۶۲۸ ء) کا وہ عہد آفرین دن تھا جب پیغمبرِ اسلام صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم نے صحابہ کرامؓ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا، ''اے لوگو! اللہ تعالیٰ نے مجھے تمام جہانوں کے لیے رحمت اور پیغمبر بنا کر بھیجا ہے۔ دیکھو! عیسیٰ عَلَیْہِ السَّلَام کے حواریوں کی طرح اختلاف نہ کرنا۔ اُٹھو اور میری طرف سے پیغامِ حق (تمام دُنیا کو) پہنچاؤ۔'' پھر آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم نے ایک ہی دن میں چھ مختلف سربراہانِ مملکت کے نام خطوط ارسال کیے جن میں اُنھیں اسلام قبول کرنے کی دعوت دی گئی تھی۔

بعض محققین کے مطابق آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم نے یہ خطوط ۶ ہجری کے آخر میں ماہِ ذوالحجہ میں صلح حدیبیہ کے بعد روانہ کیے اور کچھ کے نزدیک ۷ ہجری میں روانہ کیے گئے۔ ممکن ہے کہ آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم نے سلاطین کے نام یہ خطوط بھیجنے کا ارادہ تو ۶ ہجری کے آخر میں کیا ہو اور اس پر عمل ۷ ہجری میں فرمایا ہو یا یہ سلسلہ چھٹے سال سے شروع ہو کر ساتویں سال تک جاری رہا ہو۔[۱] بہر حال اکثریت کا اتفاق اسی پر ہے کہ یہ خطوط حدیبیہ کے بعد اور فتح مکّہ سے پہلے روانہ کیے گئے۔ خطوط لے کر جانے والے سُفرا اور مکتوب الیہ شاہان کے نام مندرجہ ذیل ہیں:[۲]

۱۔ سفیر حضرت دحیۃ بن خلیفۃ الکلبی، مکتوب الیہ ہرقل، قیصر روم۔

۲۔ سفیر حضرت عبداللہ بن حذافہ سہمی، مکتوب الیہ خسرو پرویز، شاہ ایران/شاہ فارس کسریٰ پرویز۔

۳۔ سفیر حضرت عمرو بن اُمیّہ الضمری، مکتوب الیہ نجاشی، بادشاہ حبشہ۔

۴۔ سفیر حضرت حاطب بن ابی بلتعہ، مکتوب الیہ عزیزِ مصر۔

۵۔ سفیر حضرت سلیط بن عمرو عامری، مکتوب الیہ حاکم یمامہ، ہوذہ۔

۶۔ سفیر حضرت شجاع بن وہب الاسدی، مکتوب الیہ حارث بن شمر غسانی، رئیس حدودِ شام۔

بقولے آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم کو معلوم ہُوا کہ کئی ممالک کے حکمران صرف اُن خطوط و دستاویزات کو قابلِ وثوق و اعتماد سمجھتے ہیں جن پر مُہر ثبت ہو چنانچہ آپ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم نے چاندی کی ایک مُہر بنوائی جس پر

---

[۱] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۲۷۲۔ علامہ علی نقی نقوی، تاریخ اسلام، ص ۳۹۹
خواجہ محمد لطیف، اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ، حصہ اوّل باب ۱۱۔ ڈاکٹر نصیر احمد ناصر، کتاب: پیغمبر اعظم و آخر (صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم)، ص ۵۹۱

[۲] ڈاکٹر نصیر احمد ناصر، کتاب: پیغمبر اعظم و آخر (صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَآلِہٖ وَسَلَّم)، ص ۵۹۱

"محمد رسول اللہ" اس صورت میں کندہ تھا کہ پڑھنے میں "اللہ رسول محمد" تھا یعنی سب سے اُوپر لفظ اللہ، درمیان میں لفظ رسول اور پھر لفظ محمد تھا۔ پس تمام حکمرانوں کو ارسال کیے گئے خطوط پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ مُہر ثبت فرمائی۔ [1]

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے خطوط میں حکمرانوں کو دینِ اسلام قبول کرنے کی دعوت دی اور فرمایا کہ اپنی رعایا کو بھی دینِ حق کی طرف راغب کرو ورنہ اُن کی گمراہی کی ذمہ داری تم پر بھی عائد ہوگی۔ مکتوباتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں جن لوگوں کو مخاطب کیا گیا وہ مختلف مذاہب سے تعلق رکھنے والے تھے مثلاً مشرکین، زرتشتی (مجوسی)، عیسائی اور یہودی وغیرہ۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہر ایک کے عقیدے کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اُس کو خط لکھا مثلاً ہرقل اور مقوقس کے نام جو خطوط لکھے اُن میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے نام کے ساتھ خصوصیت کے ساتھ عبد اللہ (خدا کا بندہ) لکھا، جس سے مخاطب کے عقیدے کی نہایت لطیف پیرائے میں تردید کردی کہ انبیا و مرسلین خدا کی اولاد نہیں، بلکہ خدا کے بندے ہوتے ہیں۔ خسرو پرویز فارس کے نام جو نامۂ مبارک ارسال فرمایا اُس میں عقیدۂ توحید کو خاص طور پر اُجاگر کیا، کیونکہ فارس میں دو خداؤں کا نظریہ موجود تھا، پھر اسلام کے عالمگیر ہونے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تمام اقوامِ عالم کی جانب مبعوث ہونے کا واضح بیان فرمایا۔ یہود کے نام خط میں تورات کے حوالے سے اپنی نبوّت کا اِثبات کیا۔ عیسائی قیصرِ روم نے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دعوتی خط کے بعد احوال کا جائزہ لے کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوّت و رسالت کا اقرار تو کیا، مگر اسلام قبول نہ کیا۔ اسی طرح نصرانی عزیزِ مصر مقوقس نے بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوّت و رسالت کا اعتراف کیا مگر دائرۂ اسلام میں داخل نہ ہُوا۔ شاہِ حبشہ نجاشی عیسائی تھا، وہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت پر حلقہ بگوشِ اسلام ہوگیا۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک خط اہلِ سندھ کی جانب بھی ارسال فرمایا تھا جو نتیجہ خیز ثابت ہُوا اور سندھ کے کچھ خوش قسمت لوگ مسلمان ہو کر دربارِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں حاضر ہوئے۔

---

[1] شیخ عبد الحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۲۷۳

سرورِ عالم ﷺ کے خطوط میں طوالت، تکلف، تصنع اور بیان کی شوخی کی بجائے لطافت، سادگی، حقیقت پسندی اور ایجاز واختصار کا پہلو نمایاں ہے۔ ان میں پیغمبرانہ امانت وصداقت، عزم ویقین اور رسولِ گرامی ﷺ کی زبانِ حق کی خاص فصاحت وبلاغت نظر آتی ہے۔ ان خطوط میں تزکیۂ باطن اور اصلاحِ نفس کے لیے راہنمائی بھی ہے اور تبلیغی جذبے کی آبیاری کا سامان بھی، اُصولِ دین کی تبلیغ بھی ہے اور اسلام کے احکام ومصالح اور تشریعی بیان بھی۔ آپ ﷺ نے شاہانِ عالم کے نام جو خطوط ارسال فرمائے وہ اس امر کی واضح دلیل ہیں کہ آپ ﷺ کی نبوّت ورسالت فقط جزیرۂ عرب کے ساتھ مخصوص نہیں تھی بلکہ آپ ﷺ کی رسالت عرب وعجم، یہود ونصاریٰ، مشرکین اور مجوس حتیٰ کہ تمام عالمین کے لیے ہے۔

آپ ﷺ نے اپنی زندگی میں بڑے بڑے بادشاہوں، قبائلِ عرب کے سرداروں اور گورنروں کے نام جو خطوط لکھے وہ کتبِ حدیث میں محفوظ ہیں۔ بقولے ان کی تعداد تین سو کے قریب ہے جن میں سے ۱۳۹ خطوط ایسے ہیں جن کا اصل متن محفوظ ہے اور ۸۶ وہ ہیں جن کا صرف مفہوم کتب میں بیان کیا گیا ہے۔ ذیل میں ہم آپ ﷺ کے چند مکتوباتِ گرامی پیش کررہے ہیں۔

مکتوبِ رسول ﷺ
بنام ہرقل، قیصرِ روم

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○ من محمّد رسُول اللہ الیٰ ہرقل عظیم الروم ○ سلام علیٰ من اتبع الھدیٰ ○ امابعد ○ فانی ادعوك بدعایة الاسلام ○ اسلم تسلم ○ یوتك اللہ اجرك مرتین ○ فان تولیت فان علیك اثم الاریمیین ○ ویا ھل الکتب تعالوا الی کلمه سوآء بینا وبینکم الانعبد الا اللہ ولا نشرك به شیئاً ○ ولا یتخذ بعضنا بعضاً ارباباً من دون اللہ فان تولوا فقولوا اشھد وابانا مسلمون ○ (مُہرِ نبوّت، رسولِ گرامی ﷺ)

ترجمہ:

''اللہ مہربان اور رحم کرنے والے کے نام سے۔ اللہ کے رسول محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی طرف سے، ہرقل ''عظیم روم'' کے نام۔ سلامتی ہو اُس پر جو ہدایت کی پیروی کرے۔ بعد ازیں میں تمھیں اسلام کی دعوت دیتا ہوں۔ مسلمان ہو جاؤ، سلامت رہو گے اور اللہ تمھیں دوگنا اجر دے گا۔ اگر تم نے روگردانی کی تو تمھاری جاہل رعایا کا گناہ بھی تم پر ہوگا۔ اے اہل کتاب! (اختلاف ونزاع کی ساری باتیں چھوڑ کر) اس بات پر آجاؤ جو ہمارے اور تمھارے درمیان یکساں طور پر مسلّم ہے یعنی اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو، کسی ہستی کو اُس کا شریک نہ ٹھہراؤ اور اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو ربّ نہ بناؤ۔ پھر اگر اس سے روگردانی کرو تو گواہ رہنا کہ ہم اللہ تعالیٰ کے فرمانبردار بندے (مسلمان) ہیں۔''[۱]

(مُہرِ نبوّت، رسولِ گرامی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ خط حضرت دحیہ کلبیؓ نے امیر بصریٰ (حوارن) کے توسط سے قیصر روم ہرقل تک پہنچایا۔ خط سُن کر اُس نے کہا کہ نبوّت کا دعویٰ کرنے والے کی قوم کا کوئی شخص اس شہر میں موجود ہو تو اُسے دربار میں پیش کیا جائے۔ اتفاق سے ابوسفیان اپنے قافلے کے ساتھ تجارت کی غرض سے وہاں گیا ہُوا تھا، اُسے دربار میں پیش کیا گیا تو ہرقل نے اُس سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے متعلق کئی سوالات کیے۔ ابوسفیان کا کہنا ہے کہ میں اس خوف سے جھوٹ نہ بول سکا کہ مبادا اپنے ساتھیوں میں بدنام ہو جاؤں۔ پس اُس نے ہرقل کے سولات کا جواب دیتے ہوئے کہا، ''محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ اُن کے خاندان میں اس سے پہلے نہ کسی نے نبوّت کا دعویٰ کیا ہے اور نہ کوئی بادشاہ ہی ہو گزرا ہے۔ وہ صادق اور امین ہیں۔ اُن کے پیروکار

---

[۱] ڈاکٹر نصیر احمد ناصر، کتاب: پیغمبر اعظم وآخر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، ص ۵۹۲۔ صحیحین، ڈاکٹر محمد حمید اللہ، سیاسی وثیقہ جات (اُردو ترجمہ) ص ۵۱، ۵۲۔ علامہ علی نقی نقوی، تاریخ اسلام، ص ۴۰۱ بحوالہ تاریخ الرسل الملوک، ص ۱۵۶۵

زیادہ تر کمزور لوگ ہیں جن کی تعداد میں آئے دن اضافہ ہوتا جارہا ہے۔ جنگوں میں کبھی وہ غالب رہے اور کبھی ہم۔ وہ کبھی عہد شکنی نہیں کرتے۔ ابھی ابھی ہم نے اُن کے ساتھ ایک معاہدہ کیا ہے، اب دیکھیے وہ کیا کرتے ہیں؟'' ہرقل نے کہا،''یہ علامتیں تو سچے نبی کی ہیں۔'' پھر پوچھا،''وہ لوگوں کو کس بات کا حکم دیتے ہیں؟'' ابوسفیان نے کہا،''نماز، روزہ، صلہ رحمی اور پرہیزگاری کا۔'' ہرقل کہنے لگا،''اگر ایسا ہے تو وہ یقیناً نبی ہیں۔ ہمیں معلوم تھا کہ ایک نبی کا ظہور ہونے والا ہے لیکن ہم یہ نہیں جانتے تھے کہ اُن کا ظہور تم لوگوں کے درمیان ہوگا۔'' ہرقل بے حد متاثر ہُوا، اُس نے عقیدت کا اظہار بھی کیا لیکن اسلام نہ لایا۔[1] اُس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نامۂ مبارک محفوظ کرلیا جو قسطنطنیہ کے کتب خانے میں آج بھی موجود ہے۔[۲]

اُس نے ایک جوابی خط آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں لکھا جس کا متن مندرجہ ذیل ہے:

ہرقل، قیصرِ روم کا خط

بحضور احمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جن کے ظہور کی بشارت عیسیٰ (علیہ السلام) نے بھی دی۔ منجانب قیصر روم۔ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا فرمان آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے سفیر کے ذریعے ملا۔ میں آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے رسول ہونے کا اقرار کرتا ہوں۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے ظہور کی بشارت عیسیٰ بن مریم (علیہ السلام) نے بھی انجیل میں دی۔ میں نے اپنی ساری رومی رعایا کو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر ایمان لانے کی دعوت دی لیکن اُنھوں نے انکار کردیا۔ اگر وہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر ایمان لے آتے تو اُن کے حق میں بہتر ہوتا۔ حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! کاش میں آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں باریاب ہوؤں اور آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے پاؤں دھوؤں۔[۳]

---

[1] ڈاکٹر نصیر احمد ناصر، کتاب: پیغمبر اعظم و آخر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، ص ۵۹۲

[۲] خواجہ محمد لطیف، اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ، ج ۱ ص ۱۴۰

[۳] ڈاکٹر نصیر احمد ناصر، کتاب: پیغمبر اعظم و آخر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، ص ۵۹۳

مکتوبِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

بنام شاہِ فارس (ایران)، کسریٰ پرویز

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ○ من محمّد رسُول الله الیٰ کِسریٰ عظيم فارس○ سلامٌ علیٰ من اتبع الهدیٰ و آمن باالله وَرسوله وَ شهدان لا اِله اِلا الله وَحدهٗ لا شريكَ لهٗ وان محمّداً عبدهٗ ورسوله○ادعوك بدعاية الله فانّي انا رسول الله الی الناس كافة لينذر من كان حيا ويحق القول علی الكٰفرين○ اسلم تسلم انْ ابيت فعليك اثم المجوس○ (مُہرِ نبوّت، رسولِ گرامی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)

ترجمہ:

''شروع اللہ مہربان اور رحیم کے نام سے۔ از محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بنام حاکمِ فارس کسریٰ۔ سلامتی ہو اُس پر جو ہدایت کی پیروی کرے، اللہ اور اُس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر ایمان لائے اور گواہی دے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں وہ ایک ہے اُس کا کوئی شریک نہیں اور محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اللہ کا بندہ اور اُس کا رسول ہے۔ میں تمھیں اللہ کی طرف آنے کی دعوت دیتا ہوں۔ میں تمام بنی نوع انسان کے لیے اللہ کا رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہوں تاکہ جو لوگ زندہ ہیں اُنھیں بداعمالیوں سے ڈراؤں اور کافروں پر حجّت قائم کروں۔ اسلام قبول کرلو، اِسی میں تمھاری سلامتی ہے۔ اگر انکار کروگے تو سارے مجوسیوں کا وبال تم پر ہوگا۔''[1] (مُہرِ نبوّت، رسولِ گرامی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ مکتوب حضرت عبداللہ بن حذافہ السہمیؓ نے بحرین کے والی کی وساطت سے کسریٰ پرویز تک پہنچایا۔ کسریٰ پرویز یہ خط سُن کر طیش میں آگیا اور اُسے پھاڑ کر ٹکڑے ٹکڑے کردیا۔ ربُ العالمین نے اس حرکت کی پاداش میں بہت جلد اُسے ہلاک کردیا

---

[1] ڈاکٹر نصیر احمد ناصر، کتاب: پیغمبرِ اعظم و آخر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، ص ۵۹۴۔ صحیحین۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ، سیاسی وثیقہ جات (اردو ترجمہ) ص ۷۴، ۷۵۔ ابوالبرکات عبدالرؤف داناپوری، اصح السیر، ص ۴۳۵

اور خط کی طرح اُس کی سلطنت بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔

بروایتے، کسریٰ پرویز نہایت مغرور اور متکبر بادشاہ تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے مکتوب میں اپنے نام سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا نام لکھا دیکھ کر وہ سیخ پا ہو گیا تھا۔ اُس نے اسے اپنی توہین سمجھا اور یمن کے والی باذان کو حکم بھجوایا کہ (خاکم بدہن) مدّعی نبوّت (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کو گرفتار کر کے دربار میں پیش کرو۔ چنانچہ باذان نے اُس بدبخت کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے اپنے دو اہلکار جن کے نام بابویہ اور خرخسرہ تھے مدینہ روانہ کیے۔ اُنھوں نے بارگاہِ رسالت میں پہنچ کر شہنشاہِ فارس کا گستاخانہ پیغام پہنچایا اور دھمکی دی کہ انکار کی صورت میں مدینہ کو تاراج کر دیا جائے گا۔ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اُن کی ناپاک جسارت سے درگذر فرماتے ہوئے سفارتی آداب ورواج کو ملحوظ خاطر رکھا اور حلم وکرم روا رکھتے ہوئے فرمایا، ''تم واپس جاؤ، کسریٰ ہلاک ہو چکا ہے۔'' چنانچہ وہ یمن پہنچے تو اُنھیں معلوم ہو گیا کہ کسریٰ پرویز اپنے بیٹے شیرویہ کے ہاتھوں ہلاک ہو چکا ہے۔[۱]

مکتوبِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

بنام شاہِ حبش اصحم نجاشی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○ من محمّد رسُول الله الی النجاشی ملك الحبشه○ اسلم انت فانّی احمد الیك الله الّذی لا اله الا هوالملك القدوس السّلام المومن المهیمن واشهد ان عیسیٰ بن مریم رُوح الله وکلمة القاها الیٰ مریم البتول الطیبه المحصنة فحملت بعیسیٰ فخلفة من روحه ونفخة کماخلق آدم بیده وانی ادعوك وجنودك الی الله عزوجل وبلغت ونصحت فاقبلوا نصیحتی والسلام علیٰ من اتبع الهدیٰ○

(مُہرِ نبوّت، رسولِ گرامی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم)

---

[۱] ڈاکٹر نصیر احمد ناصر، کتاب: پیغمبر اعظم وآخر (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم)، ص ۵۹۵ بحوالہ طبری ج ۳ ص ۱۵۷۲

ترجمہ: ’’مہربان اور رحم کرنے والے اللہ کے نام سے۔ محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کی جانب سے شاہِ حبش نجاشی کے نام۔ سلامتی ہو اُس پر جو ہدایت کی راہ پر گامزن ہُوا۔ میں تمھارے سامنے اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا بیان کرتا ہوں جس کا کوئی شریک نہیں، وہ بادشاہ (اَلْمَلِكُ) ہے، ہر قسم کے نقص سے پاک ومنزہ (اَلْقُدُّوْسُ) ہے، خود سلامت (اَلسَّلٰمُ) ہے، امن دینے والا (اَلْمُؤْمِنُ) ہے اور نگہبان (اَلْمُهَيْمِنُ) ہے۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ عیسیٰ بن مریم (علیہ السلام) اللہ کی رُوح اور کلمہ ہیں۔ اللہ نے اُنھیں پاکدامن کنواری مریم (علیہا السلام) میں القا کیا جس سے وہ حاملہ ہُوئیں تو اللہ نے عیسیٰ (علیہ السلام) کو اپنی روح اور نفخ (پھونک) سے پیدا کیا جس طرح آدم (علیہ السلام) کو اپنے ہاتھ سے پیدا فرمایا اور میں تم کو اور تمھارے حبش کو اللہ عزّ وجل کی طرف بلاتا ہوں۔ میں نے اللہ کا حکم پہنچا دیا اور نصیحت کر دی۔ تم میری نصیحت قبول کرو۔ اور سلام اُس پر جو اللہ کی ہدایت کی پیروی کرے۔‘‘[۱] (مُہرِ نبوّت، رسولِ گرامی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم)

عرصہ دراز سے عرب اور حبش کے درمیان بہترین تعلقات قائم تھے، اسی بنا پر مسلمانوں نے قریش کے مظالم سے تنگ آ کر ماضی میں حبشہ کی طرف ہجرت کی تھی۔ تب شاہِ حبش اصحم نجاشی (نجاشی حبش کے بادشاہوں کا خطاب تھا، اصحم بن ابجر اُس وقت کے باشاہ کا اصل نام تھا) نے نہ صرف مسلمانوں کو پناہ دی تھی بلکہ رسولِ گرامی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ذاتِ مبارکہ سے گہری عقیدت واحترام اور دِلی وابستگی کا اظہار بھی کیا تھا۔ اُمّ المومنین حضرت اُمّ حبیبہؓ کے رسولِ گرامی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ساتھ نکاح میں بھی اسی شاہِ حبش اصحم نجاشی کا اہم کردار تھا (اس کی تفصیل کتاب ہذا کے باب ازواجِ نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم میں صفحہ ۱۵۵ پر گذر چکی ہے)۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا نامۂ مبارک پا کر نجاشی بہت خوش ہُوا۔ جواباً اُس نے بھی سرکارِ دوعالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت میں خطوط ارسال

---

[۱] ڈاکٹر نصیر احمد ناصر، کتاب: پیغمبر اعظم وآخر (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم)، ص ۶۲۸۔ ڈاکٹر محمد حمید اللہ، سیاسی وثیقہ جات (اردو ترجمہ) ص ۴۶، ۴۷۔ ابوالبرکات عبدالرؤف دانا پوری، اصح السیر، ص ۴۳۶

کیے جن میں سے دو خط مندرجہ ذیل ہیں:[1]

شاہِ حبش نجاشی کا خط

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ بخدمت جناب محمد رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، من جانب اصحم ابن ابجر اے اللہ کے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! میں آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بارگاہ میں سلام عرض کرتا ہوں اور اللہ کی رحمت وبرکت کا ہدیہ پیش کرتا ہوں۔ اُس اللہ کی جانب سے جو تنہا لائقِ عبادت ہے اور جس نے مجھے اسلام قبول کرنے کی توفیق عطا فرمائی۔ اے اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) کی ولادت کے بارے میں جو ارشاد فرمایا ہے، خداوندِ عرض وسما کی قسم! حضرت عیسیٰ (علیہ السلام) میں اس سے بڑھ کر کوئی اور بات نہیں (یعنی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بالکل صحیح فرمایا ہے) اور آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر جو قرآن نازل ہُوا ہے تو میں یقین رکھتا ہوں کہ وہ اللہ ہی کی جانب سے ہے۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے عم زاد بھائی (حضرت جعفر طیار بن ابی طالب رضی اللہ عنہ) اور اُن کے رفقائے کار ہمارے ہاں تشریف لائے ہیں اور میں نے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے بھائی کے ہاتھ پر آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بیعت کر لی ہے اور خدائے ربُ العالمین کی وحدانیت کا اعتراف کر لیا ہے۔ میں اپنے بیٹے ارہا بن اصحم بن ابجر کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں بھیج رہا ہوں لیکن اپنے نفس کے سوا دوسروں کی ذمہ داری لینے سے قاصر ہوں۔ اگر حکم ہو تو میں خود بھی حاضرِ خدمت ہونے پر آمادہ ہوں۔ یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)! جب میں آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی رسالت پر ایمان لا چکا ہوں تو پھر آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے حکم کی تعمیل کیا مشکل ہے۔

والسّلام علیک یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)۔

---

[1] ڈاکٹر نصیر احمد ناصر، کتاب: پیغمبر اعظم وآخر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، ص ۵۹۶

ڈاکٹر حمید اللہ، سیاسی وثیقہ جات ص ۴۶، ۴۷۔ ابوالبرکات عبدالرؤف داناپوری، اصح السیر، ص ۴۳۶

شاہِ حبش نجاشی کا دوسرا خط

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ بحضور جناب محمد نبی اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، من جانب نجاشی اصحم ابنِ ابجر۔

السّلام علیک یا رسول اللہ من اللہ ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ۔ بعد ازیں میں نے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے قبیلے (یعنی قریش) کی مسلمان بی بی اُمّ حبیبہؓ بنت ابوسفیان کا آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے نکاح کر دیا ہے اور آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں مندرجہ ذیل اشیا ہدیۃً اریحا کے ہمراہ بھیج رہا ہوں:

ایک قمیض، ایک پاجامہ، ایک ردا اور چرمی موزوں کی ایک جوڑی۔

والسّلام علیک ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

مکتوبِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
بنام والی مصر مُقَوقِس

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○ من محمّد عبدالله رسول الله الیٰ المُقَوقِس عظیم القبط ○ سلام علیٰ من اتبع الھدیٰ ○ اما بعد فانی ادعوك بدعاية الاسلام ○ اسلم یوتك الله اجرك مرتين ○ فان توليت فعليك اثم اهل القبط ○ يا اهل الكتب تعالوا الى كلمه سوآء بيننا وبينكم ان لانعبد الا الله ○ ولا نشرك به شيئاً ○ ولا يتخذ بعضنا بعضاً اربابا من دون الله فان تولوا فقولوا اشهدوا بانا مسلمون ○ (مُہرِ نبوّت، رسولِ گرامی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)

ترجمہ:

''شروع اللہ مہربان اور رحیم کے نام سے۔ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی جانب سے جو اللہ تعالیٰ کا بندہ اور

رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہے۔ مُقَوقِس کے نام جو قبط (مصر) کا حاکم ہے۔ سلامتی ہو اُس پر جو ہدایت کی پیروی کرے۔ میں تمھیں اسلام کی دعوت دیتا ہوں، دائرۂ اسلام میں داخل ہو جاؤ، سلامت رہو گے۔ اسلام قبول کرلو، اللہ تمھیں دُہرا اَجر دے گا۔ اگر تم روگردانی کرو گے تو اہلِ قبط کا وبال بھی تم پر ہوگا۔ اے اہلِ کتاب! اُس بات کی طرف آؤ جو ہمارے تمھارے درمیان متفق علیہ ہے یعنی یہ کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور اُس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں۔ ہم میں سے بعض کسی کو بھی اللہ کے سوا اپنا ربّ نہ بنائیں۔ پھر اگر اس سے روگردانی کرو تو گواہ رہنا کہ ہم اللہ کے فرماں بردار بندے ہیں۔'' [۱] (مُہرِ نبوّت، رسولِ گرامی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ نامۂ مبارک حضرت حاطب بن ابی بلتعہؓ نے قبط یعنی مصر کے حاکم مُقَوقِس کو پہنچایا۔ اُس نے کہا میں نے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے متعلق غور وفکر کیا ہے۔ وہ کسی اچھی بات سے منع کرتے ہیں نہ برائی کا حکم دیتے ہیں اور نہ تو میں اُنھیں جھوٹا جادُوگر سمجھتا ہوں اور نہ جھوٹا کاہن ہی خیال کرتا ہوں۔ میں اُن میں علاماتِ نبوّت محسوس کرتا ہوں پس اس پر مزید سوچ بچار کروں گا۔ [۲]

مُقَوقِس نے نبی اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نامہ مبارک نہایت تعظیم کے ساتھ ایک قیمتی صندوقچی میں بند کر دیا۔ مصر کے شاہی کتب خانہ میں یہ نامہ مبارک اب تک محفوظ ہے۔ [۳]

---

[۱] ڈاکٹر نصیر احمد ناصر، کتاب: پیغمبر اعظم وآخر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، ص ۶۲۸

ڈاکٹر محمد حمید اللہ، سیاسی وثیقہ جات، رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیاسی زندگی، ص ۱۹۹

طبری، ۳: ۱۵۶۹۔ صبح الاعشی، ۶: ۴۶۶

ابوالفداء عمادُ الدین ابن کثیر (متوفی ۱۳۳۱ء)، تاریخ ابن کثیر ۳: ۸۴

ابن القیم (متوفی ۷۵۱ھ)، زاد المعاد، ۳: ۶۰

[۲] ڈاکٹر نصیر احمد ناصر، کتاب: پیغمبر اعظم وآخر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، ص ۵۹۷

[۳] خواجہ محمد لطیف، اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ، ج ۱ ص ۱۴۰

پھر مُقَوقِس نے ایک عربی کاتب کو بلوا کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں مندرجہ ذیل خط لکھوایا:

حاکم مصر مُقَوقِس کا خط

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ محمد بن عبداللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں مقوقس عظیم قبط کی طرف سے۔ سلام ہو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) پر۔ امّا بعد، میں نے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کا نامۂ گرامی پڑھا اور اس میں جو کچھ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ہے اور جس بات کی طرف بلایا ہے، اُس کو سمجھا۔ میں جانتا ہوں کہ ایک نبی باقی ہیں مگر میرا خیال تھا کہ اُن کا خروج شام میں ہوگا۔ میں نے جناب کے قاصد کی عزت افزائی کی ہے اور آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی خدمت میں قوم قبط (مصر کی قوم) کی دو بلند مرتبہ کنیزیں، خلعت اور سواری کے لیے خچر بطور تحفہ روانہ کیے ہیں۔ والسّلام علیک

اُن کنیزوں کے نام ماریہ اور سیرین اور خچر کا نام دُل دُل تھا۔ مقوقس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سفیر حضرت حاطب بن ابی بلتعہ رضی اللہ عنہ کو بھی خلعت اور ایک سو مثقال سونا دیا۔[1]

مکتوبِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
بنام شاہِ یمامہ ہوذہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○ من محمّد رسُول اللہ الیٰ ھوذہ بن علی ○
سلام علیٰ من اتبع الھدیٰ واعلم ان دینی سیظھر الیٰ منتھی الخف والحافر فاسلم تسلم واجعل لك ما تحت یدیك ○

(مُہرِ نبوّت، رسولِ گرامی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)

---

[1] ڈاکٹر نصیر احمد ناصر، کتاب: پیغمبر اعظم و آخر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، ص ۵۹۷، ۵۹۸
ابن القیم (متوفی ۷۵۱ھ)، زاد المعاد، ج ۳، ص ۱۸۴۔ داناپوری، اصح السیر، ص ۴۳۸

ترجمہ:

''اللہ رحمٰن اور رحیم کے نام سے۔ اللہ کے رسول محمد (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کی طرف سے ہوذہ بن علی کے نام۔ سلامتی ہو اُس پر جس نے ہدایت کی پیروی کی۔ جان لو کہ میرا دِین وہاں تک پھیلے گا جہاں تک چوپائے اور گھوڑے جاسکتے ہیں۔ اسلام قبول کر لو تو تمھارے لیے سلامتی ہے اور جو علاقہ تمھارے ماتحت ہے ہم اُسے تمھارا بنا دیں گے۔''[۱]

(مہرِ نبوّت، رسولِ گرامی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم)

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا یہ مکتوب گرامی لے کر حضرت سلیط بن عمرو عامری رضی اللہ عنہ شاہِ یمامہ ہوذہ کے پاس گئے۔ ہوذہ اُن کے ساتھ بہت احترام سے پیش آیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا نامۂ مبارک بڑی توجہ سے سُنا پھر مندرجہ ذیل خط جواب میں لکھوایا:

شاہِ یمامہ ہوذہ کا خط

''کتنی اچھی اور خوب ترین بات ہے جس کی طرف آپ (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) ہمیں بُلاتے ہیں۔ عرب میرے مقام ومرتبہ کی تعظیم کرتے ہیں۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) مجھے اختیارات تفویض فرمائیں، (تو پھر) ہم اتباع کریں گے۔''

حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اُس کا خط سُن کر فرمایا، ''اگر وہ ایک بالشت زمین بھی طلب کرے گا تو نہیں دیں گے۔ جو کچھ اُس کے قبضے میں ہے وہ بھی جانے والا ہے۔''[۲] نبی صادق صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا فرمان صادق آیا اور ہوذہ کے قبضے میں جو کچھ تھا، سب جاتا رہا۔ (اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُس نے اتباعِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو اختیارات کے تفویض کیے جانے سے مشروط کیا تھا۔)

---

[۱] ڈاکٹر نصیر احمد ناصر، کتاب: پیغمبرِ اعظم وآخر (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم)، ص۶۲۹

[۲] ڈاکٹر نصیر احمد ناصر، کتاب: پیغمبرِ اعظم وآخر (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم)، ص۵۹۸

مکتوبِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

بنام منذر بن حارث بن ابی شمر غسانی

ڈاکٹر نصیر احمد ناصر نے اس کا نام حارث بن شمر غسانی لکھا ہے۔[1] طبری نے منذر بن الحارث بن ابی شمر الغسانی رئیس دمشق لکھا ہے۔[2] ابن خلدون نے حرث بن شمر غسانی ہے۔[3] اور علامہ علی نقی نقن نے اس کا نام منذر بن الحارث بن ابی شہر الغسانی تحریر کیا ہے۔[4] یعنی ان سب نے ''ابی شمر'' لکھا ہے سوائے علامہ علی نقی کے جنہوں نے ''ابی شہر'' لکھا ہے، پس یہ کتابت کی غلطی معلوم ہوتی ہے اور صحیح نام حارث بن ابی شمر غسانی ہی ہے۔ (مؤلف)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ○ من محمّد رسول اللہ الیٰ الحارث ابن ابی شمر ○ سلام علیٰ من اتبع الھدیٰ وامن بہ وصدق وانی ادعوك الیٰ ان تومن باللہ وحدہٗ لاشریك ولہ یبقی لك ملك ○ (مُہرِ نبوّت، رسولِ گرامی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)

ترجمہ: ''اللہ کے نام سے شروع جو نہایت مہربان اور رحیم ہے۔ اللہ کے رسول محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی جانب سے حارث بن ابی شمر کے نام۔ سلامتی ہو اُس پر جو راہِ ہدایت پر گامزن ہو اور جو ایمان لائے اور اُس کی تصدیق کرے۔ میں تمھیں اللہ عزوجل پر ایمان لانے کی دعوت دیتا ہوں، اللہ جو ایک ہے اور جس کا کوئی شریک نہیں۔ (ایمان لے آؤ) اس طرح تمھارا ملک تمھارے پاس باقی رہے گا۔''[5] (مُہرِ نبوّت، رسولِ گرامی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ خط شجاع بن وہب اسدی کے ہاتھ بھجوایا۔

---

[1] ڈاکٹر نصیر احمد ناصر، کتاب: پیغمبر اعظم و آخر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، ص ۵۹۹

[2] ابو جعفر محمد بن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ھ)، تاریخ طبری (اردو)، ج ۲ حصہ اوّل، ص ۲۶۸

[3] عبدالرحمٰن ابن خلدون، (متوفی ۸۰۸ھ ۱۴۰۶ء) تاریخ ابن خلدون، حصہ اوّل، ص ۱۱۷

[4] علامہ علی نقی نقوی، تاریخ اسلام ص ۴۰۱

[5] ڈاکٹر نصیر احمد ناصر، کتاب: پیغمبر اعظم و آخر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، ص ۶۲۹

خیبر

(محرم ۷ ہجری/مئی جون ۶۲۸ء)

خیبر کا مقام مدینہ طیّبہ سے سات برید کی مسافت پر واقع تھا اور اُس وقت وہ مسافت ۴۸ گھنٹے کی تھی۔ برید کا مطلب ہے قاصد یا ڈاک یا ڈاکخانہ وغیرہ۔ پرانے زمانے میں ڈاک کی ترسیل کے لیے چوکیاں ہوا کرتی تھیں، لمبی منزل تک ڈاک پہنچانے کا طریقہ یہ تھا کہ ایک قاصد ڈاک لے کر ایک چوکی تک جاتا، وہاں سے وہ ڈاک دوسرے قاصد کے سپرد کر دی جاتی جو اُسے لے کر اگلی چوکی تک جاتا اور اسی طرح مختلف چوکیوں پر وہ ڈاک اگلی چوکی کے ڈاکیے کے حوالے کر دی جاتی تھی۔ پس یہاں برید سے مراد ڈاک کی چوکیاں ہی ہیں یعنی مدینہ منوّرہ سے سات چوکیوں کی مسافت پر خیبر واقع تھا۔ گوگل نقشے کے مطابق مدینہ سے خیبر کا فاصلہ براستہ الملیلیح، ۱۶۹ کلومیٹر ہے جو بذریعہ کار تقریباً ایک گھنٹہ اڑتیس منٹ میں طے ہوتا ہے۔

خیبر کا نام عمالقہ میں سے ایک شخص کے نام پر مشہور ہُوا۔ اُس شخص کے دوسرے بھائی کا نام یثرب تھا اور مدینہ کو اُسی کی نسبت سے یثرب کہا جاتا تھا۔ ایک قول کے مطابق یہودیوں کی زبان میں خیبر کے معنی قلعے کے ہیں اور اُس شہر میں کئی مضبوط قلعے، کھیت اور نخلستان تھے جن کی نسبت سے اُس کو خیبر کہا جاتا تھا۔[۱]

خواجہ محمد لطیف انصاری لکھتے ہیں، ''خیبر عبرانی لفظ ہے جس کا ماخذ لفظ ''خبرڈ'' ہے جو قلعوں کے معانی میں ہے۔ خیبر مدینہ طیبہ سے شمال کی طرف آٹھ منزل یعنی ۹۲ میل کے فاصلے پر یہودیوں کا ایک قصبہ تھا جہاں بہت سے قلعے تھے۔''[۲]

---

[۱] سید محسن امین عاملی (متوفی ۱۹۵۳ء)، اعیان الشیعہ، ج ۲ ص ۲۵۶

[۲] خواجہ محمد لطیف انصاری، اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ، ج ۱ ص ۱۵۰

مؤرّخ کے اے حمید (بیرسٹر ایٹ لاء) لکھتے ہیں، ''خیبر مدینہ سے شام کی طرف تین منزل کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہاں یہودیوں کی کئی بستیاں قائم تھیں۔ یہودیوں کو خیبر کے فلک بوس قلعوں پر بہت ناز تھا، اُنھیں یقین تھا کہ اُن کا ملک بہت زیادہ مستحکم اور مضبوط ہے۔[۱]

خیبر کی مہم ہجرت کے ساتویں سال کے آغاز میں، ماہ محرم کے وسط میں[۲] یا بقولے جمادی الاوّل میں[۳] یا بروایتے ۶ ہجری کے آخری ماہ ذی الحجہ میں پیش آئی۔[۴]

جنگِ خیبر کا پس منظر

میثاقِ مدینہ کے باب میں تفصیلاً بیان کیا جا چکا ہے کہ مدینہ اور اُس کے گرد و نواح کے یہودیوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ساتھ ایک معاہدہ کیا تھا جسے تاریخ میں میثاقِ مدینہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اُس معاہدے کے تحت اُنھوں نے رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی حکومت کو سیاسی طور پر قبول کیا تھا اور اسلامی حکومت کے زیرِ سایہ بحیثیت رعایا رہنا تسلیم کیا تھا۔ اُنھوں نے عہد کیا تھا کہ وہ امن سے رہیں گے اور مسلمانوں کے خلاف کوئی کاروائی نہیں کریں گے بلکہ مسلمانوں کے کسی حریف کا ساتھ بھی نہیں دیں گے اور اگر مسلمانوں کے خلاف کوئی بیرونی دشمن سر اُٹھائے گا تو وہ مسلمانوں کی حمایت کریں گے۔ لیکن اس کے برعکس اُنھوں نے در پردہ اور بسا اوقات کھلم کھلا اسلامی حکومت کے خلاف کئی گھناونی سازشیں کیں حتیٰ کہ مشرکینِ مکّہ کا ساتھ بھی دیا۔ اس بغاوت کی پاداش میں اُن کے خلاف کی گئی کاروائیاں، جنھیں ''تادیبی کاروائیاں'' کہا جاسکتا ہے بیان کی جاچکی ہیں۔ اُن کاروائیوں کے ذریعے یہودیوں کو مدینہ بدر بھی کیا گیا تھا جن میں سے اکثر خیبر چلے گئے تھے۔

---

[۱] کے اے حمید بی اے (لندن) بیرسٹر ایٹ لاء لاہور، تاریخ مسلمانانِ عالم، ج ۲ ص ۸۳

[۲] ابوالفدا (متوفی ۱۳۳۱ء)، تاریخ ابوالفدا، ج ۱ ص ۱۴۷

[۳] سید محسن امین عاملی (متوفی ۱۹۵۳ء)، اعیان الشیعہ، ج ۲ ص ۲۵۶

[۴] علامہ طبرسی (متوفی ۵۳۲ء)، اعلام الوریٰ

خیبر کے یہودیوں نے مخالف جماعتوں کے ساتھ ساز باز کر کے کئی قبیلوں کو اپنے ساتھ ملا لیا اور ایک خفیہ معاہدہ کیا کہ مدینہ پر حملہ کر کے اسلامی حکومت کو تاراج کر دیا جائے اور اگر وہ اس مقصد میں کامیاب ہو گئے تو ہمیشہ کے لیے خیبر کی نصف پیداوار اپنے حلیفوں کو دیں گے۔[1] چنانچہ چھ ہجری کے اواخر میں خیبر کے یہودیوں نے اپنے حلیف قبیلے غطفان اور یثرب کے کئی چھوٹے موٹے قبائل کو لالچ دے کر اپنے ساتھ ملا لیا۔ رسول گرامی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو اُن کے ناپاک عزائم کی خبر ہوئی تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے جوابی کاروائی کی تیاری شروع کر دی۔

لشکرِ اسلام کی روانگی

حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے محرّم سات ہجری میں حضرت سباع بن عُرفطہ غفاریؓ کو مدینہ کا نگران مقرر فرمایا اور سولہ سو (۱۶۰۰) مجاہدین کے ساتھ جن میں دوسو (۲۰۰) سوار اور چند رضا کار خواتین تھیں[2] یا چودہ سو (۱۴۰۰) مسلمان جن میں بیس (۲۰) خواتین تھیں،[3] خیبر کی طرف پیش قدمی فرمائی۔

آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم جنگی اُمور اور عسکری منصوبہ بندی کے ماہر تھے چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے برق رفتاری سے رجیع پہنچ کر چھاؤنی ڈال دی۔ یہ غطفان اور خیبر کے درمیان عسکری نوعیت کا ایک اہم ترین مقام تھا، یہاں چھاؤنی قائم کرنے کا مقصد یہ تھا کہ غطفان سے خیبر جانے والی شاہراہ کو کاٹ دیا جائے تاکہ غطفان خیبر کے یہود کو کمک نہ پہنچا سکیں اور اسلامی لشکر پر عقب سے حملہ آور نہ ہو سکیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی اس حکمت عملی کا نتیجہ فوراً ہی سامنے آ گیا۔ بنی غطفان کو جب خبر ہوئی کہ اسلامی لشکر خیبر کی طرف پیش قدمی کر چکا ہے تو وہ عقب سے حملہ آور ہونے کے لیے تیزی سے روانہ ہوئے مگر رجیع پر لشکرِ اسلام کو جارحانہ انداز میں صف آرا دیکھ کر ششدر رہ

---

[1] کے اے حمید، بی اے (لندن) بیرسٹرایٹ لاء لاہور، تاریخ مسلمانانِ عالم، ج ۲ ص ۸۳

[2] ڈاکٹر نصیر احمد ناصر، کتاب: پیغمبر اعظم و آخر (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم)، ص ۶۰۰

[3] کے اے حمید بی اے (لندن) بیرسٹرایٹ لاء لاہور، تاریخ مسلمانانِ عالم، ج ۲ ص ۸۳

گئے۔ عقب سے حملہ کرنے کا اب کوئی راستہ نہیں تھا، لشکرِ اسلام سے ٹکرانے کا مطلب خودکشی کے سوا اور کچھ نہیں تھا چنانچہ وہ ناکام و نامراد واپس بھاگ گئے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے رجیع کو اپنا عسکری صدر مقام بنایا، سامانِ رسد اور خواتین کا کیمپ بھی یہیں لگوایا اور لشکر کی ایک ٹکڑی اُن پر متعین کر کے خیبر کی طرف کوچ فرمایا۔ سپہ سالارِ اعظم رسولِ معظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اتنی تیزی سے خیبر پہنچے کہ اسلامی لشکر کو دیکھ کر یہود سراسیمہ ہو کر اپنے قلعوں میں دبک گئے۔ وہاں اُن کے آٹھ قلعے تھے:

ایک طرف النّطاط، صعب بن معاذ، الشّق اور النّاعم تھے اور دوسری طرف الکتیبہ، الوطیح، السُّلالم اور القموص یا القیموس تھے۔[1] کے اے حمید کے مطابق وہ دس قلعے تھے جن میں دس ہزار (۱۰۰۰۰) فوج ہر وقت لڑنے کے لیے تیار رہتی تھی۔[2] علامہ طبرسی لکھتے ہیں خیبر میں چودہ ہزار (۱۴۰۰۰) یہودی قلعہ بند تھے۔[3] قلعہ قموص یا قیموس، ان قلعوں میں سب سے زیادہ مضبوط تھا اور مرکزی حیثیت رکھتا تھا۔ یہ ایک پہاڑی پر واقع تھا، قموص درحقیقت اُسی پہاڑی کا نام تھا جس کی نسبت سے اُسے قلعہ قموص کہا جاتا تھا۔[4] یہ قلعہ اُس پوری یہودی ریاست کو محفوظ کرنے والا باب (دروازہ) تھا اس لیے اس قلعہ قموص پر خیبر کا اطلاق ہوتا تھا۔[5] کچھ ایسا ہی دیگر کتب مثلاً فتح الباری اور فاتحِ خیبر میں بھی منقول ہے کہ قموص نامی قلعہ تمام قلعوں سے زیادہ مستحکم و عظیم تھا اور یہی قلعہ اپنی عظمت و استحکام کے سبب جنگِ خیبر کے واقعات میں قلعۂ خیبر کے نام سے موسوم و مشہور ہے۔[6]

---

[1] ڈاکٹر نصیر احمد ناصر، کتاب: پیغمبر اعظم و آخر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، ص ۶۰۱

[2] کے اے حمید بی اے (لندن) بیرسٹر ایٹ لاء لاہور، تاریخ مسلمانانِ عالم، ج ۲ ص ۸۳

[3] علامہ طبرسی (متوفی ۵۳۲ء)، اعلام الوریٰ

[4] شہاب الدین ابو عبداللہ یاقوت بن عبداللہ رومی حموی (متوفی ۶۲۶ ہجری)، معجم البلدان، ج ۷ ص ۱۶۹
حسین بن محمد دیار بکری (متوفی ۸۹۲ ہجری ۱۵۷۴ء)، تاریخ خمیس، ج ۲ ص ۱۴۸

[5] علامہ زرقانی (متوفی ۱۱۲۲ ہجری)، الزرقانی علی المواھب، ج ۲ ص ۲۲۳۰

[6] علامہ علی نقی نقوی، تاریخ اسلام، ص ۶۹ ۳ بحوالہ فتح الباری، فاتح خیبر، ص ۹

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہود کو پیشکش کی کہ دائرۂ ایمان میں داخل ہوکر امان حاصل کرلو لیکن وہ اس پر آمادہ نہ ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حملے کا حکم صادر فرما دیا۔ سب سے پہلے قلعہ النطاط پر حملہ ہُوا اور وہ فتح ہوگیا، پھر قلعہ الناعم اور قلعہ صعب بھی سر ہوگئے۔ اب قلعہ قموص کی باری تھی لیکن اُسے حاصل کرنا دشوار ثابت ہُوا چنانچہ اُس کا محاصرہ طول پکڑ گیا۔[1]

رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور شیرِ خدا علیہ السلام کی علالت

قلعہ قموص، جو خیبر کا مضبوط ترین قلعہ تھا اور جسے سر کرنا دشوار ترین ثابت ہُوا، اُس کو فتح کرنے میں ناکامی کے دو اسباب تھے۔ ایک تو یہ کہ اُس قلعے کے محاصرے کے دوران میں دردِ شقیقہ کی وجہ سے نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مزاج ناساز ہوگیا[2] اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قلعہ سر کرنے کی مہم میں بنفسِ نفیس شامل نہ ہوسکے۔ اور دوسرا سبب تھا شیرِ خدا علی علیہ السلام کی عدم موجودگی۔ وہ اب تک ہر جنگ میں پیش پیش تھے مگر شدید آشوبِ چشم میں مبتلا ہونے کی وجہ سے خیبر کی مہم میں آ ہی نہیں سکے تھے۔[3] اگر علی علیہ السلام ہوتے تو یہ قلعہ اب تک فتح ہوچکا ہوتا جیسا کہ آنیوالے وقت نے بعد میں ثابت کردیا۔

مسلمانوں کی خیبر فتح کرنے کی کوششِ ناکام

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی علالت کے دوران میں کچھ مسلمان خود ہی علم لے کر میدان میں جاتے رہے اور اپنی سی کوشش کرتے رہے مگر کسی سے قلعہ فتح نہ ہُوا، عنانِ مراد ہاتھ نہ آئی اور وہ بے نیل مرام ہی واپس لوٹتے رہے۔[4]

---

[1] ڈاکٹر نصیر احمد ناصر، کتاب: پیغمبر اعظم و آخر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، ص ۶۰۲

[2] حسین بن محمد دیار بکری (متوفی ۸۹۲ ہجری ۱۵۷۴ء)، تاریخ خمیس، ج ۲ ص ۴۳

[3] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۲۹۷، تاریخ خمیس، ج ۲ ص ۴۳

[4] ابوالفدا (متوفی ۱۳۳۱ء)، تاریخ ابوالفدا ج ۱ ص ۱۸۷۔ شیخ عبدالحق، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۲۹۶

فاتح خیبر کا انتخاب اور عطائے علم

اہلِ سنت کے معروف سیرت نگار شیخ عبدالحق محدث دہلوی ''مدارج النبوّت'' میں لکھتے ہیں، ''ازل سے ارادۂ الٰہی اِسی پر تھا کہ یہ فضلِ خاص یعنی فتحِ خیبر حضرت علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہ' کے ساتھ مزید خصوصیت کے ساتھ شامل ہو۔ چونکہ قلعہ قموص خیبر کے تمام قلعوں سے زیادہ سخت اور مستحکم تھا چنانچہ اُس کو آپ کے ہاتھ پر فتح کرایا اور اُسے خیبر کے تمام قلعوں اور اُن کے شہروں کا مقدمہ اور اساس بنایا۔ اگرچہ اُن میں سے کچھ قلعے مثلاً نطاۃ (نطاط) اور صعب وغیرہ اس سے پہلے فتح ہو چکے تھے لیکن تمام فتح خیبر اور اکمال جناب مرتضوی (حضرت علی المرتضیٰ علیہ السلام) سے منسوب ہے۔ پس ایک رات حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا، ''لَاُعْطِیَنَّ الرَّایَۃَ غَدًا رَجُلاً یُحِبُّہُ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ یَفْتَحُ اللّٰہُ عَلَیْہِ'' یعنی کل وہ شخص جھنڈا لے گا جس کو اللہ اور اُس کا رسول (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) پسند فرماتے ہیں اور اللہ اُس پر فتح دے گا۔ ایک روایت میں آیا ہے، ''رَجُلٌ کَرَّارًا غَیْرَ فَرَّارٍ'' یعنی وہ مرد بار بار پلٹ کر دشمن پر حملہ کرے گا اور پیچھے نہ ہٹے گا۔ ''روضۃ الاحباب'' میں اس کی تفسیر یہ کی گئی ہے کہ وہ شخص بڑھ بڑھ کر حملہ کرنے والا ہے اور پیچھے ہٹنے والا نہیں۔[1] بروایتے، رسولِ معظم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا،

''لَاُعْطِیَنَّ الرَّایَۃَ غَدًا رَجُلاً یُحِبُّ اللّٰہُ وَرَسُوْلَہٗ وَیُحِبہُ اللّٰہُ وَرَسُوْلَہٗ''[2]

(ضرور بالضرور کل یہ علَم میں اُس آدمی کو دوں گا جو اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو محبوب رکھتا ہوگا اور اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اُسے محبوب رکھتے ہوں گے)۔ اسی طرح کے الفاظ الگ الگ روایتوں یا تاریخوں میں کچھ کمی بیشی کے ساتھ وارد ہوئے ہیں مثلاً تاریخ ابوالفدا میں ہے:

''اَمَا وَاللّٰہِ لَاُعْطِیَنَّ الرَّایَۃَ غَدًا رَجُلاً یُحِبُّ اللّٰہُ وَرَسُوْلَہٗ وَ یُحِبُّہُ اللّٰہُ وَ رَسُوْلَہٗ کَرَارًا

---

[1] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۲۹۶، ۲۹۷ بحوالہ روضۃ الاحباب

[2] علامہ علی نقی نقوی، تاریخ اسلام، ص ۳۰۷

غَیْرَ فَرَّارٍ یاخذھا عنوۃ‘‘[1] (معلوم ہونا چاہیے کہ قسم اللہ کی میں لازمی طور پہ علم کل اُس شخص کو دوں گا جو اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے محبت کرتا ہے اور اللہ اور اُس کا رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اُس سے محبت کرتے ہیں، وہ بڑھ بڑھ کر حملے کرنے والا ہے، بھاگنے والا نہیں اور وہ اس قلعے کو قوت وطاقت کے ساتھ لے لے گا)۔ ’’اعلام الوریٰ‘‘ میں ہے:

’’لَاُعْطِیَنَّ الرَّایَۃَ غَدًا رَّجُلاً کَرَّارًا غَیْرَ فَرَّارٍ یُحِبَّ اللہَ وَرَسُوْلَہٗ وَیُحِبُّہُ اللہُ وَرَسُوْلُہٗ لَا یرجِعَ حَتّی یَفْتَحِ اللہُ عَلیٰ یَدَیْہِ‘‘[2] (میں لازمی طور پہ علم کل اُس شخص کو دوں گا جو اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے محبت کرتا ہے اور اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اُسے دوست رکھتے ہیں۔ وہ بڑھ بڑھ کر حملے کرنے والا ہے ایسا جو بھاگنے والا نہیں اور وہ اللہ اُس کے ہاتھ پر فتح ونصرت عطا کرے گا)۔ ابن ہشام نے لکھا ہے:

’’لَاُعْطِیَنَّ الرَّایَۃَ غَدًا رَّجُلاً یُحِبُّ اللہُ وَرَسُوْلَہٗ یَفْتَحِ اللہُ عَلیٰ یَدَیْہِ لیس بِفرار‘‘[3]

(میں لازمی طور پہ علم کل اُس شخص کو دوں گا جو اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے محبت کرتا ہے اور اللہ اُس کے ہاتھ پر فتح ونصرت عطا کرے گا اور وہ بھاگنے والا نہیں۔)

پس، جب زبانِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے یہ اعلان ہُوا تو ہر ایک کے دِل میں یہ حسرت پیدا ہوئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کل مجھے علم عطا فرمائیں۔ پس وہ بارگاہِ رسالت میں دوزانو ہوکر اور گھٹنوں کے بل بیٹھے اور گردنیں لمبی کر کر کے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی طرف پُراُمید نظروں سے دیکھنے لگے۔[4]

---

[1] ابوالفدا (متوفی ۱۳۳۱ء)، تاریخ ابوالفدا، ج ۱ ص ۱۴۷

[2] علامہ طبرسی (متوفی ۵۳۲ء)، اعلام الوریٰ

[3] ابن ہشام (متوفی ۸۳۳ء) تاریخ ابن ہشام، ج ۲ ص ۱۸۷

[4] ابوالفدا (متوفی ۱۳۳۱ء)، ابوالفدا، ج ۱ ص ۱۴۰، ابوجعفر محمد بن جریر طبری، تاریخ طبری، ج ۳ ص ۹۳ علامہ طبرسی (متوفی ۵۳۲ء)، اعلام الوریٰ۔ حسین بن محمد دیار بکری (متوفی ۱۵۷۴ء)، تاریخ خمیس، ج ۲ ص ۴۸

اسد اللہ الغالب علی ابن ابی طالب علیہ السلام کی شجاعت اور مردانگی سے سبھی واقف تھے اس لیے جانتے تھے کہ عطائے علم کے واحد حقدار تو وہی ہیں لیکن دل کو اطمینان یہ تھا کہ وہ آشوبِ چشم میں مبتلا ہونے کیوجہ سے اس مہم پر آئے ہی نہیں اس لیے اُن کی عدم موجودگی میں اُس خاص علمدار کا انتخاب باقی ماندہ لوگوں میں سے ہی ہوگا۔

''مدارج النبوّت''میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی لکھتے ہیں،''روایت میں ہے کہ ایک جماعت دوسرے سے کہتی تھی ،''یہ تو طے سمجھو کہ علی ابن ابی طالب علیہ السلام تو اس مراد سے فائز نہ ہوں گے کیونکہ اُن کی آنکھ اس شدت سے درد کرتی ہے کہ وہ اپنے پاؤں تک نہیں دیکھ سکتے۔''[۱]

معروف مؤرّخ علامہ طبرسی بیان کرتے ہیں،''قریش کے لوگ آپس میں کہہ رہے تھے کہ علی علیہ السلام کے میدان میں آنے کا خطرہ تو ہے ہی نہیں کیونکہ اُن کی آنکھیں اس شدت سے دُکھتی ہیں کہ وہ اپنے پیر رکھنے کی جگہ نہیں دیکھ سکتے۔''[۲]

اُدھر مدینہ میں حضرت علی علیہ السلام کا دل سخت بے قرار اور مضمحل تھا اور ایک ہی خیال دامن گیر تھا کہ آنکھ کی تکلیف کے سبب خیبر کی مہم میں رسولِ گرامی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہمرکابی کے شرف سے محروم رہ گئے۔ پس، ایک دن اللہ کے حضور دُعا گو ہوئے،''اَللّٰھُمَّ لَا مَانِعَ لِمَا اَعْطَیْتَ وَلَا مُعْطِیَ لِمَا مَنَعْتَ''(الٰہی! جب تُو عطا کرنا چاہے تو کوئی روکنے والا نہیں اور جب تُو روکنے والا ہے تو کوئی دینے والا نہیں) اور علالت میں ہی مدینہ طیبہ سے نکل کر خیبر کی طرف چل پڑے تھے۔ لوگ آپ کی روانگی سے لاعلم تھے مگر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خبر ہوگئی تھی۔

خیبر کے اُفق پر اگلے دن کا وہ آفتاب طلوع ہو چکا تھا جس سے کئی لوگوں کی اُمیدیں وابستہ تھیں۔ علی علیہ السلام بھی پہنچ چکے تھے مگر اس کے باوجود لوگ پیکرِ آس بنے رسولِ اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف دیکھ رہے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا،''علی ابن ابی طالب (علیہ السلام)

---

[۱] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۲۹۶

[۲] علامہ طبرسی (متوفی ۵۳۲ء)، اعلام الوریٰ

کہاں ہیں؟'' شاید فرمانِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے لوگوں کو اپنی اُمیدوں کے چراغ گُل ہوتے ہوئے نظر آئے جو اُنھوں نے ہر طرف سے عرض کیا وہ یہیں ہیں لیکن اُن کی آنکھیں اتنا درد کرتی ہیں کہ وہ اپنے پاؤں تک کو نہیں دیکھ سکتے۔ فرمایا، ''اُن کو میرے پاس لاؤ۔''[1]

حضرت مسلمہؓ بن الاکوع گئے اور علی علیہ السلام کو ہاتھ سے تھام کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے لائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُن کے سر کو اپنی ران مبارک پر رکھا، اپنا لعابِ دہن مبارک اُن کی چشمِ مبارک میں لگایا اور دُعا مانگی۔ اُسی وقت اُن کی آنکھ سے درد جاتا رہا اور شفائے کلی حاصل ہوگئی۔ ایک روایت میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ دُعا بھی مانگی، ''اَللّٰھُمَّ اَذْھِبْ عَنْہُ الْحَرُّ وَالْقَرَا'' یعنی اے خدا! اِن سے گرمی اور سردی دونوں کو دُور رکھ۔ ابن لیلیٰ کہتے ہیں کہ حضرت علی المرتضیٰ علیہ السلام سخت گرمی میں روئی کا لباس اور سخت سردی میں باریک کپڑے کا لباس زیب تن فرمالیتے تو بھی اُنھیں کوئی ضرر نہ پہنچتا تھا۔ پس جب علی علیہ السلام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دُعا سے آشوبِ چشم سے نجات پائی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُنھیں اپنی خاص زِرّہ پہنائی، اُن کے میان سے تلوار باندھی اور فرمایا، ''جاؤ التفات نہ کرنا جب تک کہ حق تعالیٰ تمھارے ہاتھ پر قلعہ فتح نہ فرمادے۔ اس کے بعد حضرت علی المرتضیٰ (علیہ السلام) علم لے کر روانہ ہوئے۔''[2]

مورخ دیار بکری نے لکھا ہے، ''علی علیہ السلام شفایاب ہوگئے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی فولادی زِرّہ کو اُن کے زیبِ جسم کیا اور ذوالفقار اُن کی کمر میں لگائی اور پھر علم عطا فرمایا۔''[3]

علامہ طبرسی نے لکھا ہے، ''علی علیہ السلام کو ہاتھ سے پکڑ کر لایا گیا تو حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے

---

[1] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۲۹۶۔ علامہ علی نقی نقوی، تاریخ اسلام، ص ۵۷۳ بحوالہ علامہ طبرسی (متوفی ۵۳۲ء)، اعلام الوریٰ۔ حسین بن محمد دیار بکری، تاریخ خمیس، ج ۲ ص ۴۸

[2] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۲۹۷

[3] حسین بن محمد دیار بکری (متوفی ۸۹۲ ہجری ۱۴۷۵ء)، تاریخ خمیس، ج ۲ ص ۴۹

اُن کا سر اپنے زانو پر رکھ کر آنکھوں میں اپنا لعاب دہن ڈالا تو فوراً آنکھیں صحیح وسالم ہو گئیں۔ اس کے بعد اُن کو اپنا علم دے دیا۔''[1] طبری نے بھی کچھ ایسا ہی لکھا ہے، ''آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے علی علیہ السلام کو بلایا، اُن کو آشوبِ چشم تھا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اُن کی آنکھوں پر اپنا لعابِ دہن لگایا اور اپنا جھنڈا اُن کو دیا۔''[2] سیرت ابن ہشام میں ہے، ''حضرت پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام کو بلایا اس عالم میں کہ وہ آشوبِ چشم میں مبتلا تھے تو اُن کی آنکھوں میں اپنا لعابِ دہن ڈالا پھر فرمایا اب یہ علم لے جاؤ کہ اللہ تمھارے ہاتھوں فتح کی صورت نصیب کرے۔''[3]

معروف مؤرّخ واقدی لکھتے ہیں، ''لوگ آکر حضرت پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے پاس بیٹھے۔ جب تمام لوگ اپنے اپنے جھنڈوں سمیت آ گئے تو حضرت پیغمبرِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے علم کو ہاتھ میں لے کر جنبش دی اور اپنے پروردگار سے دُعا مانگی پھر اُسے علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے حوالے کر دیا۔''[4]

جناب امیر علیہ السلام کا اندازِ ورُود

وہ علم جسے پانے کی آرزو ہر مسلمان کے دِل کی حسرتِ ناکام بن کے رہ گئی تھی، جناب امیر المومنین علیہ السلام کو عطا ہُوا تو آپ کی چال میں عجب وقار اور رفتار میں بلا کی تیزی عَود کر آئی اور آپ برق رفتاری کے ساتھ میدان کی طرف بڑھے۔ مؤرّخین لکھتے ہیں، ''علم پانے کے بعد حضرت علی علیہ السلام دوڑتے ہوئے میدان کی طرف روانہ ہوئے۔''[5] حضرت جابر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے، ''آپ اتنی جلدی روانہ ہوئے کہ ہمیں ہتھیار لگانا مشکل ہو گئے اور سعد بن

---

[1] علامہ طبرسی (متوفی ۵۳۲ء)، اعلام الوریٰ

[2] ابوجعفر محمد بن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ھ)، تاریخ طبری، ج ۲ حصہ اوّل ص ۲۷۵

[3] سیرت ابن ہشام ج ۲ ص ۱۸۴۔ ابوالفدا (متوفی ۱۳۳۱ء)، تاریخ ابوالفدا، ج ۱ ص ۱۴۷

[4] ابوعبداللہ محمد بن عمر واقدی (متوفی ۸۲۲ء)، کتاب المغازی للواقدی مطبوعہ کلکتہ ۱۸۵۵ء، ج ۱ ص ۳۹۱

[5] علامہ طبرسی (متوفی ۵۳۲ء)، اعلام الوریٰ۔ ابن ہشام (متوفی ۸۳۳ء) سیرت ابن ہشام، ج ۲ ص ۱۸۷ حسین بن محمد دیار بکری (متوفی ۸۹۲ ہجری ۱۵۷۴ء)، تاریخ خمیس، ج ۲ ص ۴۹

وقاص نے پکار کر کہا، ''اے ابوالحسن علیہ السلام! ٹھہریے کہ اور لوگ پہنچ جائیں۔'' ایک جگہ جابرؓ کا بیان یوں ہے کہ لوگ کہہ رہے تھے، ''یا علی علیہ السلام! رحم کیجیے، یعنی اتنی جلدی نہ کیجیے۔''[1]

شجاعت علی ابن ابی طالب علیہ السلام پر تورات کی گواہی

حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام جنھیں اَسدُاللہ (اللہ کا شیر) اور یَدُاللہ (اللہ کا ہاتھ) بھی کہا جاتا ہے، علم ہاتھ میں لیے قلعہ قموص کی جانب بڑھے۔ آپ قلعے کے نیچے پہنچے تو ایک چٹان پر علم گاڑ دیا۔ ایک یہودی عالم نے جو قلعے کے اُوپر کھڑا تھا پوچھا، ''اے صاحبِ علم! تُو کون ہے؟'' فرمایا، ''میں علی ابن ابی طالب ہوں۔'' اس پر وہ یہودی عالم اپنی قوم سے کہنے لگا، ''قسم ہے تورات کی! تم اِس شخص سے مغلوب ہو گئے۔ یہ فتح حاصل کیے بغیر نہ لوٹے گا۔'' وہ یہودی عالم حضرت علی المرتضیٰ علیہ السلام کی شجاعت کو توریت کے حوالے سے جانتا تھا کیونکہ توریت میں وہ آپ کے اوصاف پڑھ چکا تھا۔[2]

شیرِ خدا علی المرتضیٰ علیہ السلام کی جنگ

اپنے عالم دین کی تنبیہ پر یہودیوں نے شاید توجہ نہیں دی تھی یا اُنھیں اپنی طاقت کا زعم تھا کہ شیرِ خدا علی علیہ السلام قلعے کے نیچے پہنچے تو قلعے کے سردار مرحب کا بھائی حارث جو اُس کا دستِ راست اور نائب بھی تھا، علی علیہ السلام کے مقابل آ گیا۔ بروایتے اُس کا نیزہ تین من کا تھا اور وہ اس معرکے میں کئی مسلمانوں کو شہید کر چکا تھا۔ وہ علی علیہ السلام کے مقابل آیا تو آپ نے ایک ہی وار سے اُسے جہنم واصل کر دیا۔ اُس کے بعد ''عنتر'' اور پھر کچھ اور بہادروں نے یکے بعد دیگرے علی علیہ السلام سے مقابلہ کیا لیکن سبھی ذوالفقارِ علی علیہ السلام کا شکار ہو گئے۔[3]

---

[1] علامہ علی نقی نقوی، تاریخ اسلام، ص ۳۸۱ بحوالہ سیرت ابن ہشام، ج ۲ ص ۱۸۴ و تاریخ خمیس، ج ۲ ص ۴۹

[2] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۲۹۸

[3] علامہ علی نقی نقوی، تاریخ اسلام، ص ۳۸۱

اپنے بھائی کے مارے جانے کے بعد مرحب بہادروں کی ایک جماعت کے ساتھ انتقام لینے باہر نکلا۔ وہ بہت بلند قامت اور جنگجو شخص تھا، خیبر کے بہادروں میں اُس کا کوئی ثانی نہیں تھا اور اُس کی بہادری کا ڈنکا تمام خیبر میں بجتا تھا۔ اُس روز وہ دو دو زِرّہیں پہن کر اور دو دو تلواریں حمائل کر کے میدان میں نکلا تھا۔ اُس نے دو عمامے باندھے ہوئے تھے جن کے اُوپر خود بھی پہن رکھا تھا، وہ یہ رَجَز پڑھتا ہُوا میدان میں نکلا:

قَدْ عَلِمَتْ خَیْبَرُ اَنِّیْ مَرْحَبُ　　شَاکِی السَّلَاحِ بَطَلٌ مُحَرَّبُ

(سارا خیبر جانتا ہے کہ میں مرحب ہوں، مسلح، دلاور جنگ آزمودہ)

علی ابن ابی طالب علیہ السلام یہ رَجَز پڑھتے ہوئے آگے بڑھے:

اَنَا الَّذِیْ سَمَّتْنِیْ اُمِّیْ حَیْدَرَۃ　　ضِرْغَامُ آجَامٍ وَلَیْثُ قَسْوَرَۃ

(میری ماں نے میرا نام حیدر رکھا ہے، میں ضِرغام ہوں، آجام ہوں اور حملہ آور لیث ہوں)

ضرغام، آجام اور لیث، یہ تینوں شیر کے مترادف المعانی الفاظ ہیں۔[1]

مرحب نے حضرت علی علیہ السلام کے سرِ اقدس پر تلوار کا وار کرنا چاہا لیکن اس سے پہلے ذوالفقارِ حیدری بجلی کی طرح کوندی۔ مرحب نے ذوالفقار کو اپنی ڈھال پر روکا تو وہ اُسے کاٹتی ہوئی اُس کے خود پر گری اور پھر خود کو، دو عماموں کو اور سر کو کاٹتی ہوئی اُس کے دانتوں تک پہنچ گئی۔[2]

بروایتے علی علیہ السلام کی تلوار اُس غدار کا خود کاٹتی ہوئی، سر کو چیرتی ہوئی حلق تک جا پہنچی اور بقولے حلق سے بھی نیچے اُس کی رانوں تک چلی گئی تھی۔ ایک روایت ہے کہ ذوالفقارِ حیدری اُس کی زین تک جا پہنچی۔[3]

---

[1] شیخ عبد الحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۲۹۸

[2] حسین بن محمد دیار بکری (متوفی ۱۵۷۴ء)، تاریخ خمیس، ج ۲ ص ۵۰۔ تاریخ طبری، ج ۲ حصہ اوّل ص ۲۷۶

[3] شیخ عبد الحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۲۹۸

پس ''مسلح، دلاور جنگ آزمودہ'' مرحب کے دوٹکڑے ہو گئے۔ ''تاریخ طبری'' میں ہے کہ ضربِ حیدری کی گونج اتنی تھی کہ اہلِ لشکر نے بھی سنی۔ [1]

''مدارج النبوّت''میں شیخ عبدالحق محدث دہلوی لکھتے ہیں،''اس کے بعد اہلِ اسلام، حضرت امیر علیہ السلام کی مدد کے ساتھ میدان میں اُترے اور یہودیوں کو قتل کرنا شروع کیا۔ یہود کے شجاعوں میں سے سات کو آپ نے جہنم رسید کر دیا باقی ہزیمت اُٹھا کر قلعے میں داخل ہو گئے۔ حضرت علی المرتضیٰ علیہ السلام بھی قلعے کی طرف بڑھتے چلے گئے ایسے میں ایک یہودی راہ میں حائل ہُوا اور آپ کے دستِ اقدس پر وار کیا تو آپ کی ڈھال زمین پر گر پڑی۔ دوسرا یہودی اس ڈھال کو اُٹھا کر بھاگ کھڑا ہُوا۔ جناب امیر علیہ السلام کو جوش آیا اور قُوتِ ربّانی کی طرف سے ایسی روحانی قُوت وارد ہوئی کہ آپ خندق کو پھاند کر قلعے کے دروازے پر جا پہنچے۔ آپ نے اُس آہنی دروازے کا ایک پٹ اُکھاڑا اور اُسے ڈھال بنا کر جنگ میں مشغول ہو گئے۔'' شیخ عبدالحق محدث دہلوی آگے لکھتے ہیں،''سیّدنا امام باقر سَلامُ اللهِ عَلَیهِ وَعلیٰ آباءِ العظامِ وَاَوْلادِہِ الکرامِ سے منقول ہے کہ جب علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہٗ علیہ السلام نے درِ خیبر کو اُکھاڑنے کے لیے جھنجوڑا تو سارا قلعہ کانپنے لگا، حضرت صفیہؓ بنت حیی بن اخطب تخت سے گر پڑیں اور اُن کا چہرہ زخمی ہو گیا۔ غالباً حضرت صفیہؓ میں یہ جنبش سرایت کرنے میں حکمت وعلامت اور خاص مناسبت ہو جس کی بنا پر وہ اسیر ہوئیں اور آخر میں سیّد عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے عقد میں آئیں تا کہ وہ متنبہ ہو جائیں اور اُن میں اس دولت وسعادت کے قبول کرنے کی صلاحیت واستعداد پیدا ہو جائے۔ اربابِ سیر بیان کرتے ہیں کہ جنگ سے فارغ ہونے کے بعد جناب امیر علیہ السلام نے اُس دروازے کو پسِ پُشت پھینک دیا۔ بقولے بعد میں سات قوی وتنومند آدمیوں نے مل کر اس در کو ایک پہلو سے دوسرے پہلو پر پلٹنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہے پھر چالیس آدمیوں نے مل کر چاہا کہ اُسے اُٹھالیں مگر عاجز رہ گئے۔ رَوضۃُ الاحباب، معارجُ النبوۃ اور سیر کی دیگر کتابوں

---

[1] علامہ علی نقی نقوی، تاریخ اسلام، ص ۳۸۲ بحوالہ تاریخ طبری، مطبع حسینیہ، مصر، ج ۳ ص ۹۳

میں ایسا ہی منقول ہے۔ ''معارجُ النبوۃ'' میں منقول ہے کہ اُس کا وزن آٹھ سو من تھا۔ ''المواھبُ اللدُنیۃ'' میں مروی ہے کہ حضرت علی المرتضیٰ علیہ السلام نے جس بابِ خیبر کو اُکھاڑا تھا اُسے ستر آدمی انتہائی مشقت اور کوشش کے باوجود ہلا تک نہ سکے، ابن اسحٰق کی روایت میں سات آدمی مذکور ہیں۔ حاکم اور بیہقی لیث بن ابی سلیم سے اور وہ حضرت ابو جعفر محمد علیہ السلام بن علی علیہ السلام بن حسین علیہ السلام سے اور وہ جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت علی المرتضیٰ علیہ السلام نے جس درِ خیبر کو اُکھاڑ کر اُٹھالیا تھا اُسے بعد میں چالیس آدمی بھی نہ اُٹھا سکے۔ جب قموص اور خیبر کے تمام قلعے والوں نے حضرت امیر علیہ السلام کی اس قوت وقدرت کا مشاہدہ کیا تو وہ سب فریاد کرنے لگے، ''اَلامان اَلامان۔'' اس کے بعد حضرت علی علیہ السلام نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اشارے سے اُن کو اس شرط پر امان دے دی کہ ہر آدمی اُونٹ پر خوراک لاد کر ان شہروں سے نکل جائے اور نقد اور تمام ساز وسامان اور اسلحہ مسلمانوں کے لیے چھوڑ دے۔ حضرت علی علیہ السلام اس مہم کو سر کرنے کے بعد بارگاہِ رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں حاضر ہوئے تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خیمے سے باہر تشریف لا کر آپ کا استقبال فرمایا پھر آغوشِ اقدس میں لیا اور دونوں آنکھوں کے درمیان بوسہ دے کر فرمایا، ''بَلَغَنِیْ ثَنَاءُكَ الْمَشْكُوْرُ وَ صَنِيْعُكَ الْمَذْكُوْرُ قَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ وَرَضِيْتُ اَنَا عَنْكَ'' (تمھاری مشکورانہ تعریفیں مجھ تک پہنچیں اور تمھاری بہادری کے واقعات بیان ہوئے، بے شک اللہ ان سے راضی ہُوا اور میں بھی تم سے راضی ہُوا) اس پر جناب امیر علیہ السلام آبدیدہ ہوگئے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، ''علی! یہ رونا خوشی کا ہے یا غم کا؟'' عرض کیا، ''یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! یہ آنسو خوشی کے ہیں اور میں اس پر کیوں نہ خوش ہوؤں کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مجھ سے راضی ہیں۔'' حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا، ''علی! میں اکیلا ہی تم سے راضی نہیں بلکہ اللہ اور جبرائیل اور میکائیل اور تمام فرشتے بھی تم سے راضی ہیں۔''[1]

---

[1] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۲۹۸ تا ۳۰۰ بحوالہ روضۃ الاحباب، المواہب اللدنیہ، معارج النبوۃ وغیرہ

بروایتے اس کے بعد دوسری جانب کے باقی تین قلعوں الکتیبہ، الوطیع اور السّلالم کا محاصرہ کیا گیا۔ چودہ دن کے بعد یہودیوں نے ہتھیار ڈال دیے اور خیبر کا سارا علاقہ فتح ہو گیا۔[۱]

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا خیبر کے یہودیوں پر کرم

قلعہ قموص سے سو (۱۰۰) زِرّہیں، چار سو (۴۰۰) تلواریں، ہزار (۱۰۰۰) نیزے، پانچ سو (۵۰۰) کمانیں اور بے شمار ساز و سامان اور دولت مالِ غنیمت میں حاصل ہُوا جس میں سے پانچواں حصّہ (خمس) نکال کر باقی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے مسلمانوں میں تقسیم کر دیا۔ منقول ہے کہ یہود کی غداری کے باوجود نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اُن کی جاں بخشی کر کے اُن پر احسان فرمایا اور خیبر سے نکل جانے کا حکم دیا، اس پر اُنھوں نے عرض کیا کہ ہمیں ان کھیتوں اور باغوں میں اُجرت پر رکھ لیا جائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے مہربانی کرتے ہوئے اُن کی گذارش کو قبول فرمایا اور پیداوار کا نصف حصّہ اُن کی اُجرت مقرر فرما کر اُنھیں رکھ لیا۔ اس معاملے کو مؤرّخین نے ''مخابرہ''، یعنی خیبر والوں کا معاملہ لکھا ہے۔[۲]

حضرت صفیہؓ

صفیہ بنت حیی بن اخطب، خیبر کے سردار کنانہ بن ابی الحقیق کی زوجیت میں تھیں جو اس معرکے میں مارا گیا تھا۔[۳] جنگ کے اختتام پر حضرت علی علیہ السلام نے حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ انھیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خدمت میں لے جاؤ، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ان کے ساتھ جو مناسب سمجھیں گے وہ سلوک کریں گے۔ اس سے حضرت علی علیہ السلام کی رواداری اور اعلیٰ ظرفی کا علم ہوتا ہے جو آپ نے اس پہلو کو بھی پیش نظر رکھا کہ کسی قوم کے سردار کی خواتین کے ساتھ عام

---

[۱] بخاری، کتاب الفضائل، باب غزوہ خیبر

[۲] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۳۰۱

[۳] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۳۰۴

قیدیوں کا سا برتاؤ نہیں کیا جاتا بلکہ اُن کے ساتھ اُن کے شایانِ شان سلوک روا رکھا جاتا ہے۔

حضرت بلال رضی اللہ عنہ حضرت صفیہ کو اُس طرف سے لے کر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے جس طرف مقتولین کے لاشے پڑے ہوئے تھے۔ لاشے دیکھ کر اُن کی حالت غیر ہوگئی۔ شاید حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے اس پر غور نہیں کیا ہوگا کہ ایک صنفِ نازک کے لیے اپنے عزیز مقتولین کی لاشوں کو دیکھنا کتنا کرب ناک ہوسکتا ہے چنانچہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جب یہ معلوم ہُوا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت بلال رضی اللہ عنہ پر سخت ناراض ہوئے اور فرمایا، ''بلال! کیا تمھارے دل سے رحم بالکل جاتا رہا تھا؟'' آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت صفیہؓ کو آزاد فرمادیا اور پھر (اُن کو سہارا دینے کے لیے) اُن سے نکاح کیا۔ [1] اس سے بالکل واضح ہے کہ نبی گرامی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُن کے ساتھ شاہانہ سلوک کیا یعنی یہ نہیں ہُوا کہ کنیز کی صورت سے بحق ملکیت اُن میں تصرف کیا گیا ہو بلکہ ایک آزاد عورت کی طرح عدت کے بعد [2] اُن کا عقد ہُوا جس پر طرفین کا ایجاب وقبول یعنی رضامندی ایک لازمی جزو ہے۔

مرحب کا قتل حضرت علی علیہ السلام کی بجائے محمد بن مسلمہ کے کھاتے میں

کتاب ہٰذا کی تالیف کے دوران میں، میں نے یہ بات خصوصی طور پر پیشِ نظر رکھی ہے کہ اس میں متنازعہ معاملات (متنازعہ معاملات سے میری مراد یہ ہے کہ جن پر اسلام کے مختلف مکاتب فکر میں ایسا اختلافِ رائے پایا جاتا ہو کہ جس کو بیان کرنے سے کسی کی دل آزاری ہو) کو زیرِ بحث نہ لایا جائے۔ لیکن اب ایسی مشہور ومعروف اور غیر متنازعہ روایات کا کیا کیا جائے

---

[1] علامہ طبرسی (متوفی ۵۴۳ ھ)، اعلام الوریٰ

[2] ابوبکر بن ابی شیبہ، عفان، حماد بن سلمہ، ثابت، حضرت انس (رضی اللہ عنہم) سے روایت ہے کہ..... (خیبر میں) حضرت دحیہ کے حصّے میں ایک خوبصورت باندی آئی پھر رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اُن سے اُس کو سات باندیوں کے بدلے میں خرید لیا پھر اُسے اُمّ سلیمؓ کی طرف بھیجا کہ وہ اُسے بنا سنوار کر تیار کردیں اور راوی کہتے ہیں کہ میرا گمان ہے آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے یہ اس لیے فرمایا تاکہ اُن ہی کے گھر میں وہ اپنی عدت پوری کرلیں اور یہ باندی صفیہ بنت حیی (رضی اللہ عنہا) تھیں۔ صحیح مسلم جلد دوم، حدیث نمبر ۱۰۰۷

جنھیں محض بغضِ علی علیہ السلام کی بنا پر مسخ کر دیا گیا ہو؟ ایسی ہی ایک جعلی روایت جسے عصرِ حاضر کے بعض ''مصنفین اور مُقررین'' بڑھ چڑھ کر بیان کررہے ہیں یہ ہے کہ جنگِ خیبر میں مرحب کو حضرت علی علیہ السلام نے نہیں بلکہ محمد بن مسلمہ نے قتل کیا تھا۔ بعض لوگوں نے اس روایت میں اورطرح سے ڈنڈی ماردی ہے۔ اُن کے مطابق مرحب کے قتل کا سارا سامان تو محمد بن مسلمہ نے کر دیا تھا جب کہ علی علیہ السلام نے تو آخر میں آ کر مرتے ہوئے کو مارا۔ اسلامیہ یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر ڈاکٹر نصیر احمد ناصر نے بھی نہایت اختصار کے ساتھ حقیقت بیان کرنے کے بعد ایسے ہی کسی ڈنڈی مار مؤرّخ یا مصنف کی روایت نقل کر دی ہے۔ وہ لکھتے ہیں، ''اب قلعہ قیموس کی باری تھی، لیکن اُسے سرکرنا دُشوار ہو گیا اور محاصرہ طول پکڑ گیا۔ آخر کار آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی کو علم عطا فرمایا۔ وہ میدانِ جنگ میں نکلے تو اُن کے مقابلے کے لیے مرحب آیا جو قوّت و دلیری میں سارے عرب میں مشہور تھا لیکن حضرت علی نے اُسے قتل کر دیا اور ایک روایت میں ہے کہ مرحب نے چونکہ محمد بن مسلمہؓ کے بھائی کو پتھر گرا کر شہید کر دیا تھا لہٰذا اُنھوں نے بدلہ لینے کی خاطر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے لڑنے کی اجازت لی اور اس کی پنڈلیاں کاٹ ڈالیں اور اُسے تڑپتا چھوڑ دیا۔ بعدازاں حضرت علی نے اُسے قتل کر دیا۔''[1]

ڈاکٹر نصیر احمد ناصر اپنی کتاب میں اس سے اُوپر والے پیرائے میں قلعہ النّاعم کی فتح کا ذِکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں، ''اس قلعے کے محاصرے کے دوران میں حضرت محمود بن مسلمہؓ شہید ہوئے تھے۔ کنانہ ابن ابی الحقیق یا مرحب نے اُنھیں قلعے کے نیچے سوتے دیکھ کر اُوپر سے پتھر گرا کر شہید کر دیا۔''[2] ایک ''سوئے ہوئے'' شخص کو اُوپر سے پتھر گرا کر مار دینا ایک بزدلانہ اور گھٹیا سی حرکت ہے ایسی حرکت کسی بہادر کو زیب نہیں دیتی۔ مرحب اگرچہ یہودی تھا اور مقابلے میں مارا گیا لیکن وہ بزدل ہرگز نہیں تھا۔ وہ بزدل ہوتا تو علی علیہ السلام جیسے ناقابلِ تسخیر مجاہد کے مقابلے پر نہ آتا اور آکر اپنی زبان سے یہ نہ کہتا:

---

[1] ڈاکٹر نصیر احمد ناصر، کتاب: پیغمبر اعظم و آخر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، ص ۶۰۲

[2] ڈاکٹر نصیر احمد ناصر، کتاب: پیغمبر اعظم و آخر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، ص ۶۰۲

''قَدْ عَلِمَتْ خَیْبَرُ اِنِّیْ مَرْحَبٌ○ شَاکِی السِّلاَحِ بَطَلٌ مُجَرَّبٌ○''

(سارا خیبر جانتا ہے کہ میں مرحب ہوں، جنگوں کا مسلح ہیرو)

مرحب واقعی پورے خیبر میں بہادر مشہور تھا پس مرحب کو اگر وار کرنا ہوتا تو قلعے سے باہر نکل کر محمود بن مسلمہ کو للکارتا اور لڑ کر شہید کرتا نہ کہ قلعے کے اُوپر سے پتھر گرا کر۔ پس محمود بن مسلمہ کو اُس نے نہیں بلکہ کنانہ ابن ابی الحقیق نے شہید کیا جیسا کہ مندرجہ بالا سطور میں ڈاکٹر نصیر احمد ناصر خود لکھ چکے ہیں کہ اُنھیں کنانہ ابن ابی الحقیق یا مرحب نے اُوپر سے پتھر گرا کر شہید کیا۔

دوسری دلیل یہ ہے کہ اگر واقعی مرحب نے محمد بن مسلمہ کے بھائی محمود بن مسلمہ کو شہید کیا تھا اور محمد بن مسلمہ بھائی کا انتقام لینے مرحب کے مقابل گئے تھے اور اُس سے لڑ کر اُس کی پنڈلیاں کاٹ ڈالیں تھیں تو پھر اُسے قتل کیوں نہ کیا؟ جب کہ مرحب ہی قلعہ قموص کا طاقتور ترین پہلوان تھا اور اس معرکے کی تفصیل سے معلوم ہوتا ہے کہ خیبر کی شکست اور فتح کا انحصار ہی اُس پر تھا پس اگر یہ جنگ محمد بن مسلمہ ہی نے جیتنا تھی تو پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے علی علیہ السلام جیسے کرار اور غیر فرار کا انتظار اور اہتمام محض ایک ادھ موئے اور لاچار آدمی کو مارنے کے لیے کیا؟

تیسری دلیل یہ ہے کہ تاریخ شاہد ہے کہ علی علیہ السلام کسی بھاگتے ہوئے یا لاچار آدمی کو قتل نہیں کرتے تھے۔ یہ تو ہے ہی شانِ علی علیہ السلام کے منافی۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ تڑپتے ہوئے مرحب کو جس کی پنڈلیاں کٹی ہوئی ہوں علی علیہ السلام نے قتل کیا ہو؟

اور چوتھی دلیل یہ ہے کہ کیا علی علیہ السلام کی ''اس'' دلیری پر اللہ، رسول اللہ اور ملائکہ راضی ہو رہے تھے؟ اور کثیر مؤرخین و مؤلفین علی علیہ السلام کے قصیدے لکھ رہے تھے؟ کیا کسی اَدھ موئے شخص کو مارنا کوئی فضیلت کی بات ہے؟

اہلِ سنت کے مشہور سیرت نگار شیخ عبدالحق محدث دہلوی اپنی معروف کتاب مدارج النبوّت میں خیبر فتح ہو جانے کے بعد کے حالات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں، ''حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے کنانہ بن ابی حقیق کو جو خیبر کے رئیسوں میں سے تھا محمد بن مسلمہ کے سپرد کر دیا تا کہ وہ اُسے اپنے بھائی محمود کے عوض قتل کر دیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے امیر المومنین علی المرتضیٰ علیہ السلام کو جنگِ

قموص کی جانب بھیجتے وقت محمد بن مسلمہ سے فرمایا تھا کہ تمھیں بشارت ہو کہ کل تم اپنے بھائی کے قاتل کو قتل کرو گے۔"[1] پس عبدالحق محدث دہلوی نے بات بالکل واضح کر دی۔ محمد بن مسلمہ کا مرحب سے انتقام لینا اور پنڈلیاں کاٹنا اور علی علیہ السلام کا بعد میں مرے ہوئے کو مارنا سب من گھڑت ہے اور اس من گھڑت کہانی کے خالق وہی ہو سکتے ہیں جنھیں امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام کی ہر فضیلت کھٹکتی ہے۔

یہود کی سازش

غزوۂ خیبر کے واقعات میں یہودیوں کی ایک ناپاک سازش کا ذِکر بھی کیا جاتا ہے۔
روایت ہے کہ مرحب کی بھتیجی اور سلام بن مشکم کی بیوی زینب بنت حارث نے بکری کے گوشت میں سریع الاثر زہر ملایا اور وہ زہریلا کھانا تیار کر کے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا اور تناول فرمانے کی درخواست کی۔ اُس وقت صحابہؓ کی ایک جماعت بھی بارگاہِ رسالت میں موجود تھی جن میں حضرت بشیر بن براءؓ بھی تھے۔ اُس کھانے میں سے ران کا ایک ٹکڑا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لے کر دانتوں سے کاٹا، بشیر بن براء نے بھی کچھ حصّہ لے لیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کھانا چکھتے ہی حضرت بشیر بن براءؓ سے فرمایا۔ "اسے تھوک دو یہ ران کہتی ہے کہ اس میں زہر ملایا گیا ہے۔" بشیر بن براءؓ اپنی جگہ سے اُٹھنے بھی نہ پائے تھے کہ اُن کا رنگ سبز و سیاہ ہو گیا اور وہ اُسی وقت شہید ہو گئے۔ ایک روایت ہے کہ وہ ایک سال بیمار رہنے کے بعد فوت ہوئے۔
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم پر یہود کے تمام سرداروں اور زینب بنت حارث یہودیہ کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے رُوبرُو پیش کیا گیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُن سے کچھ بات چیت کرنے کے بعد دریافت فرمایا کہ کیا تم کھانے میں زہر ملا کر لائے تھے؟ اُنھوں نے اقرار کر لیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پوچھا کہ تم نے ایسا کیوں کیا؟ کہنے لگے ہمارا مقصد یہ تھا کہ اگر آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) جھوٹے نبی (معاذ اللہ) ہوئے تو اس طرح ہم آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے نجات پا لیں گے اور اگر سچے نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)

---

[1] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۳۰۰

ہوئے تو پھر آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ بقولے، آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے یہ سوالات اُس یہودیہ سے کیے تھے۔ مؤرّخین کا اس میں اختلاف ہے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اُس عورت کو سزا دی یا چھوڑ دیا تھا۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اُسے چھوڑ دیا تھا لیکن بعض روایتوں میں آیا ہے کہ اُسے قتل کروا دیا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جب اُس عورت پر ظاہر ہوگیا ہے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) برحق نبی ہیں تو وہ اسلام لے آئی تھی۔ بروایتے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ میں اُس گوشت کی اذیت کو ہمیشہ اپنے اندر محسوس کرتا ہوں جسے خیبر میں کھایا تھا۔[1]

آفتابِ امامت کے لیے آفتابِ فلک کی واپسی

غزوۂ خیبر تاریخ میں جناب امیرالمومنین علیہ السلام کے حوالے سے ہی جانا جاتا ہے۔ جناب علی ابن ابی طالب علیہ السلام کا آشوبِ چشم میں مبتلا ہوکر مدینہ میں ہی رُک جانا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیچھے پیچھے اس حال میں خیبر پہنچنا کہ آپ کو پاؤں رکھنے کی جگہ بھی آشوبِ چشم کی وجہ سے دکھائی نہیں دیتی تھی، بارگاہِ رسالت میں پہنچنا اور آغوشِ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں لیٹ کر آنکھوں میں لعابِ دہنِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ڈلوا کر شفایاب ہوجانا، دستِ نبی اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے تاریخی علم کا عطا ہونا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہی مبارک ہاتھوں سے جنگ کے لیے آراستہ ہونا، مرحب جیسے دلاور کو دولخت کردینا، بابِ خیبر کو اُکھاڑ کر سپر بنالینا، ناقابلِ تسخیر سمجھے جانے والے قلعہ خیبر کی اینٹ سے اینٹ بجادینا اور ملائکہ سے دادو تحسین وصول کرنا وغیرہ وغیرہ۔

اُسی خیبر کی سرزمین پر ایک اور واقعہ بھی رونما ہُوا جسے مختصاتِ جناب علی علیہ السلام کی نسبت سے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا اور وہ ہے علی علیہ السلام کے لیے سورج کا واپس پلٹ کر آنا۔ روایت ہے، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خیبر سے واپسی پر منزل صہبا پر پہنچے تو نمازِ عصر ادا فرمائی اور نماز پڑھنے کے بعد سرِ مبارک امیرالمومنین علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے زانو پر رکھ کر سو گئے یہاں تک

---

[1] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۳۰۷

کہ وحی کے آثار نمودار ہوئے۔ علی علیہ السلام نے نمازِ عصر ابھی ادا نہیں کی تھی اور نزولِ وحی کا دورانیہ اتنا طویل ہو گیا تھا کہ آفتاب غروب ہو گیا۔ جب وحی کی کیفیت ختم ہوئی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے حضرت علی علیہ السلام سے پوچھا، ''کیا عصر کی نماز پڑھ لی تھی''؟ عرض کیا، نہیں! یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم، میں نہیں پڑھ سکا۔'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے بارگاہِ الٰہی میں دُعا فرمائی، ''یا رب! اگر علی (علیہ السلام) تیری اور تیرے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کی اطاعت میں تھے تو آفتاب کو حکم دے کہ وہ لوٹ آئے تا کہ یہ نمازِ عصر ادا کر لیں۔'' خداوند تعالیٰ نے اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی دُعا قبول فرمائی اور سورج جو کہ غروب ہو چکا تھا پلٹ آیا یہاں تک کہ اُس کی شعاعیں پہاڑوں اور ٹیلوں پر پڑنے لگیں اور مخلوقِ خدا نے آنکھوں سے دیکھا۔ پس حضرت علی المرتضیٰ علیہ السلام نے وضو کیا اور نمازِ عصر ادا فرمائی۔ [۱]

فدک

فدک حجاز کی ایک بستی ہے جو اُس زمانے میں مدینہ منوّرہ سے دو یا تین دن کی مسافت پر واقع تھی۔ خیبر کی فتح کے بعد ارد گرد کے یہودیوں پر اسلام اور پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی شان و شوکت کا بہت گہرا اثر ہُوا تھا یہی وجہ تھی کہ فدک کے یہودیوں نے بغیر کسی لڑائی کے اپنی املاک حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے سپرد کر کے مصالحت کر لی۔ [۲]

ابن شہاب زہری کی روایت کے مطابق یہ املاک مندرجہ ذیل سات قطعوں پر مشتمل تھیں:

۱)اعوف، ۲)برقہ، ۳)صافیہ، ۴)مسیب، ۵)حسنیٰ، ۶)مشربہ اُمّ ابراہیم اور ۷)دلال [۳]

فروعِ کافی میں امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی روایت میں ان کے نام مندرجہ ذیل ہیں:

۱)عفاف، ۲)برقہ، ۳)صافیہ، ۴)معبیت، ۵)حسنیٰ، ۶)مالام ابراہیم اور ۷)دلال [۴]

---

[۱] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۳۰۸

[۲] علامہ علی نقی نقوی، تاریخ اسلام، ص ۳۸۹۔ معجم البلدان، مصر، ج ۲ ص ۳۴۲

[۳] علامہ علی نقی نقوی، تاریخ اسلام، ص ۳۹۰ بحوالہ ابن شہاب زہری

[۴] فروع کافی، مطبوعہ ایران ۱۳۱۵ھ، ص ۲۴۷، کتاب الوصایا باب صدقات النبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

ان قطعات میں بہت سارے نخلستان تھے۔ ۷ ہجری تک یہ املاک کفّارِ خیبر اور دیگر یہود کی ملکیت میں تھیں لیکن جنگِ خیبر کے بعد یہ تمام حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو چند مصالحتی شرائط پر تفویض ہو گئیں۔ اُن پر کوئی جنگ نہیں ہوئی تھی اس لیے یہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خاص ملکیت تھیں جن کی پیداوار آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اپنی ضروریات پر صَرف کرتے اور اُس میں سے محتاجوں کی اعانت بھی فرماتے۔ زہری سے روایت ہے کہ خیبر کے بچے ہوئے لوگوں نے جو کہ قلعہ بند ہو گئے تھے، رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے جان کی امان چاہی اور شہر چھوڑنے کا وعدہ کیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اُن کی درخواست منظور کر لی۔ فدک والوں کو معلوم ہُوا تو اُنھوں نے بھی یہی درخواست پیش کی جسے حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے قبول کر لیا اس لیے فدک سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی خاص ملکیت قرار پایا کیونکہ اُس پر کوئی فوج کشی نہیں ہوئی تھی۔ [۱]

اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور کے سابق وائس چانسلر ڈاکٹر نصیر احمد ناصر اپنی تالیف پیغمبر اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم میں لکھتے ہیں کہ اہلِ فدک نے جب خیبر کے یہود کا حال سُنا تو اُنھوں نے بھی ویسی ہی شرائط پر صلح کر لی۔ چونکہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم مملکتِ اسلامیہ کے سربراہ بھی تھے اور اس حیثیت سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو مصارف بھی برداشت کرنا پڑتے تھے اس لیے فدک کی آمدن آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے لیے مخصوص کر دی گئی۔'' [۲]

علامہ طوسی فرماتے ہیں، ''جب حضرت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم خیبر کی مہم سے فارغ ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ایک علم مرتب فرمایا اور کہا کہ کون اسے اپنے استحقاق کی بنا پر ہاتھ میں لے گا؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا مقصد یہ تھا کہ اُس (شخص) کو فدک کی طرف روانہ فرمائیں تو بعض لوگ علم لینے کے لیے کھڑے ہو گئے مگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا تم ہٹ جاؤ۔ پھر سعد کھڑے ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اُنھیں بھی ہٹا دیا اور خود علی علیہ السلام سے فرمایا کہ علی! تم کھڑے ہو جاؤ اور اس علم کو لو چنانچہ

---

[۱] علامہ علی نقی نقوی، تاریخ اسلام، ص ۳۹۰ بحوالہ شرح ابن ابی الحدید طبع مصر، ج ۴ ص ۷۸

[۲] ڈاکٹر نصیر احمد ناصر، کتاب: پیغمبر اعظم و آخر (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم)، ص ۶۰۳

اُنھوں نے علم لیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے علی علیہ السلام کو فدک کی طرف روانہ فرمادیا تو اُنھوں نے اُن سب سے اس شرط پر صلح کی کہ (اُن کی املاک کے بدلے) اُنھیں جان کی امان دی جائے گی۔ اس طرح فدک کے علاقوں کی جائداد خاص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ہوئی۔ اُس وقت جبرائیل (علیہ السلام) نازل ہوئے اور کہا کہ خداوند عالم کا حکم ہے ''وَاٰتِ ذَاالْقُرْبٰی حَقَّہٗ'' یعنی آپ (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) ذی القربیٰ کو اُن کا حق دے دیجیے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے کہا اے جبرائیل! یہ ذی القربیٰ کون ہیں؟ اور اُن کا حق کیا ہے؟ جبرائیل علیہ السلام نے کہا، '' ذی القربیٰ فاطمہ (علیہا السلام) ہیں، آپ (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) اُنھیں اُن کے حق میں یہ فدک کے احاطے اور جو کچھ ان میں ہے سب دے دیں (کیونکہ ان پر) اللہ اور اُس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کا حق ہے۔ چنانچہ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے جناب فاطمہ علیہا السلام کو بلایا اور ایک تحریر لکھ دی۔''[1] ہمارا ایمان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم جانتے تھے کہ یہاں ذی القربیٰ سے کیا مراد ہے مگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے جبرائیلؑ سے یہ سوال محض اس لیے کیا کہ دوسروں کو بھی معلوم ہو جائے اور اُن پر بھی حضرت فاطمہ علیہا السلام کا حق واضح ہو جائے۔

تاریخ طبری میں ہے، ''خیبر تمام مسلمانوں کی ملکیتِ عامہ ہُوا اور فدک محض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا خالصہ ہُوا کیونکہ اُس پر مسلمانوں نے فوج کشی نہیں کی تھی۔''[2] ''سیرت ابن ہشام'' میں ہے، ''خیبر مسلمانوں کے درمیان مشترک مالِ غنیمت کی حیثیت رکھتا تھا اور فدک خاص رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا تھا اس لیے کہ مسلمانوں نے سواروں اور پیادوں کی صورت میں اُس پر فوج کشی نہیں کی تھی۔''[3] ''سنن ابوداؤد'' میں حسین بن علی (علیہ السلام)، یحییٰ ابن آدم، ابن ابی زائدہ، محمد بن اسحاق، زہری، عبداللہ بن ابی بکر اور محمد بن مسلمہ کے بیٹوں سے روایت ہے کہ (جب

---

[1] علامہ علی نقی نقوی، تاریخ اسلام، ص ۳۹۲، ۳۹۳ بحوالہ اعلام الوریٰ، مطبوعہ طہران، طبع جدید، ص ۱۰۸ تا ۱۰۹

[2] ابوجعفر محمد بن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ھ)، تاریخ طبری ج ۲ حصہ اوّل ص ۲۷۷

[3] علامہ علی نقی نقوی، تاریخ اسلام ص ۳۹۱ بحوالہ السیرۃ النبویۃ، لابن ھشام القسم الثانی، الجز الثالث والرابع الطبعۃ الثانیۃ بصر ۱۳۷۸ھ، ۱۹۵۵ء ص ۳۳۷

خیبر کی جنگ ہوئی اور وہ فتح ہو گیا تو) خیبر کے کچھ قلعے فتح ہونے سے باقی رہ گئے تھے پس وہاں کے رہنے والے اپنے اپنے قلعوں میں بند ہو گئے اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے درخواست کی کہ وہ اُن کی جان بخش دیں تو وہ یہاں سے نکل جائیں گے اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اُن کی اُس پیشکش کو قبول فرمایا۔ فدک والوں نے جب یہ سنا تو وہ بھی اُس شرط پر نکل کھڑے ہوئے۔ پس یہ فدک رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے لیے خاص ہو گیا کیونکہ اس پر گھوڑے اور اُونٹ نہیں دوڑائے گئے تھے۔ (یعنی فدک بغیر جنگ کے حاصل ہُوا تھا اس لیے اُس کو مسلمانوں میں تقسیم نہیں کیا بلکہ وہ صرف رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے لیے خاص رہا۔[1] یہ حکم قرآن کریم کی اس نص پر مبنی ہے:[2]

''وَمَآ اَفَآءَ اللّٰہُ عَلٰی رَسُوْلِہٖ مِنْھُمْ فَمَآ اَوْجَفْتُمْ عَلَیْہِ مِنْ خَیْلٍ وَّلَا رِکَابٍ وَّلٰکِنَّ اللّٰہَ یُسَلِّطُ رُسُلَہٗ عَلٰی مَنْ یَّشَآءُ ط وَاللّٰہُ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ۝۶''

(اور اللہ نے اُن لوگوں سے جو مال بطورِ فیٔ اپنے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو دلوایا تو تم لوگوں نے اُس پر نہ گھوڑے دوڑائے اور نہ ہی اُونٹ پس اُس میں تمھارا کوئی حق نہیں لیکن اللہ اپنے رسولوں (علیہم السلام) کو جس پر چاہتا ہے تسلط دے دیتا ہے اور اللہ ہر چیز پر بڑی قدرت رکھتا ہے۔) تفسیر کبیر میں اس آیت مبارکہ کی تشریح یوں کی گئی ہے، ''خداوند عالم نے ''مالِ غنیمت'' اور ''فیٔ'' میں فرق بیان کیا ہے کہ ''مالِ غنیمت'' وہ ہے جس کے حاصل کرنے میں تم نے زحمت و مشقت برداشت کی ہے اور سواروں اور پیادوں کے ساتھ فوج کشی کی ہے برخلاف ''فیٔ'' کے، جس کے لیے تم نے کوئی زحمت نہیں اُٹھائی تو اُس میں اختیار کلیتہً رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کو ہے کہ جس طرح چاہیں اُسے صرف کریں۔''[3] چنانچہ جب یہ آیت مبارکہ نازل ہوئی:[4]

---

[1] سنن ابوداؤد، ج ۲، حدیث نمبر ۱۲۴۹

[2] سورۃ الحشر، آیت ۶

[3] تفسیر کبیر، ج ۸ ص ۱۲۵

[4] سورۃ الاسراء، آیت ۲۶

''وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا ۝۲۶''

(اور (دیکھو) قریبی رشتہ دار کو اُس کا حق دے دو اور مسکین و مسافر کو بھی اور (خبر دار) فضول خرچی نہ کرو۔) تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت سیّدۃُ نساء العالمین فاطمۃ الزہراء علیہا السلام کو بُلایا اور اِسی فدک کی ملکیت کی تحریر اُن کے لیے لکھ کر اُنھیں دی۔ اِس کا ذِکر اہلِ سُنت کی مشہور و مستند کتب میں بھی پایا جاتا ہے۔[1]

وادی القریٰ

مدینہ طیبہ اور اُس کے اطراف میں جہاں جہاں یہود تھے تقریباً سبھی مغلوب ہو چکے تھے سوائے وادی القریٰ کے۔ یہ وادی خیبر اور تیما کے درمیان واقع تھی۔ نبی اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اُنھیں جلا وطنی کا حکم دے سکتے تھے یا جنگ کر کے تہہ تیغ کر سکتے تھے مگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیشہ کی طرح بقائے باہمی کے اُصولوں پر چلتے ہوئے معاہدہ کرنے کو ترجیح دی۔ پس جناب رحمۃً لِلّعالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک جماعت کے ساتھ قریٰ کا رُخ کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اچانک اپنی وادی میں دیکھ کر یہود بوکھلا گئے، اُن میں سے بعض نے مسلمانوں پر تیر چلائے جن سے ایک مسلمان شہید بھی ہو گیا لیکن مہربان رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عفو و درگزر فرماتے ہوئے اُن سے امن کے معاہدے کی بات چیت کی تو وہ فوراً آمادہ ہو گئے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رعایا بن کے رہنے پر رضا مند ہو گئے۔[2]

مہاجرینِ حبشہ کی واپسی

مہاجرینِ حبشہ کا تفصیلی ذِکر ہم ہجرتِ حبشہ کے باب میں کر چکے ہیں۔ اُن میں سے کچھ لوگ تو وقتاً فوقتاً واپس آتے رہے تھے مگر حضرت جعفر طیار بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اور اُن کے کچھ ساتھی ابھی تک حبشہ ہی میں تھے۔ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُن کی واپسی کے لیے شاہِ حبشہ نجاشی

---

[1] جلال الدین سیوطی (متوفی ۹۱۱ ہجری)، الدر المنثور فی التفسیر بالمأثور، ج ۳ ص ۲۷۹

[2] بخاری: کتاب الفضائل، باب غزوۂ خیبر، ج ۵ ص ۱۶۹

کوعمر بن اُمیہ ضمری کے ہاتھ ایک خط روانہ فرمایا چنانچہ باقی ماندہ سولہ مہاجرین جن میں خواتین اور بچّے تھے، حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے ساتھ واپس آگئے۔[1] آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت جعفر بن ابوطالب رضی اللہ عنہ کو سینے سے لگایا، پیشانی پر بوسہ دیا اور فرمایا، میرے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ مجھے فتح خیبر کی زیادہ خوشی ہے یا جعفر کے آملنے کی۔[2]

پہلا ورُودِ مکّہ، عُمرۃ القضاء

(ذی القعدہ ۷ ہجری/ مارچ ۶۲۹ء)

صلح حدیبیہ کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جس عمرے کو معاہدے کے تحت مؤخر فرمایا تھا اُسے ماہِ ذی القعدہ ۷ ہجری میں ادا فرمایا۔[3] اس عمرے کو عمرۃُ الصُلح، عمرۃُ القضاء اور عمرۃُ القضیۃ بھی کہا جاتا ہے۔ قریش نے معاہدے کے مطابق تین دن کے لیے مکّہ خالی کر دیا اور رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُن مسلمانوں کے ساتھ جو گذشتہ سال حدیبیہ کے سفر میں بھی ساتھ تھے، خانہ کعبہ کا طواف کیا اور اعمالِ عمرہ انجام دیے۔ اُس موقع پر چشمِ فلک نے عجیب منظر دیکھا، ایک شہر کے تمام قدیم باسی اپنا شہر خالی چھوڑ کر اُس کی حدوں سے باہر جا رہے تھے اور عرصہ دراز تک جلاوطنی کی زندگی گزارنے والے کچھ لوگ اُس شہر میں داخل ہو کر اپنے آبائی گھروں کی طرف بڑھ رہے تھے۔ آنے والوں نے تین دن تک وہاں قیام کیا جب کہ شہر چھوڑ کر جانے والے اردگرد کے ٹیلوں اور پہاڑیوں پر چڑھ کر اُنھیں ایسی نظروں سے دیکھ رہے تھے جن میں مختلف قسم کے احساسات و جذبات یکجا تھے۔

تین دن کے بعد قریش کے سردار حضرت علی علیہ السلام کے پاس آئے اور کہا کہ محمد

---

[1] شیخ محمد الحضری، محاضرات تاریخ الامم الاسلامیہ طبع مصر، ج۱ص۱۹۲

[2] ابو الفدا (متوفی ۱۳۳۱ء)، تاریخ ابو الفدا، ج۱ص۱۲۸

مقاتل الطالبین، مطبوعہ عراق ۱۳۵۳ھ، ج۳ص۶

[3] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج۲ص۳۱۷

(صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے کہہ دیں کہ شرط کے مطابق تین دن گذر گئے ہیں اس لیے اب وہ مکّہ سے واپس چلے جائیں۔ حضرت علی علیہ السلام نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اُن کا پیغام دیا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اُسی وقت واپس روانہ ہو گئے۔[۱]

مکّہ پر قبضہ کرنے کا یہ ایک سنہری موقع تھا لیکن معاہدے کی خلاف ورزی یا دغا بازی جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا شیوہ نہیں تھا چنانچہ ایسا کوئی خیال آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو چھو کر بھی نہیں گزرا حال آنکہ مکّہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جائے ولادت اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اپنا شہر تھا جہاں سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ظلم وستم کے ذریعے جلاوطن ہونے پر مجبور کیا گیا تھا۔

سنہ ۸ ہجری

منبرِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

سنہ ۸ ہجری میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وہ منبر بنوایا جس پر بیٹھ کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خطبہ دیا کرتے تھے، اُس کے دو زینے اور پھر نشست گاہ تھی۔[۲] بعض مؤرّخین کے نزدیک منبر سنہ ۷ ہجری میں بنوایا تھا۔ بروایتے اُس میں ''اَثلِ غابہ'' کی لکڑی استعمال ہوئی تھی۔ ''اَثل'' ایک درخت کا نام ہے اور ''غابہ'' مدینہ طیبہ سے چند کلومیٹر دُور وہ جنگل ہے جہاں ۶ ہجری میں غزوۂ غابہ ہُوا تھا، یعنی غابہ کے جنگل میں پائے جانے والے اَثل نامی درخت کی لکڑی سے اُسے بنایا گیا تھا۔ بقولِ صحیح منبر کا طول دو گز اور عرض ایک گز تھا اور ہر سیڑھی کی چوڑائی ایک بالشت تھی۔[۳] آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد بھی ایسا ہی منبر ہُوا کرتا تھا لیکن شاہانِ بنواُمیہ کے دَور میں اس میں اضافہ کر کے عرشہ کے نیچے چھ زینے کر دیے گئے۔[۴]

---

[۱] مولانا شبلی نعمانی (متوفی ۱۹۱۴ء)، سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حصہ اوّل، ص ۵۰۴

[۲] ابوجعفر محمد بن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ھ)، تاریخ طبری، ج ۲ حصہ اوّل ص ۲۸۱

[۳] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۳۸۶

[۴] امیر حیدر احمد شہابی، تاریخ امیر حیدر احمد شہابی، طبع مصر، ج ۱ ص ۱۳

اس سے پہلے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسجد نبوی میں درخت کے تنے سے بنے ہوئے ایک ستون سے ٹیک لگا کر خطبہ ارشاد فرمایا کرتے تھے۔ روایت ہے کہ منبر بن جانے کے بعد جب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اُس پر تشریف لے گئے اور خطبہ ارشاد فرمانے لگے تو وہ ستون آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فراق میں رونے لگا۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی لکھتے ہیں، ''یہ حدیث مشہور اور حدِ تواتر تک پہنچی ہوئی ہے اور اس کی خصوصیات بھی متعدد احادیث صحیحہ سے ثابت شدہ ہیں۔ محدثین روایت کرتے ہیں کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم منبر بننے سے پہلے کھڑے ہو کر صحابہ کرامؓ کو خطبۂ عالی رتبہ سے مشرف فرمایا کرتے تھے اور بسبب طولِ قیام تھکن عارض ہو جاتی تو پشتِ مبارک کو مسجد کے ستون سے ٹیک لگا کر خطبہ دیا کرتے تھے۔ جب منبر بنا تو روزِ جمعہ ستون کے آگے سے گزر کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم منبر پر تشریف لائے۔ ستون نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی آواز سُنی اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنے آگے نہ پایا تو رونے اور فریاد کرنے لگا۔ بروایتے وہ ایسے روتا تھا جیسے کسی اُونٹ کا بچّہ گم ہو جائے تو وہ روتا ہے۔ اور بقولے وہ ایسے روتا تھا جیسے بچّہ ماں کو بلانے کے لیے روتا ہے۔ ایک روایت ہے کہ وہ اُس شخص کی طرح روتا تھا جس کا محبوب و معشوق اُس سے جُدا ہو جائے اور وہ اُس کی محبت و فراق میں روئے۔ اُس ستون کے رونے سے حاضرینِ مسجد کے دِل بھر آئے اور وہ بھی رونے لگے۔ ایک روایت میں ہے کہ اُس نے اس طرح آہ و زاری کی کہ وہ پھٹ گیا چنانچہ حاضرین کو گمان ہُوا کہ گر پڑے گا اور وہ خوفزدہ ہو کر اپنی جگہ سے اُچھل پڑے۔ چنانچہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم منبر سے اُترے اور اُس کے پاس تشریف لے گئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُس پر دستِ اقدس رکھ کر اُسے اپنی آغوشِ مبارک میں لے لیا اور فرمایا کہ اگر تُو چاہے تو تجھے باغ میں لوٹا کر تیری پرانی جگہ لگا دیں تا کہ تو دوبارہ سرسبز و شاداب ہو کر پھل دے اور اگر تُو چاہے تو تجھے جنّت کی زمین میں لگا دیں تا کہ تُو جنّت کی کیاریوں اور اُس کے چشموں کے پانی سے سیراب ہو اور انبیا و اولیا اور صلحا تیرے پھل تناول فرمائیں۔ جتنی دیر تک حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُسے اپنے جسم اقدس سے لپٹائے رکھا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے

رہے، ''نَعَمۡ قَدۡ فَعَلۡتُ نَعَمۡ قَدۡ فَعَلۡتُ'' (ہاں! میں نے کیا، ہاں! میں نے کیا)۔ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ ﷺ! یہ کیا کہتا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا، ''جب میں نے اس سے دریافت کیا کہ کیا تُو دُنیا میں رہنا چاہتا ہے یا جنّت میں تو اس نے جنّت میں رہنا پسند کیا، اس پر میں نے کہا، ''قَدۡ فَعَلۡتُ''۔ روایت ہے کہ آپ ﷺ نے اُس ستون کو اُسی جگہ دفن کروادیا۔''[1]

رِیاض الجنّہ

منبرِ رسول اللہ ﷺ اور روضۂ رسول اللہ ﷺ کی ضریح مبارک کے درمیان جو جگہ ہے اُسے ریاض الجنۃ کہا جاتا ہے جیسا کہ حدیثِ صحیح میں مروی ہے:

''مَابَیۡنَ قَبۡرِیۡ وَمِنۡبَرِیۡ رَوۡضَۃٌ مِّنۡ رِّیَاضِ الۡجَنَّۃِ'' (میری قبر اور میرے منبر کے درمیان جنّت کی کیاریوں میں سے ایک کیاری ہے)۔[2]

سریۂ موتہ

(جمادی الاوّل ۸ ہجری/ اگست ستمبر ۶۲۹ء)

موتہ ایک موضع کا نام ہے جو بلقاء کے قریب بیتُ المقدس سے سومنزل کے فاصلہ پر ہے۔ یہ سریہ اُسی موضع میں واقع ہُوا اس لیے اسے سریۂ موتہ کہا جاتا ہے۔ طبری نے اسے غزوہ لکھا ہے۔[3] ہمارے نزدیک اسے غزوہ کہنا صحیح نہیں کیونکہ غزوہ اُس مہم کو کہا جاتا ہے جس میں رسولِ گرامی ﷺ نے بنفسِ نفیس شرکت فرمائی ہو۔ اس مہم میں آپ ﷺ نے شمولیت نہیں فرمائی بلکہ دوسروں کو مامور فرمایا اس لیے اسے غزوے کی بجائے سریہ کہنا مناسب ہے۔

---

[1] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۳۸۶

[2] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۳۸۷

[3] ابوجعفر محمد بن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ھ)، تاریخ طبری، ج ۲ حصّہ اوّل ص ۲۹۲

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حاکم بصرہ کے نام ایک خط حضرت حارث بن عمیر ازدیؓ کے ہاتھ روانہ کیا۔ حضرت حارثؓ جب موتہ پہنچے تو شرجیل یا شراجیل (یہ نام دونوں طرح سے کتابوں میں آیا ہے) بن عمر غسانی جو قیصر کے امرا میں سے تھا اُن کی راہ میں حائل ہُوا اور پوچھا کہ تم کون ہو اور کہاں جا رہے ہو؟ حضرت حارثؓ نے اُسے بتایا کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قاصد ہوں اور شام جا رہا ہوں۔ یہ سُن کر شُرجیل طیش میں آ گیا اور حضرت حارث کو وہیں شہید کر دیا۔ بادشاہوں کے ہاں قاصدوں کو قتل کرنے کا رواج اُس دَور میں بھی نہیں تھا اور اُن کی امان امرِ مسلّم تھی۔ حضرت حارثؓ پہلے قاصد تھے جن کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نامۂ مبارک لے جانے کے جرم میں قتل کیا گیا تھا۔ چنانچہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو معلوم ہُوا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بہت صدمہ پہنچا اور صحابہؓ سے فرمایا کہ دشمنوں کی سرکوبی کے لیے چلو۔[۱] علامہ علی نقی نقوی نے لکھا ہے کہ وہ خط حاکم بصرہ شُرجیل غسانی کے نام تھا جو ایک ایسا قہرمان تھا جس نے عرب کے بین الاقوامی اور تقریباً ہر دَور کے بین الانسانی تقاضے کے خلاف آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قاصد کو قتل کرایا تھا۔[۲] مؤرخ حسن ابراہیم حسن نے اس حاکم کے نام کی صراحت نہیں کی بلکہ لکھا ہے، ''جب حضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے غسانیوں کے پاس قاصد بھیجا اُنھیں اسلام کی دعوت دیتے ہوئے تو اُنھوں نے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے قاصد کو قتل کر دیا۔''[۳] جمہور مؤرخین کے برخلاف محمد الخضری نے جو اپنے زمانے میں جامعہ مصر میں تاریخ کے پروفیسر تھے، لکھا ہے کہ یہ قاصد حارث بن عمیر ازدی، شُرجیل کے پاس نہیں بھیجے گئے تھے بلکہ یہ ہرقل کے نام خط لے جا رہے تھے اور راستے میں شُرجیل بن عمرو غسانی نے ان کو پکڑ کر قتل کر دیا۔[۴]

---

[۱] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۳۲۷

[۲] علامہ علی نقی نقوی، تاریخ اسلام، ص ۴۱۰

[۳] حسن ابراهيم حسن (متوفى ١٣٤٧ء)، تاريخ الاسلام السياسى، ج ١ ص ١٤٦

[۴] محمد الخضری (متوفی ١٣٧٦ء) محاضرات تاريخ الامم الاسلاميه، ص ٢٨

ڈاکٹر نصیر احمد ناصر لکھتے ہیں، ''مُوتہ شام کے علاقے میں واقع ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے قیصر روم کی طرح اُس کے باج گزار شام یا بصرہ کے حکمران کو بھی دعوتِ اسلام دی اور اُسے نامۂ مبارک لکھا جسے لے کر حضرت حارث بن عمیر ازدیؓ شام روانہ ہوئے۔ سرحد پر بلقاء کا علاقہ تھا جس کا حاکم شُرجیل بن عمرو تھا اور وہ بھی قیصر روم کا باج گزار تھا۔ شُرجیل عرب نژاد عیسائی تھا۔ حضرت حارثؓ اُس کی وساطت سے شام کے حکمران کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا نامۂ مبارک پہنچانا چاہتے تھے۔ شُرجیل سرکش و مغرور تھا اُس نے سفارتی آداب و روایات کی پرواہ نہ کرتے ہوئے حضرت حارث بن عمیر ازدیؓ کو شہید کر دیا۔''[1]

شُرجیل بن عمرو نے حضرت حارثؓ کو شہید کر کے گویا مملکتِ اسلامی کو للکارا تھا اور وہ جانتا تھا کہ اس للکار پر مسلمان خاموش نہیں رہیں گے بلکہ بدلہ لینے چڑھ آئیں گے لہٰذا اُس نے قیصرِ رُوم کو اُس کا باج دار ہونے کی حیثیت سے مدد کی درخواست کی جو منظور کر لی گئی اور ایک لاکھ کی فوج اُس کی مدد کے لیے روانہ کر دی گئی۔ اس طرح شُرجیل ایک لشکرِ عظیم جمع کر کے جنگ کے لیے تیار ہو گیا۔ اِدھر جمادی الاوّل ۸ ہجری میں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے صرف تین ہزار مسلمانوں کو جمع کیا اور فرمایا، ''دشمنوں کی سرکوبی کے لیے چلو، میں زید بن حارثہ کو تمھارا امیر مقرر کرتا ہوں، اگر وہ شہید ہو جائیں تو جعفر طیار ابن ابی طالب تمھارے امیر ہوں گے اور اگر وہ بھی شہید ہو جائیں تو عبداللہ بن رواحہ امیر ہوں گے اور اگر وہ بھی شہید ہو جائیں تو مسلمان جس کو چاہیں اپنا امیر بنا لیں۔''[2]

حضرت ابان بن عثمان حضرت امام جعفر الصادق علیہ السلام سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے پہلا سردار جناب جعفر طیارؓ کو قرار دیا، اُن کی شہادت کے بعد حضرت زیدؓ

---

[1] ڈاکٹر نصیر احمد ناصر، کتاب: پیغمبر اعظم و آخر (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم)، ص ۶۰۶

[2] ابو جعفر محمد بن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ھ)، تاریخ طبری، ج ۲ حصہ اوّل ص ۲۹۲
شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۳۳۶

کواوراُن کے بعد حضرت عبداللہ بن رواحہؓ کومقرر کیا۔‘‘[۱]

معمولی اسلحہ سے لیس تین ہزار سپاہیوں کا مقابلہ رُوم کی بہترین اسلحہ بردار فوج سے تھا جس کی تعداد ایک لاکھ یا بروایتے دولاکھ تھی اور تاریخ کہتی ہے کہ اس کا کوئی جوڑ نہیں تھا۔ شاید اسی وجہ سے ایک مستشرق (مشرقی علوم کا مغربی ماہر) نے خیال ظاہر کیا ہے کہ مسلمانوں کے پاس دشمنوں کی نقل وحرکت پر نگاہ رکھنے کے لیے کوئی جاسوسی نظام نہیں تھا اس لیے اُنھیں ’’منان‘‘ پہنچنے تک اپنے دشمن کی عظیم فوجی تیاری کی خبر نہ ہوئی۔[۲] اکثر مؤرخین کا خیال ہے کہ مسلمانوں کو صرف شُرجیل غسانی کی عسکری طاقت کا گمان تھا اور وہ نہیں جانتے تھے کہ شہنشاہِ روم ہرقل کی فوج سے واسطہ پڑنے والا ہے۔ روایت ہے کہ ہرقل خود بھی فوج کے ساتھ موجود تھا جس میں ایک لاکھ رومی تھے اور ایک لاکھ اُس کی عرب رعایا کے آدمی جو متعدد قبائل سے تعلق رکھتے تھے اور عیسائی ہو چکے تھے، اس طرح مسلمانوں کا مقابلہ دولاکھ کی فوج کے ساتھ تھا۔[۳]

جنگ یا پسپائی؟

شام کی سرزمین ’’معان‘‘ پر پہنچ کر مسلمانوں کو رومی فوج کی قوت کا اندازہ ہُوا تو اُنھوں نے پیش قدمی روک دی اور آپس میں صلاح مشورہ کرنے لگے کہ پیش قدمی جاری رکھی جائے یا مقابلہ سے گریز کیا جائے۔ بقولے حضرت زید بن حارثہؓ نے تجویز پیش کی کہ سرِ دست پیش قدمی روک دی جائے اور رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حالات کی خبر کی جائے پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو حکم دیں اُس پر عمل کیا جائے۔ عبداللہ بن رواحہؓ نے اس سے اختلاف کیا اور پر جوش انداز میں کہا کہ ہم نے

---

[۱] علامہ علی نقی نقوی، تاریخ اسلام، ص ۴۱۲ بحوالہ علامہ طبرسی (متوفی ۵۳۲ء)، اعلام الوریٰ

[۲] علامہ علی نقی نقوی، تاریخ اسلام، ص ۴۱۳

[۳] ابوجعفر محمد بن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ھ)، تاریخ طبری، ج ۲ حصہ اوّل ص ۲۹۳۔ علامہ علی نقی نقوی، تاریخ اسلام، ص ۴۱۴۔ الحافظ یوسف بن البر (متوفی ۴۶۳ ہجری)، الدر فی اختصار المغازی والسیر لابن عبدالبر مطبوعہ سنہ ۱۳۸۶ ہجری ۱۹۶۶ء ص ۲۲۲

کبھی دشمن کی طاقت کو پیشِ نظر رکھ کر مقابلہ نہیں کیا بلکہ ہمیشہ اپنے دِین کی قوت پر بھروسہ کیا ہے اور ہمارا عقیدہ ہے کہ ہم دشمن پر غالب نہ بھی آسکے تو شہادت کے مرتبے پر تو فائز ہوں گے ہی۔ سارے مجمع نے عبداللہ بن رواحہؓ کی تائید کی اور ہم آواز ہو کر کہا کہ ہم مقابلہ کریں گے۔ [1] چنانچہ سب مسلمان میدانِ موتہ میں، جسے مؤرخین نے "موت کی وادی" بھی لکھا ہے، وارد ہو گئے اور اپنے قلیل لشکر کو مرتب کرنے لگے۔

جنگ

سب سے پہلے حضرت زید بن حارثہؓ علم لے کر میدان میں اُترے اور بڑی جوانمردی کے ساتھ کفّار کا مقابلہ کرنے کے بعد راہِ حق میں اپنی جان کا نذرانہ پیش کر دیا۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے چچا حضرت ابو طالب علیہ السلام کے فرزند جناب جعفر طیّارؓ میدان میں آئے اور کفّار کے لشکر پر ٹوٹ پڑے۔ اُس وقت حضرت جعفر طیارؓ کی عمر ۳۳ یا ۳۴ سال تھی۔ مؤرخین لکھتے ہیں کہ جوشِ جہاد میں وہ اپنے گھوڑے سے کود پڑے اور اُس کے پاؤں قلم کر دیے یا اُسے ذبح کر دیا۔

روایت ہے کہ حضرت جعفر طیارؓ مسلمانوں میں پہلے شخص تھے جنہوں نے گھوڑے کو پے کیا۔ [2] میدانِ جنگ میں کسی سپاہی کا گھوڑے کو پے کرنے یعنی اُس کے پاؤں کاٹنے یا ذبح کرنے کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ وہ آخری دم تک لڑنے کا عزم لے کر میدان میں آیا ہے اور غازی بنے گا یا شہید لیکن میدان سے فرار نہیں ہوگا۔ حضرت جعفر طیارؓ پیادہ لڑتے لڑتے دشمن کی صفوں کے اندر تک چلے گئے یہاں تک کہ اُن کا دایاں ہاتھ قلم ہو گیا۔ اُنھوں نے علم بائیں ہاتھ میں لے لیا، وہ ہاتھ بھی قطع ہو گیا تو علم کو سینے سے لگا لیا اور اسی عالم میں شہید ہو گئے۔ حضرت

---

[1] ابو جعفر محمد بن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ھ)، تاریخ طبری، ج ۲ حصّہ اوّل ص ۲۹۳

[2] ابو جعفر محمد بن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ھ)، تاریخ طبری، ج ۲ حصّہ اوّل ص ۲۹۳

امام محمد باقر علیہ السلام سے روایت ہے کہ حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ کے جسم پر پچاس (۵۰) زخم آئے جن میں سے تیس (۳۰) صرف چہرے پر تھے۔[۱] کتبِ اہل سنت میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے، ''حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ کے جسم پر تیروں اور تلواروں کے نوے (۹۰) سے زیادہ زخم تھے جن میں سے کوئی بھی پشت پر نہیں تھا۔''[۲] ابن سعد نے لکھا ہے کہ ایک رومی کے وار سے حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ کا جسم دولخت ہوگیا تھا، جسم کے ایک حصّے پر تیس (۳۰) سے زیادہ زخم تھے اور مجموعی طور پر نیزوں اور تلواروں کے بہتر (۷۲) زخم تھے۔[۳]

حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ میدان جنگ میں اُترے اور لڑتے ہوئے جام شہادت نوش کیا۔ اُن کے بعد بھی کچھ مجاہد درجہ شہادت پر فائز ہوئے۔ ذہبی کا بیان ہے کہ شہید ہونے والوں کی تعداد آٹھ (۸) تھی۔[۴]

رسولِ گرامی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لشکر اسلام میں سے تین افراد کو بطور سالار منتخب فرمایا تھا اور اُن کی ترتیب بھی مقرر فرمادی گویا کہ نبی اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ بھی ایک اعجازِ نبوّت تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو لشکر ترتیب دیتے وقت یہ علم تھا کہ پہلے زیدؓ شہید ہوں گے پھر جعفر طیارؓ اور پھر عبداللہ بن رواحہؓ بھی۔ تاریخ شاہد ہے کہ نبی اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اشارے کے عین مطابق تینوں سالار باری باری درجہ شہادت پر پہنچے، اُن کے بعد اور کوئی نہیں تھا جس کے بارے میں حکم نبی اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہوتا کیونکہ روایت کے مطابق آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تین سردار مقرر کر کے فرمادیا تھا کہ

---

[۱] علامہ علی نقی نقوی، تاریخ اسلام، ص ۱۵ ۴ بحوالہ العبر، ج ۱ ص ۹۔ وقیۃ الاسلاف، ص ۱۳۰۔ الدار لابن عبدالبر، ص ۲۳۳۔ اعلام الوریٰ۔ عبدالرحمٰن ابن خلدون (متوفی ۸۰۸ھ) تاریخ ابن خلدون، طبع نفیس اکیڈمی لاہور، حصّہ اوّل، ص ۱۲۶۔ ابی جعفر محمد بن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ھ)، تاریخ طبری، ج ۲ حصّہ اوّل، ص ۲۹۳

[۲] علامہ علی نقی نقوی، تاریخ اسلام ص ۱۵ ۴ بحوالہ دقیۃ السلاف، ص ۱۳۹

[۳] علامہ علی نقی نقوی، تاریخ اسلام ص ۱۵ ۴ بحوالہ طبقات کبریٰ، ج ۲ ص ۱۲۹

[۴] علامہ علی نقی نقوی، تاریخ اسلام، ص ۱۵ ۴ بحوالہ العبر، ج ۱ ص ۹۔ الدار، ص ۲۲۲

عبداللہ بن رواحہؓ بھی شہید ہو جائیں تو مسلمان جس کو چاہیں اپنا امیر بنالیں۔ [1] حضرت عبداللہ بن رواحہؓ کی شہادت کے بعد ایک شخص کہنے لگا کہ اب تم کس کو منتخب کر کے یہ ذمہ داری سونپو گے؟ پھر از خود یا دوسروں کے کہنے پر خالد بن ولید نے لشکرِ اسلام کی کمان سنبھال لی۔ (صلح حدیبیہ کے بعد خالد بن ولید نے اسلام قبول کرلیا تھا۔) مؤرخین لکھتے ہیں کہ خالد بن ولید نے باقی ماندہ اسلامی لشکر کو زندہ بچا لے جانے کا منصوبہ ذہن میں رکھتے ہوئے اس طرح جنگ شروع کی کہ تھوڑا تھوڑا پیچھے ہٹتے ہوئے دشمنوں سے دُور ہونا شروع کر دیا اور آخرکار موقع پاتے ہی پوری جماعت کو واپس کرلیا۔ [2] ابن خلدون اور ابن عبدالبر نے مختصر الفاظ میں یوں لکھا ہے، ''وہ مسلمانوں کو لے کر الگ ہو گئے۔'' [3] میدانِ جنگ سے پسپائی کے بعد لشکرِ اسلام مدینہ کی طرف روانہ ہُوا۔ بروایتے رومی لشکر نے اُن کا تعاقب نہیں کیا اور مسلمان جان بچا کر مدینہ پہنچ گئے۔

شکست خوردہ اسلامی فوج کا مدینہ کے باہر استقبال

عروہ بن زبیر سے روایت ہے کہ جب وہ (شکست خوردہ) فوج مدینہ کے قریب پہنچی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور دوسرے مسلمان مدینہ سے باہر آئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم گھوڑے پر سوار تھے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا جعفر طیار کا لڑکا مجھے دے دو۔ عبداللہ بن جعفر طیار رضی اللہ عنہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے پاس لائے گئے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اُن کو اُٹھا کر اپنے ساتھ (گھوڑے پر) بٹھا لیا۔ دوسرے لوگوں نے فوج پر خاک ڈالنا شروع کر دی اور کہا کہ تم اللہ کی راہ میں بھگوڑے ہو۔ [4]

---

[1] شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، مدارج النبوت، ج ۲ ص ۳۳۶

[2] علامہ علی نقی نقوی، تاریخ اسلام، ص ۴۱۶ بحوالہ تاریخ الامم والملوک، ص ۱۶۱۲

[3] علامہ علی نقی نقوی، تاریخ اسلام، ص ۴۱۷ بحوالہ تاریخ ابن خلدون، ج ۲ ص ۲۳۳
الحافظ یوسف بن البر (متوفی ۴۶۳ ہجری)، الدرر فی اختصار المغازی والسیر، ص ۲۳۳

[4] الطبقات الکبریٰ ج ۲ ص ۱۲۹۔ ابوجعفر محمد بن جریر (متوفی ۳۱۰ھ)، تاریخ طبری، ج ۲ حصّہ اوّل ص ۲۹۵

اہلِ مدینہ کی طرف سے ایسے ''استقبال'' کے بعد موتہ سے لوٹنے والے مسلمانوں نے گھروں سے نکلنا چھوڑ دیا تھا کیونکہ وہ جب بھی باہر آتے تھے تو لوگ اُنھیں طعنے دیتے تھے۔

ابوجعفر محمد بن جریر طبری لکھتے ہیں، ''حارث بن ہشام کی اولاد میں سے ایک شخص سے جو اُمّ المومنین حضرت اُمّ سلمہؓ کا ننھیالی رشتہ دار تھا مروی ہے کہ اُمّ المومنین حضرت اُمّ سلمٰی رضی اللہ عنہا نے کسی عورت سے پوچھا کہ سلمہ بن ہشام بن مغیرہ نماز میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور صحابہؓ کے ساتھ شامل کیوں نہیں ہوتے؟ عورت نے جواب دیا کہ وہ گھر سے نہیں نکلتے کیونکہ لوگ اُنھیں طعنہ دیتے ہیں کہ تم اللہ کی راہ سے بھاگ نکلے ہو۔[1]

عصرِ حاضر کے بعض مؤلفین نے موتہ کی مہم کو کامیاب ترین قرار دیتے ہوئے فتح کو مسلمانوں سے منسوب کر ڈالا ہے جو کہ سراسر غلط ہے۔ اس خیال کی تردید میں مشہور مؤرخ ابوجعفر محمد بن جریر طبری کے الفاظ ملاحظہ فرمائیں، ''مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے خیبر سے واپس آکر ماہِ ربیع الاوّل اور ربیع الثانی مدینہ میں قیام فرمایا اور جمادی الاوّل میں وہ مہم شام کی طرف روانہ کی جو موتہ میں ''تباہ'' ہوگئی۔[2] یعنی طبری نے مسلمانوں کی اس مہم کے لیے لکھا ہے کہ وہ ''تباہ'' ہوگئی، نہ کہ کامیاب ہوگئی۔

(حصّہ دوم تمام شُد)

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّاٰلِ مُحَمَّدٍ ○

---

[1] ابوجعفر محمد بن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ھ)، تاریخ طبری، ج ۲ حصّہ اوّل ص ۲۹۵
علامہ علی نقی نقوی، تاریخ اسلام، ص ۱۶۴ بحوالہ کامل ابن اثیر بیروت ج ۲ ص ۲۳۹

[2] ابوجعفر محمد بن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ھ)، تاریخ طبری، ج ۲ حصّہ اوّل ص ۲۹۲

نعتِ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

یا نبی یا نبی یا نبی یا نبی   آپ ہی ہیں مرا آسرا آخری
یا نبی یا نبی یا نبی یا نبی
ہے ''اُحد'' سے بڑا میرا ہر اک گناہ   آپ ہی کے کرم سے ہو بخشش مری
یا نبی یا نبی یا نبی یا نبی
روزِ محشر جو آؤں میں سہما ہوا   ہو شفاعت تری کاش آگے کھڑی
یا نبی یا نبی یا نبی یا نبی
غرقِ بحرِ ندامت غلام آج ہے   یا شہِ انبیا! تھام لیں مجھ کو بھی
یا نبی یا نبی یا نبی یا نبی
پھول، پتے، ستارے، قمر، آفتاب   آپ ہی کی ثنا کر رہے ہیں سبھی
یا نبی یا نبی یا نبی یا نبی
آپ کے ہاتھ پر سنگ کلمہ پڑھیں   آپ کی راہ میں سرنگوں ہر کوئی
یا نبی یا نبی یا نبی یا نبی
آپ کے حکم سے مہر واپس مڑا   جو اشارہ ملا شق ہوا ماہ بھی
یا نبی یا نبی یا نبی یا نبی
ہائے طائف تری وادیوں کا ستم   ہائے سرکار کی وہ کرم پروری
یا نبی یا نبی یا نبی یا نبی
یا نبی یا نبی یا نبی یا نبی

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّاٰلِ مُحَمَّدٍ○

(کلام: سیّد حماد رضا بخاری)

دُعا

یارب ذوالجلال والاکرام! تمام تعریفیں تیرے لیے ہیں، دُرود وسلام ہو تیرے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور اُن کی آلِ اطہار علیہم السلام پر۔ تیرا شکر ہے کہ تُو نے مجھے اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی محبت وعقیدت میں یہ کتاب لکھنے کی توفیق عطا فرمائی۔ الٰہی! میری اس کاوش کو اپنی بارگاہِ جلیلہ میں قبول فرما اور اس میں جو غلطی اور کوتاہی ہوئی ہے اُسے معاف فرما کہ بے شک تُو معاف کرنے والا اور بہت مہربان ہے۔ الٰہی! میری اس کوشش کو میرے لیے، میرے والدین کے لیے، میرے بھائی کے لیے، میری بہنوں کے لیے، میری اولاد و ازواج کے لیے، میرے احباب واقربا کے لیے، اس کتاب کے پڑھنے والوں اور اس کی تیاری میں معاونت کرنے والوں کے لیے ذریعہ نجات اور توشۂ آخرت بنا۔ (آمین یارب العالمین)

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّاٰلِ مُحَمَّدٍ ○

تمت

مآخذ

(اس کتاب کی تالیف میں مندرجہ ذیل کتب سے بالواسطہ یا بلاواسطہ استفادہ کیا گیا)

قرآن حکیم

آبِ کوثر، ازمفتی محمد امین

آسان مسائل، ازآیت اللہ سید علی سیستانی

اُمّ المومنین سیّدہ خدیجۃ الکبریٰ علیہا السلام، ازعلامہ محمد محمدی اشتہاردی، مترجم سیّد علی شیر نقوی

اُمہات المومنین، ازگل احمد عطاری

ابواب المقدمات، ازدواج در اسلام، ازآیت اللہ مشکینی

ارشاد، ازشیخ مفید (متوفی ۱۰۲۲ء)

ازدواج اوراخلاقیات دراسلام، ازسیّد محمد رضوی

اسد الغابۃ فی معرفۃ الصحابۃ، ازعلی بن محمد ابن اثیر الجزری (متوفی ۶۳۸ھجری)

اسعاف الراغبین برحاشیئۃ نوالابصار شبلنجی (طبع مصر)

اسلام اورمسلمانوں کی تاریخ، ازخواجہ محمد لطیف

اسلامی ازدواج، جوان کے لیے تحفہ، ازشہب رضوی، طبع ورڈ اسلامک نیٹ ورک

اصح السیر، ازابوالبرکات عبدالرؤف داناپوری

اعلام الوریٰ، ازعلامہ طبرسی (متوفی ۵۳۲ء)

اعیان الشیعۃ، ازسید محسن امین عاملی (متوفی ۱۹۵۳ء)

الاحتجاج، ازالشیخ الطبرسی

الاستیعاب، ازحافظ ابن عبدالبر قرطبی (متوفی ۴۶۳ھجری)

الامام علی علیہ السلام، ازالشیخ جواد مغنیۃ

الانتصار، ازشریف مرتضیٰ

البیان والتعریف، از حسینی

التنبیۃ والاشراف، از ابو الحسن المسعودی (متوفی ۳۴۶ ھجری)

الثاقب فی المناقب، مناقب اہل بیت، ترجمہ: القطرۃ من بحار مناقب النبی والعترۃ، از آیت اللہ سیّد احمد مستنبط

الدر المنثور فی التفسیر بالمأثور، از جلال الدین سیوطی (متوفی ۹۱۱ ھجری)

الدر فی اختصار المغازی والسیر، از الحافظ یوسف بن البر (متوفی ۴۶۳ ھجری)

الرحیق المختوم، از مولانا صفی الرحمن مبارکپوری، (طبع لاھور)

الریاض النضرۃ فی مناقب العشرہ، از محب طبری

الزرقانی علی المواھب، از علامہ زرقانی (متوفی ۱۱۲۲ ھجری)

السیرۃ النبویۃ، لابن ھشام القسم الثانی، لاجز الثالث والرابع

السیف الجلی علیٰ منکر ولایۃ علی علیہ السّلام، از ڈاکٹر محمد طاھر القادری

الشریف المرتضح، از الفصول المختارہ

الشفاء، از قاضی عیاض

الصارم المسلول علی شاتم الرسول، از تقی الدین ابن تیمیہ، متوفی (۷۲۸ ھجری)

الصحیح، از ابن حبان

العبر فی خیر من غیر، از حافظ ذھبی، مطبع کویت

الفاروق، از مولانا شبلی نعمانی (متوفی ۱۹۱۴ء)، مطبوعہ دارالاشاعت کراچی طبع اوّل ۱۹۹۱ء

الفردوس، از حافظ دیلمی (متوفی ۵۵۸ ھجری)

القول البدیع، از محمد بن عبد الرحمٰن سخاوی (متوفی ۹۰۲ ھجری)

الکامل، از ابن الاثیر

المسائل العکبریۃ، از الشیخ المفید

المستدرك علی الصحیحین، از ابو عبداللہ محمد بن عبداللہ الحاکم

المسند ابو یعلی، از ابو یعلی (متوفی ۹۱۹ھجری)

المصنف، از ابن ابی شیبۃ

المعجم الاوسط، از حافظ ابی القاسم سلیمان بن احمد طبرانی (متوفی ۳۶۰ ھجری)

المعجم الکبیر، از حافظ ابی القاسم سلیمان بن احمد طبرانی (متوفی ۳۶۰ ھجری)

المغازی للواقدی، از ابو عبداللہ محمد بن عمر واقدی (متوفی ۸۲۲ء)

المواھبُ اللدنیۃ، از احمد بن محمد قسطلانی (متوفی ۹۲۳ھجری)

النور المبین فی قصص الانبیاء والمرسلین، از علامہ جزائری

الوثائق السیاسیۃ، طبع مصر

امالی، از شیخ ابی جعفر الصدوق (متوفی ۳۸۱ھجری)

بحارالانوار، از علامہ محمد باقر مجلسی (متوفی ۱۶۹۸ء)

پیغمبر اعظم و آخر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، از ڈاکٹر نصیر احمد ناصر، مطبوعہ فیروز سنز، پاکستان

تاریخ الاسلام السیاسی، از حسن ابراھیم حسن (متوفی ۱۳۴۷ء)

تاریخ ابن الوردی، از ابن الوردی (متوفی ۱۳۴۹ء/۷۴۹)، طبع مصر

تاریخ ابن خلدون، از ابن خلدون (متوفی ۱۴۰۶ء)

تاریخ ابن کثیر (البدایہ والنہایہ) از ابو الفداء عمادُ الدین ابن کثیر (متوفی ۱۳۳۱ء)

تاریخ ابو الفدا، از ابو الفدا عمادُ الدین ابن کثیر (متوفی ۱۳۳۱ء)

تاریخ، از امیر حیدر احمد شہابی، طبع مصر

تاریخ، از کاسن ڈی پرسون

تاریخ ازبکستان، ازسیّدکمال الدین احمد،طبع ویب سائٹ،دین اسلام

تاریخ اسلام، ازذاکرحسین

تاریخ اسلام، ازشاہ معین الدین احمدندوی

تاریخ اسلام، ازعلامہ علی نقی نقوی

تاریخ اسلام، ازعلامہ نجم الحسن کراروی (متوفی ۱۹۸۲ء)

تاریخ بغداد، ازحافظ ابوبکراحمد بن علی خطیب بغدادی (متوفی ۴۶۳ھ)

تاریخ خمیس، ازحسین بن محمد دیاربکری (متوفی ۸۹۲ ہجری ۱۵۷۴ء)

تاریخ خواص عامہ، ازابن جوزی

تاریخ دمشق (عساکر)، ازعلی ابن حسین ابن عبداللہ ابن عساکر دمشقی (متوفی ۵۷۱ ہجری)

تاریخ دمشق الکبیر، ازابن عساکر (متوفی ۱۱۷۵ء)

تاریخ طبری، ازابوجعفر محمد بن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ ہجری) عربی،طبع مصر

تاریخ طبری، ازابوجعفر محمد بن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ ہجری) اردو،نفیس اکیڈمی،کراچی پاکستان

تاریخ کامل، ازعلامہ ابنِ کثیر

تاریخ کبیر، ازعلامہ ابن جریر طبری،طبع مصر

تاریخ واقدی، ازابوعبداللہ محمد بن عمر واقدی (متوفی ۸۲۲ء)

تاریخ یعقوبی، ازابن واضح الیعقوبی (متوفی ۲۹۲ء)،طبع نفیس اکیڈمی کراچی، پاکستان

تذکرۃ الخواص، ازسبط ابن جوزی

ترجمان القرآن، ازابوالکلام احمد

ترجمہ تاریخ ابوالفدا، ازمولانا کریم الدین حنفی،طبع لاہور

تفسیر القرآن، ازمولانا سیّدظفر حسن

تفسیر انوار النجف فی اسرار المصحف ، ازعلامہ حسین بخش جاڑا

تفسیر توریت، از پی شلومر اسحاق (مفسر توریت)

تفسیر فرات کوفی، ازابوسعید

تفسیر معروف، ازفخر الدین الرازی (متوفی ۱۲۰۹ء)

تفسیر نمونہ، ازآیت اللہ مکارم شیرازی

تلخیص المستدرک، ازشمس الدین ابوعبداللہ محمد بن احمد الذہبی (متوفی ۷۴۸ ھجری)

تلقیح الفھوم، ازابن ہشام (متوفی ۸۳۳ء)

توضیح المسائل، ازآیت اللہ سیّد علی حسینی سیستانی

تہذیب الاحکام، ازمحمد بن حسن طوسی

تہذیب الاسماء، ازانووی

جامع المدارک، ازسیّد خوانساری

جواھر الکلام، ازشیخ جواھری

جامع ترمذی

جذبُ القلوب، ازشیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)

چودہ ستارے، ازعلامہ نجم الحسن کراروی (متوفی ۱۹۸۲ء)

حصنِ حصین، ازمحمد بن محمد جزری شافعی (متوفی ۱۴۲۹ء)

حکایاتُ القرآن، ازسیّد محمد صحفی ،طبع جامعہ تعلیمات اسلامی پاکستان

حیاتُ القلوب، ازعلامہ محمد باقر مجلسی (متوفی ۱۶۹۸ء)،ناشران امامیہ کتب خانہ، لاہور

حیات محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم، ازمحمد حسین ہیکل

خصائص نسائی، ازحافظ ابوعبدالرحمٰن احمد بن شعیب نسائی (متوفی ۳۰۳ ہجری)

خطباتِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم، ازمولوی محمد عبداللہ ،طبع دائرۃ المعارف، لاہور

درالسحابہ، ازشوکانی

درمنثور، ازابن مدویۃ

دعوت دہلی سیرۃ طیبہ نمبر ۱۶ستمبر ۱۹۵۹ء، ازمولوی عبدالباری ایم اے

دلائل الخیرات کانپوری، ازمحمد عبدالحق مہاجر

دی پرافٹ اینڈ دی ایج آف کیلی فیٹس، ازہیوا ین کینیڈی، طبع لندن

The Prophet and the Age of Caliphates

دی پریچنگ آف اسلام، از سرتھامس واکر آرنلڈ (متوفی ۱۹۳۰ء)

The Preaching of Islam

دی سوشل سٹرکچر آف اسلام، ازروبن لیوی (متوفی ۱۹۶۶ء)، طبع کیمبرج یونیورسٹی پریس، ۱۹۵۹ء

The Social Structure of Islam

دی عرب سولائزیشن، ازجوزوف ہیل، طبع ڈبلیو ہیفر اینڈ سنز، کیمبرج ۱۹۲۶ء

The Arab Civilization

دی عرب کنگڈم اینڈ اٹس فال، ازجولیس ویل ہاسن (متوفی ۱۹۱۸ء) طبع یونیورسٹی آف کلکتہ، ۱۹۲۷ء

The Arab Kingdom and Its Fall

دی لائف اینڈ ٹائمز آف محمد (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم)، ازجان بیگٹ گلب پاشا (متوفی ۱۹۸۶ء)، طبع نیویارک

The Life and Times of Mohammad (p.b.u.h)

دی میسیج (The Message)، ازآیت اللہ جعفر سبحانی

دی ہسٹری آف دی ڈیکلائن اینڈ فال آف دی رومن ایمپائر، ازایڈورڈ گبن (متوفی ۱۷۹۴ء)

The History Of The Decline And Falls Of Roman Empire

ذخائز العقمی فی مناقب ذوی القربیٰ، ازمحب طبری

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی سیاسی زندگی، ازمحمد حمیداللہ

روضۃ الاحباب، از جمال الدین محدث

روضۃ الصفا، از محمد بن خاون شاہ، غیاث الدین خواند

رحمۃً للعالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، از قاضی محمد سلیمان سلمان منصور پوری، مطبوعہ مرکز الحرمین الاسلامی

روح المعانی، از شہاب الدین محمود آلوسی (متوفی ۱۲۷۰ ہجری)

روضۃ الواعظین، از فتال نیشاپوری

زادلمعاد، از ابن القیم (متوفی ۷۵۱ ہجری)

سبل السلام، از صنعانی

سفینۃ البحار، از محدث شیخ عباس قمی (متوفی ۱۳۵۹ ہجری)

سلمانِ محمدی، از مولانا مقبول احمد

سنن ابی داوٗد، از حافظ ابی داوٗد سلیمان (متوفی ۲۸۵ ہجری)

سنن الترمذی، از محمد ترمذی (متوفی ۲۷۹ ہجری)

سنن الکبریٰ، از ابوبکر احمد بن حسین بن علی بیہقی (متوفی ۴۵۸ ہجری)

سیاسی وثیقہ جات (اردو ترجمہ)، از ڈاکٹر محمد حمید اللہ

سیر اعلام النبلاء، از ذہبی

سیرتُ النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم (اردو)، از ابن ہشام (متوفی ۸۳۳ء)

سیرتِ سیّد الانبیا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم (ترجمہ الوفا باحوال المصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)، از عبدالرحمٰن ابن جوزی

سیرت ابن ہشام، از ابن ہشام (متوفی ۸۳۳ء)

سیرت فاطمۃ الزہراء علیہا السلام، از سلطان مرزا دہلوی

سیرت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور مستشرقین، از ڈاکٹر عبدالعلیم

سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، از مولانا شبلی نعمانی (متوفی ۱۹۱۴ء)، طبع چہارم مطبع معارف اعظم گڑھ

شذرات الذہب فی اخبار من ذہب لابن العماد الحنبلی، از ابن العماد الحنبلی

شرح ابن ابی الحدید

شرح المواہبُ اللدنیة۔ از محمد الزرقانی (متوفی ۱۱۲۲ ہجری)

شواہد النبوت، از مولانا نور الدین عبد الرحمن جامی (متوفی ۱۴۹۲ء)

صحیح بخاری، از محمد بن اسماعیل بخاری

صحیح مسلم، از ابو الحسین مسلم بن الحجاج بن مسلم القشیری بن دردین

صفوة الصفوه ا، از ابن جوزی

الصواعق المحرقة، از الشیخ احمد ابن حجر المکی (متوفی ۹۷۴ ہجری)

طبقات ابن سعد، از محمد ابن سعد (متوفی ۲۳۰ ہجری)

عرائس المجالس، از ابو اسحاق احمد ثعلبی (متوفی ۴۲۷ ہجری)

علل الشرایع، از الشیخ الصدوق بن بابویة ابو جعفر محمد بن علی بن الحسین

عیون اخبار الرضا، از شیخ ابی جعفر الصدوق (متوفی ۳۸۱ ہجری)

عہد نبوی کا نظام حکمرانی، از محمد حمید اللہ

فتح البیان فی مقاصد القرآن، از نواب صدیق حسن خان قنوجی

فتح القدیر، از محمد بن علی بن محمد شوکانی (متوفی ۱۲۵۰ ہجری)

فروع کافی، از محمد بن یعقوب کلینی، مطبوعہ ایران ۱۳۱۵ ہجری

کتاب مستطاب الشافی، از مولانا سید ظفر حسن، (ترجمہ اُصول کافی، شیخ محمد بن یعقوب کُلینی، متوفی ۳۲۹ء)

کتاب مستطاب مجمع الفضائل، از مولانا سیّد ظفر حسن (ترجمہ: مناقب علامہ ابن شہر آشوب)

کذا فی الشفا، از قاضی عیاض

کشاف(زمخشری)، از محمود ابن عمر الزمخشری(متوفی۵۳۸ھجری)

کشف الانوار ترجمہ فارسی بحار (طبع ایران)

كفاية الأثر في النص على الأئمة الإثنى عشر

کمال الدین، از الشیخ الصدوق بن بابویہ ابو جعفر محمد بن علی بن الحسین

کنز العمال، از علامہ علا الدین علی متقی بن حسام الدین

کتاب السنن، از سعید بن منصور (متوفی ۲۲۷ھجری)

کشف الخفا، از عجلونی(متوفی۱۱۶۲ھجری)

کشف الغمہ، از علی بن عیسیٰ اربیلی (متوفی۶۹۴ھجری)

کیرالہ میگزین ۱۹۴۸

لٹریری ہسٹری آف دی عربز، از رینالڈ ایلین نکلسن (متوفی ۱۹۴۵ء) طبع کیمبرج یونیورسٹی ۱۹۵۳ء

Literary History of the Arabs

لوامع التنزیل، از علامہ جلال الدین

مائیکرو سافٹ انکارٹا انسائیکلوپیڈیا

مبانی تکملة المنہاج، از آغا خوئی

مجالس صدوق (ترجمہ امالی الشیخ الصدوق)، از شیخ صدوق بن بابویہ، ناشر ادارہ تعلیم وتربیت لاہور

مجمع الزوائد ومنبع الفوائد، از ابو الحسن نور الدین علی بن ابی بکر ہیثمی شافعی

مجمع النورین، از شیخ ابو الحسن نجفی

محاضرات تاریخ الامم الاسلامیہ، از محمد الخضری (متوفی۱۳۴۶ء)

محاضرۃ الابرار، از علامہ ابن عربی(متوفی۱۲۴۰ء)، مطبوعہ مصر

محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اینڈ دا کونکوئسٹس آف اسلام، از فرانسسکو جبریلی (متوفی ۱۹۹۶ء)

Mohammad (p.b.u.h) and the Conquest of Islam

محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایٹ مدینہ (محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ میں)، از ولیم منٹگمری واٹ (متوفی ۲۰۰۶ء)، طبع کراچی

Mohammad (p.b.u.h) At Madina

مختصر سیرۃ الرسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، از محمد بن عبد الوھاب نجدی (متوفی ۱۲۰۶ھجری)

مدارج النبوّت (اردو)، از شیخ عبدالحق محدث دہلوی (متوفی ۱۶۴۲ء)، ناشر شبیر برادرز، لاہور

مراۃ الجنان للیافی، مطبوعہ حیدر آباد دکن

مروج الزھب ومعادن الجواھر (تاریخ مسعودی) از ابو الحسن بن حسین بن مسعودی

مستدرك الوسائل، از میرزا حسین نوری

مستدرك حاکم، از الحاکم نیشاپوری (متوفی ۴۰۵ھجری)

مستدرك علی الصحیحین، از الحاکم نیشاپوری (متوفی ۴۰۵ھجری)

مسلم انسٹی ٹیوشنز، از ماؤرس گاڈفرائے ڈی مامبائنز (متوفی ۱۹۵۷ء)، طبع لندن ۱۹۵۴ء

Muslim Institutions

مسلمانانِ عالم، از کے اے حمید (بیرسٹر ایٹ لاء)

مسند احمد بن حنبل، از ابو عبد اللہ احمد بن محمد بن حنبل شیبانی

مسند، از اسحاق بن راھویہ

مسند امام رضا علیہ السلام

مشکوٰۃ المصابیح (مشکوٰۃ شریف)، از امام ولی الدین محمد ابن عبد اللہ الخطیب

معجم البلدان، از شھاب الدین ابو عبد اللہ یاقوت بن عبد اللہ رومی

مقاتل الطالبین، از علی بن حسین بن محمد بن احمد بن ھیثم، معروف بہ ابو الفرج اصفھانی

مناقب ابن شھر آشوب، از علامہ شھر آشوب

مناقب فاطمۃ الزہراء علیہا السلام، از ڈاکٹر طاہر القادری
منہاج الصالحین، از الشیخ وحید الخراسانی
موارد الظمآن، از ھیثمی
میثاقِ مدینہ، از ڈاکٹر محمد طاہر القادری
نُور الابصار، از الشیخ بن حسن مؤمن الشبلنجی
نقوشِ عصمت، از علامہ سیّد ذیشان حیدر جوادی (متوفی ۲۰۰۰ء)
نوادر المعجزات، از ابو جعفر محمد بن جریر طبری (متوفی ۳۱۰ھجری)
نور الابصار فی مناقب اهل بیت النبی المختار صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، از الشیخ مومن الشبلنجی
نیل الاوطار، از شوکانی
وسائل الشیعہ، از محمد بن حسن الالمعروف بہ شیخ حر عاملی
وکی پیڈیا اُردو

سیّد حماد رضا بُخاری کی اسلامی کتب

بلغ العلیٰ بکمالہ

(حیات طیبہ، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)

صلوا علیہ وآلہ

(فضائل دُرود، دُعا و مناجات)

ناخدا

(حیاتِ سیّد الشہدا امام حسین علیہ السلام)

(جلد آرہی ہے، ان شاء اللہ)

مؤلف: سیّد حماد رضا بخاری